

بھارتی توپوں کا نشانہ بنے علاقوں کی چشم کشا سیاحت

نومبر 2014ء



مسعود اوزل

دنیا کے فٹ بال کا مشہور کھلاڑی

اردو ڈائجسٹ

اچھی شہرت کے

سابق بیورو کریٹ

پی ٹی آئی

کی کور کمیٹی کے اہم رکن

تسنیم نورانی

کے تجربات، مشاہدات اور تصورات

کی ایک سحر انگیز داستان



WWW.PAKSOCIETY.COM

موسم جب ظالم بن جائیں

موسمیاتی تبدیلیوں سے انسان کی جان و مال خطرے میں

فاطمہ کے لعل

نواسر رسول بخارا کی زندگی کے سبق آموز واقعات

گلوٹین آپ کا دشمن تو نہیں

داند گندم میں چھپی چاری کا حیران کن کشف

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ✧ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

WWW.PAKSOCIETY.COM

اردو ڈائجسٹ 06 2014 Pa

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کا قرآن

گناہوں کی معافی کے لیے دعا

اے ہمارے پروردگار اگر ہم سے بھول چوک ہو جائے تو تو ہمیں نہ پکڑنا۔ اے ہمارے پروردگار ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈالنا جیسا ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔ اے ہمارے پروردگار ہم سے وہ بوجھ نہ اٹھوانا جس کی ہم میں طاقت نہیں اور ہمارے گناہوں سے درگزر فرما اور ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما تو ہی ہمارا مالک ہے اور ہم کو کافروں پر غلبہ عطا فرما O

(سورۃ بقرہ: 2-286)

اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہمیں نہیں بخشے گا اور ہم پر رحم نہیں کرے گا تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔ O

(حضرت آدم کی دعا)

رسول کا فرمان

گناہوں سے پناہ کے لیے دعا

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ یہ دعا پڑھا کرتے تھے: ”(اے میرے معبود) میں پناہ مانگتا ہوں تیرے عزت و جلال کی۔ کوئی عبادت کے لائق نہیں سوائے تیرے، جسے کبھی موت نہیں آئے گی جبکہ جن و انس سب کو موت آئے گی۔“

(بخاری کتاب 97، باب 7: مسلم کتاب الذکر۔ باب 18)

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ یہ دعا مانگا کرتے تھے۔ ”اے میرے مالک! بخش دے میری خطا، میری نادانی اور میری وہ زیادتی جو میں نے خود اپنے تمام معاملات میں کی ہے جس کو تو مجھ سے زیادہ جانتا ہے۔ اے اللہ! میری غلطیاں، میرا قصد گناہ اور میری نادانی اور میری حماقت سب معاف فرما دے۔ (میں اقرار کرتا ہوں کہ) یہ سب ہاتھ میں مجھ میں ہیں۔ اے اللہ! میرے تمام اگلے اور پچھلے، پوشیدہ اور ظاہر گناہ معاف فرما دے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔“

(بخاری کتاب 80، باب 60: مسلم کتاب الذکر۔ باب 18)



فہرست

24

خصوصی انٹرویو

پٹی آئی کی کورکیشن کے بیدار مغز رکن تسنیم نورانی

اپنے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں
معاشی مشکلات داخلی سلامتی کے چیلنجز
توانائی کے بحران اور پبلک ٹرانسپورٹ
کے بارے میں اپنا ویژن پیش کرتے ہیں



جاتا ہے۔ ہر روز طالب علم کی کارکردگی کی رپورٹ ہذا ہر ایس ایم ایس والدین تک پہنچائی جاتی ہے۔ اکیڈمی کا سربراہ خود بھی ہر ماہ والدین سے فون پر رابطہ کرنے کا پابند ہے۔ اگر والدین اپنے بچے کی کارکردگی سے ناواقف ہوں تو اکیڈمی اسے اپنی ذاتی تصویر کرتی ہے۔

دنیا کے بہت سے ممالک میں جدید اکیڈمیوں کا یہ نظام چیزی سے مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔ لیکن ٹی اکیڈمی سے بچے کو پڑھانے کے لیے والدین کو کثیر سرمایہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ یہ خرچہ فریب والدین کے بس سے باہر ہوتا ہے۔

پاکستان میں بھی لاکھوں بچے سرکاری و نجی اسکولوں میں زیر تعلیم ہیں مگر ان کے والدین تعلیمی معیار اور نتائج سے مطمئن نہیں۔ اسی لیے بیشتر والدین بچوں کو نیشنل سینٹر بھیجے پہ مجبور ہیں جو کہ بھاری بھار کم فیس لیتے ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں درجن ہاں تینوں اداروں کے احتساب کا کوئی مکمل موجود نہیں۔ جنونی کور یا میں ہر ٹرم کے بعد طلبہ ہر استاد کی کارکردگی جانچتے اور اسے نمبر دیتے ہیں۔ اسی وجہ ہندی پہ استاد اور اکیڈمی دونوں کے مستقبل کا دارومدار ہوتا ہے۔ پاکستان میں بھی اسی قسم کا مکمل شروع ہونا چاہیے تاکہ اساتذہ کی کارکردگی بھی کے سامنے آسکے۔

تازہ ترین اخباری اطلاعات کے مطابق محکمہ تعلیم پنجاب نے سرکاری کالجوں اور اسکولوں کے اساتذہ پر ٹی اکیڈمیوں میں خدمات انجام دینے پر پابندی عائد کر دی ہے۔ ایسے تمام اساتذہ کے خلاف پیڈ ایکٹ کے تحت کارروائی عمل میں لائی جائے گی۔ محکمہ نے یہ فیصلہ سرکاری کالجوں اور اسکولوں میں اساتذہ کی ناقص کارکردگی کے باعث کیا۔ کور یا میں 1980ء کی دہائی میں ٹی اکیڈمیوں پر پابندی لگائی گئی لیکن مختلف وجوہات کی بنا پر ان پابندیوں کے مطلوبہ نتائج برآمد نہ ہو سکے۔ ہماری حکومتوں کو بھی کور یا اور دوسری اکیڈمک سپرپاورز کے تعلیمی نظام کا جائزہ لے کر اصلاحات کرنا ہوں گی تاکہ پاکستان بھی درست سمت میں آگے بڑھ سکے۔ تعلیم کے شعبہ میں انقلاب ہی سے نیا اور بہتر پاکستان بن سکتا ہے۔

طیبہ مسیحہ قریشی
tayyab.ajiaz@urdu-digest.com

پڑھو، پڑھاؤ، پڑھائیں اور لکھ لکھائیں

اردو ڈائجسٹ 09



ایگزیکٹو ایڈیٹر نوت

ہم اکثر جنونی کور یا کی معاشی ترقی کی مثال دیتے رہتے ہیں۔ کم لوگ جانتے ہیں کہ یہ ملک تعلیم کے میدان میں بھی سپرپاور بن چکا۔ مستند سروے بتاتے ہیں کہ تعلیمی معیار میں پندرہ سالہ کور یا کی نوجوان امریکی نوجوان سے کہیں بہتر ہے۔ میدان تعلیم کی دوسری بڑی سپر طاقتیں چین، سنگا پور، ہانگ کانگ اور تائیوان ہیں۔ کور یا کو اس مقام تک پہنچانے میں حکومت کا مل دخل بہت کم رہا۔ سرکاری اسکول ہمارے اسکولوں کی طرح نتائج دینے میں ناکام رہے۔

البتہ ٹی اکیڈمیوں (جدید نیشنل سنٹرز) نے انقلاب برپا کر دیا۔ بچے دن میں سرکاری اسکولوں میں جاتے اور پھر رات نو بجے تک نیشنل سنٹر میں مطلوبہ مضامین پڑھتے ہیں۔ ان اکیڈمیوں میں اساتذہ کو طے شدہ تنخواہ دی جاتی ہے۔ جو استاد جتنی محنت کرتا اتنا ہی زیادہ کماتا ہے۔ طلبہ کی عمدہ کارکردگی ہی اس کی مقبولیت اور دولت کا ذریعہ بنتی ہے۔ کور یا میں والدین سالانہ سترہ ارب ڈالر سے زیادہ بڑی رقم ان جدید اکیڈمیوں کی خدمات لینے پر خرچ کرتے ہیں۔ کئی اکیڈمیاں تو اسٹاک مارکیٹ میں رجسٹرڈ اور اربوں روپے سالانہ منافع کما رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شعبہ تعلیم میں سرمایہ کاری کے لیے دنیا کے بڑے بڑے سرمایہ کار جنونی کور یا کا رخ کر رہے ہیں۔

جنونی کور یا میں ہر بچہ بڑا ہو کر استاد بننا چاہتا ہے کیونکہ وہ استاد بن کر عزت کے ساتھ ساتھ بے تحاشا دولت بھی کماتا ہے۔ ان اکیڈمیوں میں استاد بننے کے لیے کسی روایتی اور مستند تعلیمی ادارے سے ڈگری یا تجربے کی قید نہیں۔ حتیٰ کہ پڑھانے کے اوقات اور طریقہ کار پر بھی کوئی بندش نہیں ہوتی۔ اساتذہ اپنا وقت ٹیگٹرز دینے پر کم اور طلبہ سے براہ راست یا آن لائن ٹال میل اور انفرادی مسائل حل کرنے پر زیادہ صرف کرتے ہیں۔ یہ ٹیگٹرز طلبہ کو نہایت کم قیمت پر ہی ڈی میں بھی دستیاب ہوتے ہیں۔ جیسے ہی بچہ داخل ہوتا ہے، تو وہ اکیڈمی کی ڈسے داری بن

نومبر 2014ء
محرم الحرام 1436ھ
جلد نمبر 54، نمبر 11

اردو ڈائجسٹ

urdu-digest.com www.urdu-digest.pk

- صدر مجلس: ڈاکٹر اہاز حسن قریشی
- مدیر اعلیٰ: اظاف حسن قریشی
- ایگزیکٹو ایڈیٹر: طیبہ اہاز قریشی
- اسسٹنٹ ایڈیٹر: سید عامر محمود
- سب ایڈیٹر: نظام شاہد
- مجلس تحریر: حافظ انور و حسن نوید اسلام صدیقی، سلیمی اموان
- مجموعہ طباعت: فاروق اعجاز قریشی
- انچارج ایڈیٹر: انان کا مران قریشی
- پروف ٹرانس: خالد محمد العزین
- کمپوزر: اشرف سکندر

مارکیٹنگ

ڈائریکٹر: ڈی اہاز قریشی 0300-8460093

اشتہارات

advertisement@urdu-digest.com
ٹیلیگرام: درنا ناز منٹ: محمد سلیمان احمد 0300-4116792
لاہور: ندیم حامد کوجرانوال احسان اللہ بٹ
اسلام آباد: محمد سلیم کراچی: شاز پتھر 0345-2558648

سالانہ خریداری

560 روپے کی بچت کے ساتھ
subscription@urdu-digest.com
19/21 ایگزیکٹو، من آباد، لاہور فون 92 42 37589857
پاکستان 1560 کے بجائے 1000 روپے میں اردو ڈائجسٹ خریدنے حاصل کیجئے
برون ملک 60 امریکی ڈالر
اندرون اور دن ملک کے لیے ادائیگی رقم بذریعہ بینک ڈرافٹ
درج ذیل اکاؤنٹ نمبر پر ارسال کریں

URDU DIGEST Current A/C No. 800380
Bank of Punjab (Samanabad, Lahore.)
Branch Code No. 110

ادارتی آفس

اپنی تحریریں اس پتے پر بھیجیں
325, G-III جوہڑا روڈ، لاہور
فون نمبر: +92-42-35290738 • فکس: +92-42-35290731
ای میل: editor@urdu-digest.com

ت 100

خانہ اشاعت: نیشنل سنٹر، جلد نمبر 24، سڑک نمبر 11، پتہ: من آباد، لاہور

اردو ڈائجسٹ 08

WWW.PAKSOCIETY.COM

نومبر 2014ء

مکرمات

فہرست

اکشافات

ہر سال منعقد ہونے والا
امریکی انتہا
پسندوں کا
خفیہ اکتھ



سید عاصم محمود 106

چین اور بھارت کی
سرحدی جھڑپیں

ذیشان حسن



96

یاد رکھنا

صلے کی تمنا نہ ستائش کی پروا

لاہور ہائیکورٹ
کا عوامی



راہنما

حامد ریاض ڈوگر 129

بستی

تپتی دھوپ میں شہنشاہی چھاؤں

بزرگوں کا نشیمن

صبیح خان



166

ایک خودکش حملہ آور

کی ڈائری

ترکی جب سپر پاور تھا 147

اردو ڈائجسٹ 11

فہرست

اسلامی زندگی کی کہکشاں

65 نور نبوت کی کرنیں جنہوں نے بیٹی کو زندہ

دن کرنے والے سنگدل باپ کی کاپاپٹ ڈالی

69 جب گورنر کو قانون کے سامنے سر جھکانا پڑا

اسلامی عدل و انصاف کے بے مثال واقعات

73 عیسائی بڑھیا کی وصیت

مسلم حکمرانوں کا بے مثال عدل اجاگر کرتا سبق آموز واقعہ

75 فاطمہ کے لعل

لواء رسول کی حیات مبارکہ کے یادگار اور سبق آموز پہلو

175 اللہ دیکھ رہا ہے نامہ اعمال سنوارنے

کی تک و دو میں جتنا ایک مسلمان کا سفر خود آگیا



یادگار لمعہ جوشل جنت مقام پرگزریں 57

آزاد کشمیر میں

پندرہ دن 56

طیب اعجاز قریشی

56

56

56

معاشرے کے معصوم بچوں کا چہرہ سوال 86

آپ قاتل

تو نہیں؟

ایک غیر معمولی بچے

کی دلگیر کتھا

حمزہ کامران 86

86

الطاف حسن قریشی کے قلم سے

15 کچھ اپنی زبان میں

بھارت کی شراکیزی کا موثر جواب

17 بھائی جی

اردو ڈائجسٹ 10

اقوالیات

ایک صدی قبل کا دلچسپ واقعہ

جب علامہ اقبال نے
مجھے پسندوؤں



سے لڑوا ڈالا

ایم۔ اسلم 137

کھیل نگاری

دنیا کے فٹ بال کا مسلمان ہیرو

مسعود اوزل



ہادی علی



183

ولندیزی خاتون طالبان

کی تلاش میں

226 ہیروں کا نرالا دیس

2014 Pa

WWW.PAKSOCIETY.COM

2014 Pa

اردو ڈائجسٹ 10

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ ہر ای بک کی ڈی ایف فائلنگ
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

WWW.PAKSOCIETY.COM ,2014 Pa

180 کھجور انسان کو سرطان، قبض، غلغولت اور سوجن سے محفوظ رکھنے والا مقدس میوہ

رنگارنگ تحریریں

81 موسم جب ظالم بن جائے

ارہوں انسانوں کی جان و مال خطرے میں

89 مجھے سیاسی ماشتوں سے بچاؤ!

جہاں تہاں سیاست پہ ہونے والی گفتگو کے ذ سے ایک پاکستانی کی دہائی

100 جنت کی تلاش میں

دیار غیر بیاہ کر جانے والی پاکستانی دو شیزہ کا المناک ماجرا

110 رنگ بدلتی زندگی

فانی اسیا سے دلی لگاؤ رکھنے والی معصوم لڑکی کا فسانہ

117 دم دمشق اندر قدیم ترین شہروں میں

سے ایک اسلامی الف لیلوی مگر کا منفرد سفر نامہ

142 معبود

ایک بد قسمت بیوی کی غمناک کہتا

154 چنانازم کا ماہر بابا

ٹیلی ہسٹری کے راز جاننے والے دو ماہرین کا حیرت انگیز تذکرہ

187 دل کی بات

ایک جنازے میں جمع انسانوں کا فسانہ جن کے لبوں کی بات اندرونی سوجنوں سے بالکل مختلف تھیں

مستقل سلسلے

209 چناروں کی قطار

232 قصہ کوئٹہ

240 بوجھ تو جانیں

235 چمن خیال

اردو ادب

123 بہو ہو تو ایسی ایک سلیقہ شعار بہو کا تذکرہ

جس نے پھو بڑھ کر کا نقشہ ہی بدل ڈالا

133 ہیر وارث شاہ سے موبائل تک

دیہی زندگی کے ایک سوسال کا ماجرا

159 اپنی پہچان کبھی نہ بھولو

پاک مٹی سے جڑے روایتی رہن بہن کا دلچسپ تذکرہ

189 میں بزدل نہیں ہوں

خود فراموشی کی ردا اتار کر ہوش میں آنے والے ایک ہاشور کی سبق آموز کہانی

192 زندہ باد استانی جی شرافت کی پتلی کو یہ

بھی گوارا نہ تھا کہ کوئی غیر مرد اس کی آواز سن لے

195 ماں جیسا کوئی نہیں

اولاد کی خاطر جان قربان کرنے والی ہستی کے حضور جذبات بھرا نذرانہ عقیدت

202 تیرا لمحہ

پاک وطن سے جی محبت کرنے والے ایک پاکستانی کا ماجرا غم

220 علی گڑھ کی سنہری یادیں

ایک عظیم درس گاہ میں بیتے سہانے وقت کے اوراق زریں کا حسین تذکرہ

طب و صحت

114 گلومین آپ کا دشمن تو نہیں

چھوٹی آنت کو گھاسڑا دینے والے ایک پرہیزگار مادے کا بیان

اردو ڈائجسٹ 12

بھارت کی شراکتی کی کامیابی کا موثر جواب

مودی نے انتخابی مہم کے دوران پاکستان کے خلاف ایک جارحانہ اور دھمکی آمیز لہجہ اختیار کیا تھا مگر وزیراعظم نواز شریف اس کی تقریب حلف افاداری میں اس خیال سے شریک ہوئے تھے کہ معاملات کو بہتر بنانے کی سبیل نکل آئے گی، حالانکہ بعض ہائر تو می حلقے اس شرکت کے حق میں نہیں تھے۔ بھارت کی طرف سے یہ تاثر دیا گیا کہ وہ کشمیر کا آئین میں دیا ہوا اسٹیشنل اسٹیشن ختم کر کے اسے اپنا ایک صوبہ بنالے گا اور پاکستان کو کشمیر یوں کی حمایت سے دستبردار ہو جانا چاہیے۔ اس کے برعکس پاکستان کی مسلسل کوشش رہی کہ مذاکرات کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو جائے اور گفت و شنید کے ذریعے دیرینہ تنازعات کا حل تلاش کر لیا جائے، مگر وزیراعظم نواز شریف مودی بات چیت کے دروازے بند کرتے چلے گئے اور بھارتی وزیر دفاع نے یہ دھمکی بھی دے ڈالی کہ ہم پاکستان کو سبق سکھا دیں گے۔ ان رویوں کے پیش نظر وزیراعظم پاکستان نے بڑی جرأت اور پوری فہم و فراست کے ساتھ کشمیر کا مسئلہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں اٹھایا اور بین الاقوامی برادری سے اپیل کی کہ جنوں کشمیر میں رہنے والوں کو ان کا حق خودارادیت دلانے میں اپنا کردار ادا کرے اور بھارت پر سفارتی دباؤ بڑھائے۔ اس تقریر پر بھارتی نیٹاؤں کے تن بدن میں آگ لگ گئی کہ وہ اقوام متحدہ کی سکیورٹی کونسل کا مستقل ممبر بن جانے کے خواب دیکھ رہے تھے۔

بھارت نے طیش میں آ کر لائن آف کنٹرول اور ورکنگ باؤنڈری پر گولہ باری شروع کر دی جس کے نتیجے میں درجنوں سویلین شہید اور زخمی ہوئے اور متعدد فوجی بھی جام شہادت نوش کر گئے۔ یہ سلسلہ کئی نئے جاری رہا۔ بد قسمتی سے یہی وہ دن تھے جب اسلام آباد میں دھرنے دیے جا رہے تھے اور حکومت اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی تھی۔ ہمارے وزیر دفاع جو بھلی کی لوڈ شیڈنگ کے معاملات میں الجھے ہوئے تھے وہ کئی روز تک خاموش رہے۔ تب آرمی چیف جنرل رانیل شریف نے بڑی متانت اور ایمانی طاقت سے بیان دیا کہ ہم دشمن کو منہ توڑ جواب دینے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس کے بعد بھارت کی شراکتی میں کسی قدر کمی آئی اور دونوں طرف کے ڈائریکٹر جنرل آپریشنز کے مابین رابطے قائم ہوئے۔ پاکستان کی مسلح افواج ان دنوں دہشت گردوں کے خلاف آپریشن ضرب عضب میں ہمہ تن مصروف ہے۔ بھارت نے غالباً اس آپریشن کو ناکام بنانے کے لیے مشرقی سرحد پر چھیڑ چھاڑ شروع کی ہے۔ اسی کے ساتھ اس نے بلوچستان میں اپنی خفیہ سرگرمیاں تیز کر دی ہیں اور وہاں امن عامہ کا نہایت سنگین مسئلہ پیدا ہوتا جا رہا ہے۔ غالباً وہ یہ پیغام دینا چاہتا ہے کہ پاکستان جب کبھی کشمیر کا مسئلہ اٹھائے گا تو بلوچستان میں نیم بغاوت کی سی کیفیت پیدا کر دی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ تمامہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سیریم کوالٹی، نارل کوالٹی، کیریڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ایچ
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



بھائی جی

الطاف حسن قریشی

ہمارے بھائیوں اور بہنوں میں سب سے بڑے تھے اس لیے ہم سب انہیں ”بھائی جی“ کہتے تھے بلکہ ہمارے پوتے اور نواسے بھی یہی الفاظ ہمارے منہ سے بار بار سنتے سنتے انہیں بھائی جی ہی کہنے لگے تھے۔ وہ ۹۶ سال کی عمر میں ۴ ستمبر ۲۰۱۳ء کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ اُن کا نام گل حسن تھا اور اُن کی زندگی شرافت، دیانت، محنت اور بے پایاں محبت و شفقت اور مزاج میں بشارت کا ایک حسین مرقع تھی۔ ہمارے والد محترم جناب شیخ عبدالغفار محکمہ انہار میں پنواری تھے جن کی آمدنی خاصی محدود تھی۔ ہماری والدہ فردوسی بیگم اور والد صاحب کا ایک ہی خاندان تھا جو لوگوں کو قرآن کی تعلیم دینے اور اپنے رب کی عبادت کرنے میں شب و روز مصروف رہتا تھا۔ ان میں فقر کی ایک شان پائی جاتی تھی۔ گل حسن صاحب والدین کی پہلی نرینہ اولاد تھے۔ وہ ۱۹۱۸ء کے لگ بھگ ضلع کرناٹک کے ایک چھوٹے سے قصبے ہاڑی میں پیدا ہوئے۔ یہ مسلمان راجپوتوں کا علاقہ تھا جہاں ایک مزار بھی آباد تھا۔ ہماری سب سے چھوٹی بہن عجبہ بیگم کے سوا باقی تمام بہن بھائیوں کی ولادت اسی قصبے میں ہوئی۔ ہمارے والد یہاں بیس برس کے لگ بھگ رہے تھے۔

کرناٹک صوبہ پنجاب کا ایک ضلع تھا۔ اس کی اہمیت یہ تھی کہ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم نوابزادہ لیاقت علی خاں کا تعلق اسی علاقے سے تھا۔ اس ضلع کی ایک تحصیل پانی پت کے حافظ پورے ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے اور اُن کی قرأت میں



حافظ فروغ حسن، الطاف حسن قریشی، ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی، حاجی گل حسن (مرحوم)

جائے گی۔ عالمی برادری کی توجہ بنانے کے لیے بھارتی ایکشن کمیشن نے نومبر کے اندر مقبوضہ کشمیر میں انتخابات کا اعلان کر دیا ہے لیکن اس کے خلاف انتہائی شدید رد عمل سامنے آیا ہے۔ جموں اور کشمیر کی نمائندہ سیاسی جماعت حریت کانفرنس نے اُن کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا ہے اور حکمران جماعت نیشنل کانگریس نے بھی ایک باغیانہ رویہ اختیار کیا ہے۔

ہماری وزارت خارجہ عملی طور پر تقسیم ہے اور ہمارے مشیر خارجہ بہت زیرک ہونے کے باوجود عمر کے جس حصے میں ہیں ان کے لیے بہت فعال رہنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ اُن کا بڑی تاخیر سے بیان آیا ہے کہ ہم بھارت کو کشمیر پر ہاتھ صاف کرنے کی اجازت نہیں دیں گے اور عالمی برادری کو اس معاملے میں پوری طرح متحرک کریں گے۔ بلاشبہ مسئلہ کشمیر پر پاکستان کے اندر قومی اتفاق رائے پایا جاتا ہے اور سیاسی اور فوجی قیادت بھی پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ چیپلز پارٹی کے چیئرمین بلاول زرداری نے بھی کراچی کے جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے کشمیر کے مسئلے پر ایک مضبوط موقف اپنایا ہے مگر سیاسی حالات میں غیر معمولی اچھل پیدا ہو جانے کی وجہ سے ہمارے عوام اس بات سے پوری طرح واقف نہیں کہ بھارت نہایت عیاری سے کس کھیل میں مصروف ہے۔ اس کے تیور اچھے نہیں اور اس کی فوجی تیاریاں عروج پر ہیں۔ جدید ترین اسلحے کے انبار لگائے جا رہے ہیں اور برق رفتار محدود جنگ کی دھمکیاں بھی دی جا رہی ہیں۔

ان حالات میں پہلا کام کرنے کا یہ ہے کہ اپنا گھر درست کیا جائے۔ ہم لوگ ملک کے اندر بھی آپس میں لڑ رہے ہیں اور باہر بھی۔ لندن میں کشمیریوں کے حق میں جو ملین مارچ ہوا وہ عالمی سطح پر بہت بڑی پیش رفت ہے۔ اس احتجاج میں پورے انگلستان سے کشمیری آئے تھے اور یورپین پارلیمنٹ کے ارکان بھی شامل ہوئے تھے۔ اس کی قیادت بیرنر سلطان کر رہے تھے۔ اس طرح مسئلہ کشمیر بین الاقوامی اہمیت اختیار کر رہا ہے مگر اس احتجاجی مارچ میں پاکستان کی دو سیاسی جماعتیں ایک دوسرے کے مد مقابل آن کھڑی ہوئیں جس سے کشمیر کا زکو قومی طور پر نقصان پہنچا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ قوم کو اپنی مسلح افواج کی بھرپور حمایت کرنے اور شمالی وزیرستان کے آئی ڈی ویز کی دیکھ بھال پر خصوصی توجہ کا مظاہرہ کرتے رہنا چاہیے۔ اس کے علاوہ ہمارے دفتر خارجہ کو بہت فعال ہونے کی اشد ضرورت ہے اور اسے سکیورٹی کونسل کے مستقل ارکان ملکوں میں سفارتی سرگرمیاں تیز کر دینی چاہئیں۔ پاکستان کے اندر بھی سیمیناروں کے ذریعے بھارت کی شرانگیزی کے خلاف ٹھوس بنیادوں پر رائے عامہ منظم کی جائے اور بھارت کی طرف دیکھنے کے بجائے اپنے اندر جھانکنے کی حکمت عملی اپنائی جائے۔ اور عالمی برادری میں اپنا امیج منوانے کی منصوبہ بندی کی جائے اور بلوچستان کے معاملات میں زیادہ سے زیادہ بہتری لانے کے لیے صوبائی خود مختاری کو ادارہ جاتی انتظامات کے ذریعے فروغ دیا جائے۔ اس ضمن میں کشمیر پر ایک قومی کانفرنس منعقد کرنے کی بھی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔

الطاف حسن قریشی

کوئی پانچ سال بعد انہیں احساس ہوا کہ سکینلر ساری عمر سکینلر ہی رہتا ہے کیونکہ اس پر ترقی کے دروازے بند ہیں چنانچہ وہ کلرکی کا امتحان دینے دہلی گئے جو جن غربی سرکل کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ امتحان میں کامیابی اور ترقی پانے کے بعد ان کی تعیناتی حصار شہر میں ہوئی جو انبالہ ڈویژن کا ایک ضلع تھا۔ اسی شہر میں ہمارے ماموں جناب خلیق احمد رہتے تھے۔ ان کی صاحبزادی شکیلہ سے بھائی جی کی شادی ہوئی۔ ہندوستان تقسیم ہوا تو انہوں نے پاکستان کا آپشن دیا اور ان کی تعیناتی اری گیشن ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لاہور میں ہوئی جس کے باعث انہیں گورنمنٹ چوہدری کوارٹرز میں رہائش ملی۔ ہمارا پورا خاندان جب سر سے پاکستان آیا تو ہم نے ۲۳ ڈی میں قیام کیا تھا۔

بھائی جی جھکے میں ترقی پانے کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ انہوں نے سب ڈویژنل کلرک کا امتحان پاس کیا اور ان کی تقرری لاہور سے ہابر ہوئی۔ دیانت داری اور فرض شناسی سے کام کرنے کی ہدایت وہ ترقی پا کر اکاؤنٹس کلرک بن گئے اور اس پورے عرصے میں اپنے بھائیوں کی اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں ان کے ساتھ مالی تعاون کرتے رہے۔ پھر ان کی زندگی میں ایک سخت مقام آیا۔ اردو ڈائجسٹ کے اجرا کو پانچ سات سال ہو چکے تھے اور اسے ایک نہایت قابل اور ذمے دار اکاؤنٹس کی ضرورت تھی۔ بھائی جی سے اس مسئلے پر بات ہوئی تو انہوں نے کسی تامل کے بغیر سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کا فیصلہ کر لیا اور ۱۹۸۰ء تک اردو ڈائجسٹ کی بے مثال خدمت سرانجام دیتے رہے۔ حسابات اس قدر شفاف رکھے کہ بھٹو دور حکومت میں ہمیں قانون کی گرفت میں لانے کی سرتوڑ کوششیں ہوئیں اور انکم ٹیکس کے ایک اعلیٰ افسر اس ادارے کے خلاف مقدمات بنانے کے لیے خاص طور پر تعینات کیے گئے لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے وہ ہمارے حسابات میں ایک بھی قابل گرفت نکتہ تلاش نہ کر سکے۔ بھائی جی ایک ایک پائی کا حساب رکھتے اور صدر وجہ کفایت شعاری سے کام لیتے تھے۔ بلاشبہ وہ اردو ڈائجسٹ کو اپنا خون جگر پلاتے اور عملے کے ساتھ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آتے رہے۔ ان کی ایثار پیشہ اور پالغ نظر شخصیت نے ہمیں بہت ساری بلاؤں سے محفوظ رکھا۔ محکمہ انہار سے وہ اپنے ساتھ ایک قابل اعتماد اور انتہائی زیرک اکاؤنٹس کلرک جناب سنبھی کو بھی لے آئے تھے۔ ان دونوں اصحاب نے مل کر اس ماہنامے کی مالیاتی بنیادیں اس قدر مضبوط اٹھائیں کہ وہ آگے چل کر ہفت روزہ ”زندگی“ اور روزنامہ ”جسارت“ ملتان کا ہار بھی برداشت کر گیا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے بھائی جی کو بے پایاں صلاحیتوں اور خوبیوں سے نوازا تھا۔ خاندانی رشتوں کی قدر و قیمت کا انہیں بہت پاس تھا۔ ان کی پہلی شادی اپنے ماموں کے ہاں ہوئی تھی اور ان کی اہلیہ آٹھ دس برس بعد بیمار رہنے لگی تھیں مگر انہوں نے آزمائش کا یہ ہر اعرصہ غیر معمولی تحمل اور خوش اخلاقی کے ساتھ گزارا۔ ان کے سسرال میں بڑوں سے لے کر چھوٹوں تک سب ان کے حسن اخلاق کی تعریف کرتے اور ان کا نام بڑے احترام سے لیتے تھے۔ ان کی دوسری شادی ساہیوال میں جناب شیخ محمد اسحاق کی صاحبزادی سعیدہ بیگم سے ہوئی اور دونوں نے ایک مثالی عائلی زندگی بسر کی۔ ان دونوں میاں بیوی نے ہماری والدہ اور ہمارے والد صاحب کی اس طرح خدمت کی جو ایثار اور فرماں برداری کی ایک اعلیٰ مثال بن گئی۔ والدہ صاحبہ پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ کئی سال اس حالت میں رہی تھیں۔ بھائی سعیدہ نے دن رات بڑی خندہ پیشانی سے ان کی تیمارداری کی۔ اسی طرح والد صاحب بھی کئی سال تک بستری عیال پر رہے۔ آخری برسوں میں اچھرے کے اس گھر میں منتقل ہو گئے تھے جو سر سے کے گھر کے عوض ۱۹۷۵ء کے آخر تک ان کی تحویل میں آیا۔ بھائی جی اور ان کی

ایک خاص جاذبیت پائی جاتی تھی۔ ۱۹۳۰ء میں والد صاحب تہذیب ہو کر سر سے آگئے جو پنجاب کے ضلع حصار کی ایک تحصیل تھی۔ تحصیل میں تو مسلمانوں کی اکثریت تھی مگر شہر کے اندر وہ اقلیت میں تھے۔ ہماری والدہ صاحبہ جن کو اللہ تعالیٰ نے بڑی دانائی اور قوت ارادی عطا کی تھی انہوں نے اس شہر میں مستقل سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ تہذیبوں کی وجہ سے ان کی اولاد کی تعلیم و تربیت میں کوئی خلل نہ پڑے۔ انہوں نے قلیل آمدنی میں سے کچھ رقم جمع کر لی تھی چنانچہ فوری اپنا گھر تعمیر کرنے کا نقشہ بنایا۔ میرے بھائی گل حسن اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے گارا گوندتے اور پھر میری بہن انوری بیگم اُسے والدہ تک پہنچاتی جو کچی اینٹوں سے دیواریں اٹھاتی چلی جاتی تھیں۔ سات آٹھ ماہ کی مشقت سے تقریباً ایک کنال کا گھر تیار ہو گیا جس میں چار کمرے اور ایک بڑا برآمدہ تھا۔ بھائی جی ہمیں اس گھر کی تعمیر کے واقعات بڑی تفصیل سے اکثر سنایا کرتے تھے کیونکہ وہ ان کے لڑکپن کا ایک ناقابل فراموش تجربہ تھا جو ان کے تحت اشعور کا حصہ بن چکا تھا۔

بھائی جی نے گورنمنٹ ہائی اسکول سر سے سے ۱۹۳۳ء میں دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا۔ ان کے ہم جماعتوں میں جناب اسلم خاں بھی تھے جن سے بعد میں میرے کا اس فیلو عمر یقین کی بمشیرہ بیباکی گئی تھی۔ آج ڈاکٹر یقین پاکستان کے ایک نہایت معروف آئی سرجن ہیں۔ میٹرک پاس کر لینے کے بعد بھائی جی کو عملی زندگی شروع کرنے کا سخت مرحلہ پیش آیا۔ والد صاحب کی خواہش تھی کہ وہ طبیب بنیں کیونکہ حکمت ان دنوں درمیانے طبقے کے لیے ایک معزز پیشہ تھا چنانچہ بھائی جی طبیب کالج دہلی میں داخل کر دیے گئے مگر ان کے مزاج کو وہ تعلیم راس نہ آئی اور اُسے درمیان ہی میں چھوڑ کر وہ گھر چلے آئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں کے لیے سرکاری ملازمت کا حصول بہت مشکل تھا۔ مگر یہ ان کے حقوق کا اس لیے خیال نہ رکھتے کہ ان کے مذہبی جوش و خروش سے خائف تھے اور ہندو اکثریت برطانوی راج سے زیادہ سے زیادہ مراعات اور حکومتی مشینری میں غلبہ حاصل کر لینے کے لیے مسلمانوں کو آگے آنے کا موقع بہت کم دیتے۔ ایک میٹرک پاس مسلمان طالب علم کے لیے کلرک بلکہ چہرہ اسی کی ملازمت بھی کچھ سہل نہیں تھی۔

بڑے سوچ بچار کے بعد بھائی جی نے اپنے تایا زاد بھائی جناب عبدالسلام کے پاس لدھیانے جانے کا فیصلہ کیا جو ایک زمانے میں محکمہ انہار میں سکینلر بھرتی ہوئے تھے۔ بھائی جی ٹیلی گرافی سیکھنے شہر ان کے پاس چلے گئے جو کوئی دو سو میل دور واقع تھا۔ یہ کام سیکھ لینے کے بعد بھی وہ کئی ماہ بیکار رہے اور ان کی چھ ماہ کے لیے عارضی پوسٹنگ موجود کھیزہ میں ہوئی جہاں در پائے گھاگھرا کے اوپر اولو کے مقام پر ایک بند تعمیر کیا گیا تھا جہاں سے وہ نہریں نکلتی تھیں جو ریاست بیکانیر کو سیراب کرتی تھیں۔ یہ وہی در پائے گھاگھرا ہے جو پاکستان کے چولستان میں آ کر ختم ہو جاتا ہے۔ پانی کے بہاؤ کی پنسال بھیجنے کے لیے وہاں ایک تار گھر تھا جہاں سے ٹیلی گرافی کے ذریعے پیغامات دیے جاتے تھے۔ چھ ماہ کے بعد بھائی جی بے روزگار ہو گئے اور ملازمت کے لیے دوڑ دوڑ کر رہے۔ انہی دنوں اس علاقے میں سالہا سال سے پارٹیشن نہ ہونے کے باعث قحط پڑا۔ حکومت نے روزگار کے مواقع پیدا کرنے کے لیے سر سے اور حصار کے درمیان سڑک تعمیر کرنے کا اعلان کیا۔ بھائی جی اس نئی فورس میں بھرتی ہو گئے۔ انہوں نے سخت موسموں کے اندر تین سال چھوٹا دیوں میں گزارے۔ بعد ازاں مستقل سکینلر کی حیثیت سے ان کی پہلی تعیناتی جن غربی نہر کے کنال ڈویژن میں ہوئی۔ ان کے وہاں سے مختلف مقامات پر تہا لے ہوتے رہے۔

کلام تھا اور بے تکلفی کا مظہر تھا۔ بھائی سعیدہ کے بھائی بہن ساہیوال سے ملنے آتے رہتے تھے۔ اس طرح گھر میں رونق لگی رہتی۔ میری دوسری شادی نومبر ۱۹۷۳ء میں جناب غازی خدا بخش کی صاحبزادی شاہدہ بیگم سے ہوئی۔ غازی صاحب نے جہاد کشمیر میں حصہ لیا تھا اور ہجرت کی تحریک میں وہ اپنے بڑے بھائی حاجی نور احمد کے ہمراہ افغانستان کے راستے روس گئے تھے۔ وہ مولانا احمد علی لاہوری کے پیروکاروں میں سے تھے اور ماہنامہ "نونہال" نکالتے تھے۔ میری اسی شادی کا ایک قابل ذکر پہلو یہ تھا کہ بارات میں جناب اے کے بروہی اور سردار شیر ہاز خان مزاری شامل ہوئے تھے اور ویسے کی دعوت میں بہت سارے دوستوں کے علاوہ چودھری ظہور الہی آئے تھے جنہیں واپس جاتے ہوئے گرفتار کر کے بلوچستان کی سب سے خطرناک جیل میں بھیج دیا گیا تھا۔ میری اہلیہ بھائی جی سے اکثر ملنے جاتیں تو وہ بہت خوشی اور گہری اپنائیت کا اظہار کرتے۔ اسی طرح میری بہو بیگم تبسم ان سے ملنے جاتیں تو اکثر بتاتی کہ بھائی جی کی ہلکی پھلکی باتوں سے ایک عجب قسم کی سرشاری اور تازگی محسوس ہوتی ہے۔ یہ ان کی اچھی صحت اور لمبی عمر کا سب سے بڑا راز تھا۔

اللہ تعالیٰ نے بھائی جی پر ایسی خاص عنایت فرمائی تھی کہ ان کی ہر ضرورت اور خواہش پوری ہو جاتی۔ ان کی پرورش تو ایک غریب گھرانے میں ہوئی تھی مگر ان کا ذوق بہت ستم اور اعلیٰ تھا۔ وہ اچھا لباس پہنتے اور اس کی صفائی ستھرائی کا خیال رکھتے۔ دن کے وقت آرام کرتے تو کپڑے بدل لیتے رات کے سونے کا لباس بھی ان کا الگ ہوتا تھا۔ نماز کے کپڑے بھی ان کے علیحدہ تھے۔ یہی عالم ان کے کھانے پینے کے آداب کا تھا۔ صبح سات بجے ناشتا کرتے، گیارہ بجے چائے پیتے، ٹھیک ڈیڑھ بجے کھانا کھاتے اور مقررہ وقت پر شام کی چائے پیتے اور آٹھ بجے عشاء یہ کھا لیتے۔ میز استعمال کرتے اور ان کی خواہش ہوتی کہ ہر شے قرینے سے استعمال کی جائے۔ وہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتے تھے اور اس بات کے قائل تھے کہ ایک متوسط گھرانہ سلیقے اور قرینے ہی سے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے شاد کام ہو سکتا ہے۔ وہ ہمارے لیے ایک رول ماڈل کی حیثیت رکھتے تھے کہ ان کی عادات و اطوار میں بڑا توازن تھا اور ان کے مزاج میں باقاعدگی اور خوش مزاجی غالب تھی۔ وہ خود بھی خوش رہتے اور ملنے والوں میں بھی خوشیاں بانٹتے رہتے۔ آخری چند برسوں میں ان کی بینائی جاتی رہی تھی اور وہ ٹی وی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ کہیں آنا جانا بھی دشوار ہو گیا تھا مگر دل شکستہ ہونے کے بجائے بھائی جی نے وقت کو نبھی خوشی گزارنے کے طریقے اپنائے۔ انہیں تین پاروں کے ٹگ بھگ قرآن حفظ تھا۔ وہ صبح سویرے سورتوں کی تلاوت کرتے، ناشتے کے بعد کئی گھنٹے ریڈیو سنتے۔ اس پر قرآن کا درس بھی ہوتا، حالات حاضرہ کے تجزیے بھی، نئے اور پرانے گانے بھی، ڈاکٹروں اور حکیموں کی صحت کے بارے میں نہایت کارآمد باتیں بھی۔ پھر ان پر اہل خانہ سے تبادلہ خیال کرتے۔ بھائی حافظ فروغ حسن کو ماضی کے واقعات سناتے اور روزمرہ واقعات پر گفتگو کرتے۔ ملنے والے آجاتے تو ان کے ساتھ نبھی مذاق بھی کر لیتے۔ بیٹی قرطبہ سے پوچھتے آج کیا پکانا ہے اور ان دنوں کپڑوں کا کیا فیشن چل رہا ہے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ گھر کے ماحول کو ہلکا پھلکا خوشگوار اور پُر لطف رکھتے اور چھوٹی چھوٹی خوشیاں تخلیق کرتے رہتے۔

ان کی اچھی صحت کا راز بھی یہی تھا کہ وہ خوش ہاش رہتے اور لمبی سیر کرتے تھے۔ والی ہال کھیلنے کا شوق تو انہیں زمانہ طالب علمی ہی سے تھا اور ہا قاعدہ ورزش ان کی زندگی کے معمولات میں شامل تھی۔ وہ جب اچھے والے گھر میں آگئے تو صبح کی سیر کا سلسلہ جاری رکھا۔ وہ فجر کی نماز شادمان کی مسجد میں ادا کرتے اور یہ سلسلہ آنکھوں کی بینائی جانے تک قائم رہا۔

اہلیہ نے والد صاحب کی جس طرح رات دن تیمارداری اور خبر گیری کی 'اس کی نظیر بھی کم ہی ملتی ہے۔

والد صاحب کا انتقال ستمبر ۱۹۷۷ء میں ہوا تو بھائی جی کو یہ احساس دامن گیر ہو گیا کہ والد صاحب اس گھر کی نگہبانی مجھ پر چھوڑ کر گئے ہیں، چنانچہ وہ پانچ مرلے کے اس چھوٹے سے مکان میں ۳۸ سال تک رہے اور اس کی دیکھ بھال اور مرمت کی ذمہ داری اپنی بساط کی حد تک ادا کرتے رہے۔ بعد میں ہمارے دوسرے بھائی حافظ فروغ حسن بھی نکلن پور ہائی اسکول کی ۲۶ سال خدمت کرنے کے بعد ریٹائر ہو کر اس گھر کے بالائی حصے میں اقامت پذیر ہوئے۔ اپنے انتقال سے آٹھ دس ماہ پہلے بھائی جی نے خواب میں ایک خوبصورت اور پُر فضا مکان دیکھا۔ اس خواب کے چند ہی روز بعد بھائی سعیدہ کو دل کی تکلیف ہوئی اور انہیں ہسپتال لے جانا بہت دشوار ہو گیا، کیونکہ اچھے کی وہ آبادی بڑی گنجان ہے جہاں یہ گھر واقع ہے۔ اسی روز بھائی جی نے وہاں سے منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اللہ کی قدرت دیکھیے کہ انہیں ویسٹ وڈ کے کشادہ علاقے میں کرائے پر وہی مکان مل گیا جو انہوں نے خواب میں دیکھا تھا۔ اس مکان میں بھائی جی کوئی سات آٹھ ماہ رہے اور پھر مختصر سی علالت کے بعد اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمتوں کی بارش کرنا اور ان کی قبر کو نور سے بھرتا رہے!

والدین کے علاوہ بھائی جی کا اپنے بھائیوں، بہنوں، بہنوئیوں اور بھتیجیوں، بھتیجیوں، بھانجیوں اور خاندان کے تمام رشتے داروں کے ساتھ کامل شفقت اور گہری اپنائیت کا تعلق فروغ پاتا رہا۔ میری اہلیہ رحمانہ کا جب دسمبر ۱۹۷۰ء میں انتقال ہوا تو میری بیٹی قرطبہ دو سال اور بیٹا کامران کوئی آٹھ سال کا تھا۔ ان کی پرورش بھائی سعیدہ نے کی جو رحمانہ مرحومہ کی خالہ زاد بہن تھیں۔ بھائی گل حسن اولاد کی نعمت سے محروم رہے، لیکن انہوں نے اپنے بھتیجیوں، بھتیجیوں اور بھانجیوں کو اپنی اولاد سمجھا اور ان کے درمیان اپنی شفقت اور اپنی دعائیں تقسیم کرتے رہے۔ میری بیٹی قرطبہ اور اس کے شوہر عزیز م مظہر احمد سعیدہ ان کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ خاندان کے معتد و لڑکے اور لڑکیاں اعلیٰ تعلیم کے لیے ان کے گھر میں کئی کئی سال قیام کرتے۔ بھائی جی اور بھائی سعیدہ کے دل بہت بڑے اور محبت اور شفقت سے بھرے ہوئے تھے۔ اردو ڈائجسٹ کا دفتر من آباد جس عمارت میں واقع تھا، اس کی بالائی منزل میں میرے بڑے بھائی اعجاز حسن قریشی کی جیلی رہتی تھی۔ بھائی جی نے اردو ڈائجسٹ میں سا لہا سال کام کیا تھا اور ہم تینوں بھائی دوپہر کا کھانا اور پرانی کھاتے اور بھائی رضیہ کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوتے۔ اصل میں اس عظیم خاتون کا اردو ڈائجسٹ کے اجراء اور نشوونما میں بہت بڑا کردار تھا۔ اس لیے بھائی جی ان کے بیٹوں اور بیٹیوں سے گہری انسیت رکھتے جو ابھی تعلیم و تدریس کے مختلف مراحل سے گزر رہے تھے۔ وہ بڑے ہوئے تو فاروق، خالد، قاسم، سعادت، طیب، رومی اور زمر ان کے دست بازو ثابت ہوئے۔ ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی کے دوسری اولاد کا بھی یہی عالم تھا جو بھائی کینز کے بطن سے تھیں۔ اسی طرح ہماری بہن اکبری بیگم اور چھوٹی بہن بیگم کے بیٹے اور بیٹیاں ان پر جان چھڑکتی تھیں۔ اسلام آباد سے ارتضا اور فیضان ملنے کو آجاتے اور ان کے ساتھ وقت گزارتے۔ ہماری مرحومہ بہن انوری بیگم کے نیاز بیگ اور اخلاق بیگ بھی ان سے جڑے رہتے تھے۔ بھائی جی اپنے بہنوئی ضیاء الرحمن اور شیخ عبدالحفیظ کا بڑا احترام کرتے۔ ضیاء الرحمن تو پورے ایک عشرے اردو ڈائجسٹ کے جنرل منیجر کے طور پر کام کرتے رہے تھے۔ ہر ایک کو "میرے یاد" کہہ کر مخاطب ہوتے جو ان کا نکیہ

بھی قرآن کی ان سورتوں کی نشاندہی فرمادیں جن کی تلاوت سے تزکیہ نفس بھی ہوتا رہے اور اپنے رب کے ساتھ تعلق بھی گہرا ہوتا جائے۔ انھوں نے سورہ رحمن، سورہ یٰسین اور سورہ مزمل کے علاوہ سورہ واقعہ اور سورہ الملک کا خاص طور پر ذکر کیا۔ بھائی جی نے وہ تمام سورتیں حفظ کر لیں اور وہ دفتری کام کے دوران بھی ان کی تلاوت اور درود شریف کا ورد کرتے رہتے تھے اور بڑی آسودگی محسوس کرتے تھے۔

ہمارے دین میں خونی رشتوں کا احترام اور ان کے مابین اچھے تعلقات بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ بھائی جی نے اپنے حسن اخلاق سے ان رشتوں کو مستحکم کیا اور ہر فرد کی خوبی اور صلاحیت کی دل کھول کر تعریف اور حوصلہ افزائی کی۔ اسی طرح وہ نہایت خاموشی سے غریبوں، ناداروں اور ضرورت مندوں کی مدد کرتے رہتے اور کہا کرتے تھے کہ اپنے لیے تو سب جیتے ہیں، مگر اسلام ہمیں دوسروں کے لیے جینا سکھاتا ہے۔ صفائی، ستھرائی اور پاکیزگی کا تصور بھی انہوں نے اسلام ہی سے لیا تھا اور ان کی خوش مزاجی میں بھی میرے رسول ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی اتباع کا دخل تھا۔ ہم نے کبھی انہیں اونچی آواز سے بولتے نہیں سنا۔ وہ ایک وضع دار، انتہائی مفسر اور حلیم الطبع انسان تھے جو برسوں یاد رکھے جائیں گے کہ انھوں نے فقیری میں بادشاہی کی اور ثابت کر دیا کہ گھر کو خوشیوں اور برکتوں کا گہوارہ بنایا جاسکتا ہے۔



صغیرہ آپا کی یاد میں

۱۹۹۹ء میں جب راقم ادارہ اردو ڈائجسٹ کا حصہ بنا، تو ایک دن دفتر میں صغیرہ بانو شریں صاحبہ سے ملاقات ہوئی۔ چہکتی آنکھیں، مسکراتے ہونٹ اور محبت آمیز گفتگو نے دل موہ لیا۔ آپ اردو ڈائجسٹ میں ”مشورہ حاضر ہے“ تحریر کرتی تھیں۔ جلد منکشف ہوا کہ قارئین میں یہ سلسلہ بہت مقبول ہے۔ وجہ یہی ہے کہ صغیرہ آپا اس میں نہایت مفید طبی دگر چیل مشورے دیتیں جن سے مسائل میں گرفتار افراد کے علاوہ سبھی قارئین مستفید ہوتے۔ یہ سلسلہ دراصل مصیبت میں مبتلا انسانوں کی مدد کرنے کا نادر طریقہ کار تھا۔ اسی لیے اسے جاری کرنے پر دنیا بھر سے لاکھوں مرد و زن نے اردو ڈائجسٹ اور صغیرہ آپا کو داد و تحسین سے نوازا۔ صغیرہ آپا دفتر تعریف لائیں، تو بیشتر وقت استاد محترم ڈاکٹر اجاز حسن قریشی کی معیت میں گزارتیں۔ کبھی موڈ میں ہوتیں، تو راقم کو بھی اپنے انوکھے تجربات زندگی سے آگاہ کرتیں۔ دوسروں کی مدد کرنے کا جذبہ ان میں لہرتا موجود تھا۔ کسی کو لاچار و بے بس پاتیں، تو اسے تسلی و دلاسا دینے پشاور چھو اور دو روز راز اور انجمنی شہر بھی کھنچ جاتیں۔ انہوں نے کہیم اکتوبر کو یہ شفیق ہستی اپنے رب کے حضور پہنچ گئیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کے درجات بلند فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے۔ (آمین)

صغیرہ بانو شریں اردو کے صاحب طرز ادیب، ملاحادی کی نواسی تھیں۔ دہلی سے تعلق ہونے کے باعث اردو گھر کی لونی تھی اور لکھنا پڑھنا جیسے فیر میں شامل تھا۔ آپ نے بچوں کی کہانیاں لکھیں اور خواتین کے موضوعات پر بھی قلم اٹھایا۔ روحانیت سے بھی دلچسپی تھی۔ تاہم آپ کی مقبول ترین میراث ”مشورہ حاضر ہے“ ہی ہے جو کئی برس ہا قاعدگی سے اردو ڈائجسٹ میں شائع ہوتا رہا۔ اسے ”گھریلو طبی مشوروں کا انسائیکلو پیڈیا“ کہا جائے، تو بے جا نہ ہوگا۔

امید ہے، اس سلسلے میں دیے گئے کئی صد مشورے آنے والے دنوں میں بھی پریشان حال مرد و زن کی راہنمائی و مدد کرتے رہیں گے۔ گویا یہ قلمی سلسلہ ایسا انمول صدقہ جا رہے ہے جو صد صغیرہ آپا کی یاد ہمارے دلوں میں بھی تازہ رکھے گا۔ (سید عامر محمود)

صبح کی سیر کرنے والوں کا ایک حلقہ بن گیا تھا جس میں میرے بھانجے حافظ عبدالرؤف کے سر جناب برکت علی نونا بھی شامل تھے۔ انہیں بچپن ہی سے گھر کے کام کاج کرنے اور اپنے فرائض محنت سے ادا کرنے کی عادت پڑ گئی تھی اس لیے وہ آخری وقت تک جسمانی لحاظ سے تندرست اور توانا رہے۔ قدرت نے انہیں زبردست قوت برداشت عطا کی تھی۔ وہ اپنے بچپن اور بھانجوں سے اکثر کہتے کہ میں اپنے آپ کو بالکل ”فٹ“ محسوس کرتا ہوں۔ انہیں گاہے گاہے کھانسی کی شکایت ہو جاتی جو دوڑائی کے استعمال سے رفع ہو جاتی تھی۔ وہ جب ویسٹ ڈاکے مکان میں منتقل ہوئے اور صبح کے وقت قرآن کی تلاوت لان میں بیٹھ کر کرتے تو پڑوس کے کہیں ان کی تلاوت سننے دیوار کے قریب آ جاتے۔ پھر ایک سہ پہر انہوں نے بھابی سعیدہ سے کہا کہ مجھے سانس لینے میں رقت محسوس ہو رہی ہے۔ خیال گزرا کہ شاید دل کی تکلیف کے باعث ایسا ہو رہا ہو، چنانچہ انہیں فاروق ہسپتال لے جایا گیا۔ وہاں میرے نہایت عزیز دوست جناب ڈاکٹر مسعود نے ان کا تفصیلی معائنہ کیا اور ٹیسٹ کرائے۔ دو ڈھائی گھنٹے کی ایکسر سائز کے بعد انہوں نے مبارک باد دی کہ الحمد للہ انہیں دل کا کوئی عارضہ نہیں۔ طیب کامران اور مظہر انہیں گھر لے آئے، مگر بھائی جی کی سانس لینے میں لہو بہ لہو تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر انہیں ڈاکٹر ہسپتال میں داخل کرایا گیا۔ مختلف ٹیسٹوں کے بعد معلوم ہوا کہ انہیں استریوں کی ٹی بی ہے اور پوسٹریٹ میں سرطان کے اجزا پائے گئے ہیں۔ وہ پندرہ روز ہسپتال میں رہے اور کڑی آزمائشوں کے باوجود ان کی زبان پر کوئی حرف شکایت آیا نہ ان کے کراہنے کی آواز سنی گئی۔ ایک بار ڈاکٹر صاحب نے ان سے کہا کہ ہمیں آپ کا ٹیسٹ لیتے ہوئے خوف محسوس ہو رہا تھا کہ شاید آپ برداشت نہ کر سکیں تو بھائی جی نے بلند آواز میں اپنا ہاتھ اٹھا کر کہا کہ ”جو ہوا سوہا“۔ آخری دن تک ان کا دماغ صحیح طور پر کام کرتا رہا۔ پھر وہ بڑے سکون سے موت کی آغوش میں چلے گئے اور ہم سب کو سو گوار چھوڑ گئے۔ ان کے چلے جانے سے بہت بڑا خلا محسوس ہو رہا ہے اور یوں لگتا ہے کہ ہم ٹھہرے ساہی دار کی گھنٹی چھاؤں سے محروم ہو گئے ہیں، مگر انہوں نے جس وقار اور جس سچ و سچ سے زندگی گزار دی، وہ ہمیں صبر کی تلقین کرتی اور ان کے نقش قدم پر چلنے کا حوصلہ دیتی ہے۔

بھائی جی کی اصل طاقت ان کا دین کے ساتھ گہرا لگاؤ اور اسلامی تعلیمات کے مطابق اپنی زندگی بسر کرنا تھی۔ انہوں نے اپنے والدین کو باقاعدگی سے تہجد پڑھتے دیکھا تھا، اس لیے وہ بھی جوانی ہی سے تہجد پڑھنے کا اہتمام کرتے تھے۔ پانچ وقت کی نماز کی ادائیگی میں وہ تسامح سے کام نہیں لیتے تھے۔ نماز ان کی گھنٹی میں پڑی ہوئی تھی اور سبکی وجہ ہے کہ اپنی بیماری کے دنوں میں بھی وہ اشاروں سے نماز ادا کرتے رہے۔ فاروق ہسپتال سے عشا کے وقت واپس آئے، تو اپنی اہلیہ سے کہنے لگے کہ تمکان بہت ہو گئی ہے اور عشا کی نماز پڑھنا مشکل محسوس ہو رہا ہے۔ بھابی سعیدہ نے کہا کہ اب آرام کر لیجئے اور تہجد کے وقت پڑھ لیجئے گا۔ بھائی جی نے کچھ دیر آرام کیا، مگر قدرے بے چین رہے۔ اٹھے، وضو کیا، نماز ادا کی اور کہا اب سکون آیا ہے۔

ایک زمانے میں مولانا نصر اللہ خان عزیز سمن آبادی میں سکونت پذیر تھے۔ وہ باقاعدگی سے صبح کی سیر کرتے اور اس چہل قدمی میں بھائی جی بھی شامل ہو جاتے۔ مولانا عظیم شاعر اور عظیم صحافی ہونے کے علاوہ ایک بہت بڑی روحانی شخصیت بھی تھے۔ وہ سیر کے دوران قرآن کی تلاوت کرتے رہتے تھے۔ بھائی جی نے ان سے کہا کہ آپ مجھے

خصوصی انٹرویو

اچھی شہرت کے حامل سابق بیورو کریٹ
پی ٹی آئی کی کوریج کے بیدار مغز رکن
تسنیم نورانی

اپنے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں
معاشی مشکلات، داخلی سلامتی کے چیلنجز، تو انائی کے بحران
اور پبلک ٹرانسپورٹ کے بارے میں اپنا ویژن پیش کرتے ہیں

انٹرویو ہینل: الطاف حسن قریشی
طیب اعجاز قریشی، کامران الطاف قریشی

ان سے پہلی ملاقات غالباً ۱۹۹۲ء میں ہوئی تھی جب وہ پنجاب کے سیکرٹری تعلیم تھے اور کمشنری
حیثیت سے فیصل آباد کی شہری زندگی میں حیرت انگیز انقلاب پیدا کر کے آئے تھے۔ وہ ایک
دیانتدار فرض شناس اور اعلیٰ پائے کے منتظم ہونے کی شہرت رکھتے تھے۔ ان کا ذہن تخلیقی تھا جو انہیں
نئے نئے تجربات کرنے پر اکساتا رہتا۔ بعد ازاں وہ وفاقی سطح پر سیکرٹری کانسرو اور سیکرٹری داخلہ کے مناصب پر فائز
رہے اور وہاں بھی اپنی جدت طبع کے نقوش ثبت کیے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے لاہور میں ٹرانسپورٹ کے
مسائل حل کرنے کے لیے ایک منصوبہ تیار کیا لیکن وزیر اعلیٰ شہباز شریف کی "تنگ نظری" کے باعث اس پر عمل نہ ہو
سکا۔ پھر وہ "بہادر" اور "ایمانداد" عمران خاں سے متاثر ہوتے گئے اور آج کل پاکستان تحریک انصاف کی کوریج کمیٹی

میری



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرتک نہیں کیا جاتا
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر پو پو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



کونسلر تعینات ہوا۔ تب ٹریڈنگ کارپوریشن آف پاکستان نے وہاں کنو بھجانے کی کوشش کی۔ دو چار کنٹینروں کا آرڈر ملا۔ انھوں نے کنو بھیجے جو راستے ہی میں گل سڑ گئے۔ وہاں کے تاجروں نے جب کنٹینر کھولے تو انھوں نے سمندر میں پھینکوا دیے۔ انھیں کلیم بھی نہیں ملا۔ چنانچہ پاکستان اُس وقت بہت بدنام ہوا۔ پہلے سال جب میں وہاں گیا تو ہمارے لوگ کنو کے کنٹینر بھجواتے تھے۔ میں جب پھل مارکیٹ میں لے کر جاتا تو کوئی نہ خریدتا حالانکہ ہمارا کنو تائیوان اور چین کے کنو سے کہیں بہتر تھا۔ جب میں نے چھ مہینے تمام چیزوں کا جائزہ لیا تو پتا چلا وہ ایک سال پہلے بنگلہ کرتے ہیں۔ اس لیے آف سیزن میں ہمارے لوگ جاتے تو وہ مارکیٹ میں بری طرح پٹ جاتے۔

سنگاپور میں "کولڈ اسٹوریج" نامی کمپنی ہول سیل اسٹوریج کا کام کرتی تھی۔ ان کے ساتھ میں نے بات کی کہ ہم آپ کو اگلے سال تین چار ماہ پہلے کو دیں گے۔ یہ بھی کہا کہ آپ اپنے آدمی بھیجیں، ہم انھیں اپنے باغات دکھا دیں۔ انھوں نے لوگ بھیجے اور ہم نے انھیں باغات دکھائے۔ انھوں نے کہا کہ آپ کے کارٹن پچک جاتے ہیں۔ میں نے کہا "کارٹن آپ ہمیں دے دیں۔ لہذا میں نے سنگاپور سے کارٹن خرید کر ٹی سی پی کو بھیجے۔

اس وقت کارپوریشن کے چیئرمین یوسف صاحب سی ایس پی آفیسر تھے۔ کنو بھجانے کے حوالے سے ٹی سی پی کے مینجر بشیر صاحب بہت سرگرم رہے۔ میں نے پہلے سال دس کنٹینروں کا آرڈر لے کے دیا۔ پہلے سال کارپوریشن نے سرگودھا سے فرسٹ کلاس کنو منگوایا جو ہاتھوں ہاتھ بک گئے۔ ہمارے کنو کارنگ خوب صورت ہے اور ذائقہ بھی اچھا ہے۔ اگلے سال چار گنا زیادہ آرڈر دیا۔ اس سے اگلے سال (۱۹۸۷ء میں) ہمارے کنو کی بہت بڑے پیمانے پر فروخت ہوئی۔ پاکستانی سنگاپور میں کامیاب ہوا تو پھر ملائیشیا اور انڈونیشیا بھی جانا شروع ہوا۔ چینی کیونٹی یہ پھل زیادہ



میں شامل ہیں اور اپنی فہم و فراست حکومت چلانے کی قابلیت اور تجربے کی روشنی میں قیادت کو صاحب مشورے دیتے رہتے ہیں۔ وہ سیاسی طبع سے بالاتر ہیں البتہ سیاسی جماعتوں کے اندر اصول پسندی، دیانت داری اور بالغ نظری کا فروغ چاہتے ہیں۔ ان کے بعض تصورات اور احساسات سے اختلاف بھی کیا جاسکتا ہے مگر ان کی نیت پر شک و شبہ کی بہت کم گنجائش ہے۔

میں نے انھیں ٹیلی فون کیا کہ آپ ہمیں انٹرویو کے لیے کب وقت دے سکتے ہیں؟ وہ اس وقت اسلام آباد میں تھے۔ کہنے لگے کہ ہم کل یعنی ۱۶ اکتوبر کی شام ڈیفنس کلب لاہور میں مل سکتے ہیں۔ اردو ڈائجسٹ کا ایک ہینٹل انٹرویو لینے وقت پر نکل کھڑا ہوا لیکن جب ڈیفنس میں خالد مسجد کے قریب پہنچا تو وہاں لوگوں کا بڑا جھوم تھا۔ یہاں میرے عزیز دوست حفیظ اللہ خاں نیازی کے چھوٹے بھائی مرحوم نجیب اللہ خاں کی مغفرت کے لیے قرآن خوانی ہو رہی تھی۔ مرحوم عمران خاں کے چچا زاد بھائی تھے اور وہ

ان کے جنازے میں شریک نہیں ہوئے۔ ہم شام چھ بجے ڈیفنس کلب پہنچے جہاں تسنیم نورانی صاحب ایک خاموش گوشے میں ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ اردو ڈائجسٹ کے ہینٹل میں عزیز طیب اعجاز اور عزیز کامران الطاف بھی شامل تھے۔ طیب اعجاز اس ماہنامے کے ایگزیکٹو ایڈیٹر ہونے کے علاوہ ٹیکسٹائل انڈسٹری میں بھی ایک نام رکھتے ہیں۔ "روشن ہیکٹر" ان کمپنیوں میں شامل ہے جنھیں باروڈ یونیورسٹی نے پاکستان میں بڑی تیزی سے آگے بڑھنے والے کمپنی قرار دیا ہے۔ طیب اعجاز اور سیزر پاکستان انٹریورڈ فورم کے اندر سرگرم اور سارک چیمبر آف کامرس کے بھی رکن ہیں۔ انھیں بھارتی ممالک میں جانے اور خاص طور پر بھارت کے طول و عرض کو دیکھنے کے مواقع ملتے رہتے ہیں۔

دراصل ہمارے بڑے بھائی ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی نے اردو ڈائجسٹ کی انتظامی ذمہ داریاں سنبھالنے کے ساتھ ساتھ پاکستانی کنو کو دنیا میں متعارف کرانے کے لیے نت نئے تجربات کیے تھے۔ انھیں شروع شروع میں بہت نقصان اٹھانا پڑا تھا لیکن ان کی سائنسی بنیاد پر کی جانے والی کاوشوں کا آج یہ ثمرہ ہے کہ پاکستان کے تازہ پھل اور سبزیاں مشرقی ایشیا اور مغربی ممالک میں بھی برآمد ہو رہی ہیں۔ جناب تسنیم نورانی ہمارے اس عظیم کارنامے سے بڑی حد تک باخبر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کافی شاپ میں بیٹھتے ہی کنو کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ کہنے لگے:

"پاکستان سے کنو کی ایکسپورٹ کا کریڈٹ میں لے سکتا ہوں۔ میں ۱۹۸۳ء کے لگ بھگ سنگاپور میں کمرشل



اردو ڈائجسٹ 24

WWW.PAKSOCIETY.COM

اردو ڈائجسٹ 24

س: بھارت اور پاکستان کے مابین تجارت شروع کرانے میں بھی آپ کا کردار رہا؟
ج: ”کمپوزٹ ڈائلاگ ۲۰۰۳ء میں شروع ہوئے تھے مگر تب معاملہ خاص آگے نہیں بڑھا۔ جب ہم بھارت گئے تو ان کا رویہ عجیب سا تھا۔ میں اُسے منکبزانہ تو نہیں کہوں گا ان کے انداز میں کنفیوژن سی تھی۔ دراصل وہ چاہتے تھے کہ صرف انہی کو فائدہ پہنچے۔ بھارتی تاجر کہتا تھا کہ پاکستان کے پاس ایکسپورٹ کرنے کے لیے ہے کیا؟ ہم نے بتایا کہ ہمارے پاس سائیکلس، سرامیکس اور ہاتھ روم فننگ ہیں۔ پلاسٹک اور چمچے کی مصنوعات بہت اچھی ہیں۔ وہ کہتے کہ ہم یہ ساری چیزیں خود بہت بہتر بنا سکتے ہیں۔ آپ سے تو ہمیں نمک، چھوہارے یا جھسم پاؤڈر ملے گا۔“

س: آپ کی تاجروں سے بات چیت ہوئی تھی؟

ج: ”امرتر گئے تو وہاں ان کی ٹریڈ ریوسی ایشن سے ہماری بات ہوئی۔ دہلی میں بھی ان کی ٹریڈ ریوسی ایشن فعال ہے۔ بھارتی تاجروں کا ذہنی رویہ یہی رہا کہ پاکستان سے کوئی چیز خریدنے کو وہ اپنی قومی جنگ سمجھتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ وہ پاکستان کو اپنی مصنوعات فروخت کریں۔ وہ تجارت کی بات کرتے ہیں مگر ہم جب انہیں کوئی چیز ایکسپورٹ کرنا چاہیں تو کوشش کرتے ہیں کہ کوئی پاکستانی چیز نہ خریدی جائے کیونکہ بھارت برتر ملک ہے۔ وہ پھر پاکستانی اشیاء پر مختلف پابندیاں لگا دیتے ہیں۔“

مثال کے طور پر آپ اگر کپڑے لے کر گئے تو وہ کہتے ہیں کہ اس کی ڈائی کا ہمیں ٹیسٹ چاہیے کہ یہ کہاں سے آئی ہے؟ یا پھر آپ کوئی چیز امرتر برآمد کرنا چاہیں تو وہ کہیں گے کہ یہ صرف مدراس بندرگاہ ہی سے آسکتی ہے۔ ایسی انہونی پابندیاں لگاتے ہیں۔ اب سرحد پار کر کے کوئی پاکستانی دہلی جائے تو یہاں جو چیز ۱۰ روپے کی ہے وہ وہاں ۱۵۰ روپے کی بک سکتی ہے اور کوئی بھی اچھی ہے، تو وہ اس پہ نان ٹیرف بیرز کی پابندی لگا دیتے ہیں۔“

اس کمپوزٹ ڈائلاگ میں ہمارے ساتھ بی بی ہوا، ہم کہتے کہ جناب آپ ان نان ٹیرف بیرز کا کوئی حل تلاش کریں۔ وہ کہتے ٹھیک ہے۔ ہم ایک کمیٹی بنا دیتے ہیں آپ فکر مت کریں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم ان سے کہتے کہ بھائی سالہا سال سے یہی ہو رہا ہے اور تاحال اس میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ بالآخر جو چیز ان کو درکار ہوتی وہ لے لیتے۔ مثلاً سینٹ کی قلت ہوگئی تو انہوں نے کہا کہ اچھا جی دو لاکھ ٹن سینٹ بھیج دیں۔ دو لاکھ ٹن سینٹ تک وہ ساری سہولتیں دیتے۔ مگر جیسے ہی دو لاکھ ٹن کی برآمدات ختم ہوتیں تو وہ کہتے کہ فلاں نوٹیفکیشن آگیا ہے انہوں نے یہ کہہ دیا وہ کہہ دیا۔ مختصراً کوئی نہ کوئی شرط لگا دی جاتی۔ چنانچہ کمپوزٹ ڈائلاگ ان کے ساتھ ہوتا رہا بڑی شائستہ باتیں ہوتیں مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔“

س: وجہ کیا ہے؟

ج: ”یہی کہ پاکستان سے کوئی تاجر اپنی مصنوعات لے کر کسی بھارتی شہر میں جائے تو وہاں اس کے پیچھے ”را“ کے ایجنٹ لگ جاتے ہیں۔ وہ بیچارا کہتا ہے کہ میں کس مصیبت میں پھنس گیا! بھارتی حکمران طبقے نے پاکستان کے خلاف اتنا زیادہ پراپیگنڈہ کر رکھا ہے کہ آپ معقول طریقے سے بھارت میں تجارت یا کاروبار نہیں کر سکتے۔ بہر حال کچھ پاکستانی وہاں کام کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ ہاریزے (Bareeze) اور انٹروڈ (Interwood) والوں نے دکان کھول لی ہے۔ چار مہینے پہلے آخر الذکر نے بتایا تھا کہ میں امرتر اور بعد میں



کھاتی ہے کیونکہ ان کے ہاں کنوکی پوجا ہوتی ہے۔ ہم یہاں جیسے ایک دوسرے کو میدی دیتے ہیں تو وہ ایک دوسرے کو کنو دیتے ہیں۔ یہ ان کے لیے اچھی قسمت کا نشان بھی ہے۔“

اس وقت ہمارے چار ٹریڈنگ پلانٹ تھے جن میں سے تین بند پڑے تھے۔ اب میرا خیال ہے کہ ۱۲۰ تا ۱۱۰ پلانٹ ہیں۔ بعد ازاں بشیر صاحب نے ٹریڈنگ کا پوریشن چھوڑ کر یونین فرانس کے نام سے کام شروع کر دیا۔ وہ ایک تختی آدمی تھا۔ میں نے کولڈ اسٹوریج والوں سے کہا کہ آپ بشیر صاحب کے ساتھ مل کر کام کریں۔ وہ مجھے کئی سال بعد ملے۔ انہوں نے اب خربوزے بھی بنا شروع کر دیے تھے اور آم بھی۔ غرض میں نے اس وقت مارکیٹ میں تھوڑی سی دلچسپی لی تو مجھے پتا چل گیا کہ آرڈر چھ مہینے پہلے دیا جانا چاہیے اور ہیکنگ کا بڑا مسئلہ ہے جسے حل کر دیا۔ تسنیم صاحب نے پھر طیب اعجاز سے دریافت کیا کیا ہمارے ہاں اعلیٰ کوالٹی کا ہیکنگ میٹریل بننا شروع ہو گیا ہے؟

انہوں نے جواب دیا ”ہم معیاری میٹریل بنا رہے ہیں۔ ہمیں ہیکنگ میں اسی لیے آنا پڑا کہ سنگاپور سے مہنگا میٹریل درآمد کر رہے تھے۔ پھر ہم نے وہی سے منگوانا شروع کیا۔ بعد میں ہم نے خود ہیکنگ میٹریل بنانے کی کوشش کی اور کامیاب رہے۔“

تسنیم نورانی صاحب کہنے لگے، ہماری اور آپ کی کوششوں سے ایک انقلاب آ گیا ہے۔ جو باغ سات آٹھ ہزار کے بھی نہیں کہتے تھے اب لاکھوں روپے میں فروخت ہو رہے ہیں۔ اس کے علاوہ چین روس اور ایران میں ہمیں بہت بڑی مارکیٹ مل گئی۔ وسطی ایشیائی ریاستیں بھی کپا کنوہر درآمد کر رہی ہیں۔ اس کے بعد بات چیت پاک بھارت تعلقات کی سمت بڑھ گئی اور سوال جواب کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔

بھارتی باشندے احساس برتری میں مبتلا ہو چکے اور پاکستانیوں کو بہ نظر حقارت دیکھتے ہیں

ج: شاید اس لیے وہ کمپوزٹ ڈائلاگ پر بھی ہات نہیں کرتے۔ ویسے بھی مستقبل میں بھارت اور پاکستان کا جو تعلق ہے اس کے متعلق میں زیادہ ہر امید نہیں۔ ہمیں اپنی طرف دیکھنا چاہیے۔ ہمیں چاہیے کہ بھارت سے جنگ نہ کریں مگر ان سے خیر کی کوئی توقع رکھنا بحث ہے۔

س: گویا میاں صاحب نے اقتدار سنبھالتے ہی یہ پیغام دیا کہ ہم نے بھارت سے تمہارت کو فروغ دینا ہے تو وہ محض خواب ہے؟

ج: "ہمارے ہاں ایک لابی سمجھتی ہے کہ بھارت سے تمہارت کرنے میں ہمیں زیادہ فائدہ ہو سکتا ہے کیونکہ ان کی منڈی دس گنا بڑی ہے۔ مزید برآں ہماری کرنسی قدرے کمزور ہے لہذا ہمیں منافع زیادہ ہوگا۔ اگر ہمیں دو ایشیا بھی مل جائیں تو وہ اربوں روپے کی برآمدات بن جائیں گی۔ مسئلہ یہ ہے کہ آپ کا چونکہ بھلا ہو رہا ہوگا تو بھارتی پاکستانی ایشیا قبول نہیں کریں گے۔ مفاہمت اسی وقت ہوگی کہ بھارت اور پاکستان برابری کی بنیاد پر اصول و قوانین طے کر کے ایک دوسرے کو ایشیا بھجوائیں۔"

س: ہم نے اس کے باوجود بھارتیوں کے ساتھ سبزیوں اور پھلوں کی تمہارت شروع کر دی اور اپنے کسان کا خیال نہیں رکھا۔ جب کہ بھارتی حکومت اپنے کسان کو سہڈی دے رہی ہے۔ ہم وہاں سے سبزیاں اور پھل درآمد کرتے ہیں۔ جب ہمیں ضرورت پڑے تو فوراً نمائندہ درآمد کر لیتے ہیں۔ لیکن جب ہمارے کسان کو اچھی قیمت ملنے لگتی ہے تو ہم فوری طور پر کہتے ہیں کہ سیاسی مسائل آڑے آگئے اور سبزی بھارت نہیں جاسکتی۔ یہ تو سراسر زیادتی ہے۔ اس پر بھی کوئی روشنی ڈالے؟

ج: اگر پاکستان میں کوئی فصل اچھی ہوئی ہے اور بھارت میں بری، تو یقیناً ہماری والی کو وہاں جانا چاہیے۔ اگر بھارت اس معاملے میں ڈنڈی مارتا ہے، تو حکومت نوٹس لے۔ امریکہ اور یورپ سے زیادہ دوست تو کوئی نہیں مگر تمہارت کے معاملے میں ان کا "اینٹ کتے کا ہیر" ہے۔ اس معاملے میں وہ ایک دوسرے کا کوئی لحاظ نہیں کرتے۔"

س: ہم اپنی معاشی ترقی برقرار کیوں نہیں رکھ سکے؟

ج: "مشرف دور حکومت میں کنزیومر ایشیا کی خرید و فروخت پر زیادہ زور دیا گیا مثلاً گاڑیاں، موٹر سائیکلیں اور دیگر الیکٹرانکس سامان! اس سے مینوفیکچرنگ بڑھ گئی۔ یوں آپ کا ٹرن اوور اور جی ڈی پی ایک لحاظ سے بڑھتا گیا مگر معیشت مختلف طریقوں سے ترقی کرتی ہے۔ مثال کے طور پر آپ کی پیداوار بڑھنے آپ خود نئی چیزیں متعارف کرائیں یا پھر سستی ایشیا بنا کر ملکی وغیر ملکی منڈیوں میں بھجوائیں۔ لیکن انہوں نے اس دور میں بینک کے قرضوں سے مصنوعی معاشی بلبلہ پیدا کر دیا۔ جیسے ہی معیشت میں تھوڑی سی کمزوری آئی سب کچھ ٹھپ ہو گیا۔ دراصل انہوں نے معیشت کو دیر پا بنیادوں پر کھڑا نہیں کیا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ نائن الیون کے بعد بہت مانی وسائل پاکستان کی طرف آئے۔ اس وقت فنڈز کا بہاؤ ہماری سمت بہت زیادہ تھا۔ ہمیں وہ کہتے تھے کہ اتنے ہزار ارب روپے ٹیکس بڑھ گیا۔"

دہلی میں بھی دکان کھول رہا ہوں۔ بھارتی اپنی سرزمین میں پاکستانیوں کو ایک حد سے آگے نہیں جانے دیتے کیونکہ پھر وہ اسے اپنی ناک کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔"

س: اس کا تو مطلب ہے کہ ہمارے تمہارتی معاملات کبھی ٹھیک نہیں ہوں گے؟

ج: "میں سمجھتا ہوں کہ بھارت اور پاکستان کی تمہارت دو طرفہ ہونی چاہیے۔ اس میں طے ہونا چاہیے کہ اتنے کروڑ روپے کی ہم ایکسپورٹ کریں گے اور اتنے کروڑ روپے کا سامان آپ بھجوائیں گے۔ جب تک یہ مفاہمت نہیں ہوگی مسئلہ حل نہیں ہوگا۔"

س: سافٹا (SAFTA) کا کوئی مستقبل ہے؟ کیا یہ بھی آپ ہی کے دور میں طے پایا تھا؟

ج: "سافٹا میں تو سارا جنوبی ایشیا آتا ہے اور یہ سب کے لیے ایک جیسا ہے۔ اس میں بھارت بڑا بھائی ہے اور ہم چھوٹے بھائی۔ اسے چاہیے کہ چھوٹے بھائیوں کے لیے سہولت پیدا کرے، جن میں بھگدیش اور نیپال بھی شامل ہیں۔"

س: آپ نے بھارت کے بیوروکریٹس کو کیسا پایا؟

ج: وہ بھی ہمارے جیسی تعلیم و تربیت پاتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے بڑی اچھی گپ شپ لگا سکتے ہیں مگر ان کی نفسیات میں بھی ہمارے لیے نفرت ہی موجود ہے جو نریندر مودی کے آنے سے اور بڑھ گئی۔ منموہن سنگھ قدرے نرم تھے مگر انہوں نے بھی واقعہ بمبئی اور پارلیمان پہ حملے کے بعد میڈیا کے ذریعے پاکستان کے خلاف اپنی عوام میں اتنی زیادہ نفرت پھیلائی جو پہلے کبھی دیکھنے کو نہیں ملی۔ ان کا ایک ہدف یہ ہے کہ اپنے آپ کو بڑا کرنے کے لیے پاکستان کو نچا دکھانا ضروری ہے۔ اس وجہ سے جو تھوڑے بہت لوگ کشادہ ذہن کے تھے یا جو "امن کی آشا" کا راگ الاپتے وہ تو آپ کے حق میں بات کرتے ہیں۔ مثلاً کلدھ پ نیوز یا خشونت سنگھ جو پاکستان کے لیے تھوڑا سا نرم گوشہ رکھتے تھے۔ لیکن اب وہ بھی ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ میں پانچ چھ دفعہ بھارت جا چکا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد دوبارہ گیا۔ اب جانے کو میرا دل نہیں کرتا کیونکہ بھارتیوں کو ایک پاکستانی سے مل کر جو خوشی پہلے ہوا کرتی تھی اب وہ نہیں رہی۔ ایسے لگتا ہے جیسے ان پہ کوئی مصیبت آن پڑی ہو!

س: میں دس بارہ برس سے بھارت جا رہا ہوں۔ پہلے بھارتی کاروباری یہ سمجھتا تھا کہ پاکستان کی معیشت بڑی عمدہ جا رہی ہے۔ لیکن ۲۰۰۰ء کے بعد ان کے کاروباری و صنعتی ادارے عالمگیر حیثیت اختیار کر چکے۔ کئی بھارتی دنیا کے امیر ترین لوگ بن گئے ہیں۔ چنانچہ اب وہ ہمیں غیر اہم سمجھنے لگے ہیں اور ہماری طرف دانستہ توجہ نہیں دیتے۔ میرا خیال ہے کہ مجبوری کم ہونے کی یہ بھی وجہ ہے۔ چند سال قبل میں نے امرتسر سے کانڈورا آمد کرنا شروع کیا۔ اس کاروبار میں میں اور میرے دوست شفیق عباسی شریک تھے۔ کھانا ہسپتال سے ہم نے مال منگوایا۔ شروع میں کانڈورا تو لگا کہ نیوز پرنٹ کی بہت بڑی منڈی پاکستان میں کھل جائے گی۔ لیکن جلد ہی احساس ہوا، بھارتی کانڈور کی قیمتیں یورپی ممالک سے بھی زیادہ ہیں۔ ان کی لاگت اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ پاکستان کو سستے داموں بیچنا ان کے لیے مشکل ہو گیا۔ پہلے تو وہ بڑے گرم جوش تھے کہ جی پاکستان کی اتنی بڑی مارکیٹ مل جائے گی۔ لیکن وہ تو یورپ کی قیمتوں سے بھی مہنگا کانڈورا فروخت کر رہے تھے لہذا پاکستانی کیوں خریدے گا؟ اسی لیے سارا جذبہ ماند پڑ گیا۔"

ہیں کہ سیاست دان ہوں یا بیوروکریٹس کسی کے پاس ہمارے قومی مسائل کا حل نہیں کیونکہ وہ ان کا فہم ہی نہیں رکھتے اور سبھی "شارٹ کٹس" پر چل رہے ہیں؟

ج: "ہاں یہ ہے کہ بیوروکریٹس ایک گاڑی میں انجن کی طرح ہے اور سیاستدان جس کے ڈرائیور ہوتے ہیں۔ اسٹیئرنگ ویل پہ بیٹھا سیاستدان ہی فیصلہ کرتا ہے کہ گاڑی کو کہاں لے جانا ہے۔ بیوروکریٹس تو صرف گاڑی چلاتے ہیں۔ مشرف کے دور میں شوکت عزیز وزیر اعظم بنے جو فنانس کے آدمی تھے۔ ان کی بات چلتی تھی۔ اس زمانے کے کسی فنانس سیکرٹری کا نام یاد ہے آپ کو جو پالیسی بنانا تھا؟ کاروباری حلقے اسی لیے شوکت عزیز کو منانے کی کوشش کرتے تھے۔ آج کراچی کے کاروباری حضرات ڈار صاحب کے پاس جاتے، ڈاکٹر وقار مسعود کے پاس کوئی نہیں جاتا۔ ڈار صاحب فیصلہ کرتے ہیں کہ ہم نے فلاں چیز منگنی کرنی ہے اور امریکہ سے قرض لینا ہے۔ جس زمانے کی آپ بات کر رہے ہیں وہ، غلام الحق خان کے دور تک رہا اس وقت بیوروکریٹ طاقتور تھے۔

میں سمجھتا ہوں کہ بیوروکریٹس تب ختم ہوئی جب بھٹو نے ۱۹۷۳ء میں اس کو حاصل آئینی تحفظ ختم کر دیا۔ ایوب خان کے دور سے پہلے غلام محمد سرکاری افسر تھے اور اسکندر مرزا بھی اسی دور تھا جب سول سرونٹ چمکتے تھے اور سیاستدان بھارے تحفظ ڈھونڈتے تھے۔ اب ہوا یہ کہ ۱۹۹۰ء سے ۲۰۰۵ء کے عرصے میں سیاستدان اتنے زیادہ حاوی ہو گئے کہ پچھلے دنوں میں نے روزنامہ ڈان میں "A little respect" کے عنوان سے مضمون لکھا اور بتایا، اب ہمارے بھارے سول سرونٹ کو تو اتنی عزت بھی نہیں مل رہی کہ وہ کوئی بات کہہ سکیں۔ بیوروکریٹس میں افسر جہاد کرنے تو نہیں آتے لہذا اپنی نوکری منوانے کی کون جرات کرے گا؟ ان حالات میں سول سرونٹ کو الزام دینا درست نہیں۔

س: بھارت میں سیکرٹری خوراک مسٹر بی سی گیتا رہے۔ انھوں نے ایک بار مجھے حیرت انگیز واقعہ سنایا۔ نوڈ سہسڈی کو تحفظ دینے کا معاملہ تھا۔ منموہن سنگھ نے سونیا گاندھی کی ہدایت پر قانون سازی کے لیے ایک ڈرافٹ تیار کرایا۔ اس کے مطابق حکومت بھارت ہر حال میں خوراک کی مد میں کھریوں روپے سہسڈی دینے کی پابند تھی۔ کہنے لگے میں نے اسے پڑھا تو منموہن سنگھ کے پاس گیا اور کہا کہ آپ مجھے یہ بتائیے، ملک میں قحط پڑ جانے کی صورت میں ہم باہر سے خوراک درآمد کر کے کیسے اپنے لوگوں کو سہسڈی پہ دیں گے؟ وہ مسکرائے اور کہنے لگے لگتا ہے کہ تم مجھے نوکری سے نکلاؤ گے۔ لیکن تم جو کرنا چاہتے ہو وہ کر لو۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب بھارتی سرکاری افسروں میں اتنی جرات پائی جاتی ہے تو ہمارے ہاں اس کا فقدان کیوں ہے؟

ج: بھارت میں بیوروکریٹ آج بھی قدرے بہتر ہے۔ ہمارے ہاں سی ایس پی (سنٹرل سپریئر سروسز آف پاکستان) بہترین سروس تھی۔ اس میں ڈپٹی کمشنر ایک طاقتور عہدہ تھا۔ جب سرکاری افسر پانچ سات سال ڈی سی رہ لیتا تو اس میں خود اعتمادی پیدا ہو جاتی۔ تربیت کے بعد وہ مختلف اداروں و محکموں میں جاتا اور یہ سلسلہ انگریز کے زمانے سے چل رہا تھا۔ لیکن جنرل مشرف نے آتے ہی سی ایس پی افسروں کے خلاف مہم چلا دی۔ میں یہ بات دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ انھوں نے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کے تحت نظام تباہ کیا۔ ڈپٹی کمشنر کا نظام ختم کر کے وہ ڈی سی او کا نظام لے لے آئے۔ اپنی طرف سے کہا کہ ہم حکومت چلی سٹیج پہ لے جا رہے ہیں حالانکہ ہر مارشل لائیڈ منسٹریٹر پہلے بھی صرف لوکل

مگر جی ڈی پی کے تناسب سے ٹیکس کم ہوا۔ یعنی معیشت بڑھ رہی ہے۔ اس کے بڑھنے سے کسٹم ڈیوٹی زیادہ آگئی، یوں آپ کا ٹیکس زیادہ ہو گیا اور آپ یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ جناب ہم نے تو اتنا زیادہ ٹیکس وصول کر لیا۔

مارشل لائیو گورنمنٹ بظاہر مستحکم ہوتی ہے۔ اسی لیے کاروباری حضرات اور صنعت کار دل کھول کر سرکاری و نجی منصوبوں پر سرمایہ لگاتے ہیں۔ ان کو یقین ہوتا ہے کہ چار پانچ سال میں سرمائے کی بازیافت ہو جائے گی۔ وہ موقع ہوتا زیادہ ٹیکس جمع کرنے کا! میں سمجھتا ہوں کہ سب سے بڑی بددیانتی یہ ہوئی کہ انھوں نے قوم کو بتایا، ہم بہت اچھے فیجر ہیں، حالانکہ جی ڈی پی کی شرح نمو گیارہ فی صد سے گر کر آٹھ فیصد پر آگئی تھی۔

آج بھی دیکھیے، حکومت طویل المعیاد منصوبہ بنانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ بس سرمایہ کاروں سے پیسے لے کر زرمبادلہ کے ذخائر بڑھا رہے ہیں۔ حکومت خود پہ کسی قسم کا دباؤ محسوس نہیں کرتی۔ بد قسمتی سے ہمارے سیاست دان جو پالیسیاں اختیار کرتے ہیں وہ ایسی ہیں کہ سال دو سال اچھے گزر جائیں، آئندہ فائدہ ہو یا نہ ہو، اس سے انھیں کوئی سروکار نہیں۔ تعلیم کے نظام میں بھی ان کی یہی پالیسی ہے اور نظام صحت میں بھی۔

ان کا نظریہ ہے کہ چونکہ مل اور میٹرو نظر آتی ہیں لہذا آپ بھوکے کے منہ سے نوالا چھین کر بھی اس کی تیاری

میں لگا دیں۔ سڑک مر جائے، اس سے چاہے آمدنی کا میٹرہ چلانے کے ہوں یا نہ ہوں۔ فیجر آئے تو وہ بچت کوئی کام انجام دیتا معلوم ہو کہ اس کا رہا ہے۔ ہمارے



ایک وہ جو آج اچھے کپڑے پہنتے اور پندرہ سے دو ہزار سی گاڑی پر سفر کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے حالات بہت اچھے ہو گئے ہیں۔ دوسری طرف ایک شخص قرض لیتا یا پلاٹ بیچتا ہے روپے پیسے کی بچت کرتا ہے، وال روٹی کھاتا، سائیکل یا موٹر سائیکل پہ جاتا اور اپنے بچوں کو تعلیم دلواتا ہے۔ اُسے بس اچھے مستقبل کی امید ہوتی ہے۔ آج ہر سیاستدان اپنی شان بان دکھانے کے لیے سب کچھ کرتا ہے لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں کہ قوم کو بتا سکے، آنے والے پانچ سال سخت ہیں اس کے بعد ترقی ہوگی۔ لیڈرشپ کا مطلب یہی ہے کہ ایک شخص قیادت کرتے ہوئے ملک و قوم کو ترقی و خوشحالی کی طرف لے جائے۔

س: سیاست دان آج تنقید کے سلسلے میں سب سے آسان ٹھکانے بنے ہوئے ہیں۔ آپ جیسے ذہین اور تجربہ کار لوگ مارشل لائیو کے دور میں حکومتوں میں رہے، لیکن اس دور میں بھی کوئی بڑا ڈیم نہیں بنا، تعلیم پر بھی کام نہیں ہوا۔ کیا ہم کہہ سکتے

آرڈوڈائجسٹ 28

مشرف دور میں غیر ملکی امداد اور بینک سے لیے گئے قرضوں کے ذریعے معاشی ترقی ہوئی جو حقیقتاً سراب تھا

اور ذہنی طمانیت کا درجہ رکھتی تھی۔

س: نورانی صاحب! آپ نے فرمایا کہ ۱۹۷۲ء تک بیورو کریسی بہت مضبوط تھی۔ سوال یہ ہے کہ اس نے تب تک ملک کے لیے کیا خدمات انجام دیں؟

ج: ”آپ ۱۹۷۷ء سے ۱۹۷۲ء تک نظر دوڑائیں تو بیورو کریسی پہ الزام دھرے جاسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اس نے ۱۹۵۸ء کے مارشل لا میں جنرل ایوب خان کا ساتھ دیا۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۶۰ء تک سیاستدانوں کی اعانت اور انتظامی مشنری ٹھیک کرنے کے بجائے سرکاری افسروں نے خود ہی حکومتیں سنبھال لیں اور بڑے کھلاڑی بن گئے۔ آج وہ اپنی کوتاہیوں کی وجہ سے بھی ناتوانی کا شکار ہیں۔

س: لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ موجودہ حکومت بھی چند بیورو کریٹس چلا رہے ہیں؟

ج: ”حقیقت یہ ہے کہ بیورو کریٹس تجربہ کار اور باصلاحیت ہیں لیکن ان کو ذمے داری نہیں دی جا رہی۔ آپ جن کی بات کر رہے ہیں وہ تو ملٹی لول بیورو کریٹ ہیں جو پالیسی بھی صحیح طور پر نہیں بنا رہے۔“

س: راز داں کہہ رہے ہیں کہ پالیسی وہی بناتے ہیں اور وہی فیصلے کرتے ہیں؟

ج: ”معاشی پالیسی ڈار صاحب اور سیکورٹی پالیسی نثار صاحب بناتے ہیں۔ انرجی پالیسی کا کسی کو علم نہیں کہ کس قسم کی بنائی ہے۔ اس وقت خاقان عباسی، خواجہ آصف اور دوسرے کچھ لوگ کسی قدر سرگرم دکھائی دیتے ہیں مگر ان کے درمیان رابطے اور ہم آہنگی کا فقدان ہے۔ حاکم وقت کے پاس چونکہ اتنا وقت نہیں کہ تمام سیکرٹریوں سے بات کر سکے، لہذا انہوں نے ایک یا دو افسر رکھے ہوئے ہیں جن کے ذریعے نام و پیام ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ان افسروں کو بڑی طاقت مل گئی۔ اسی طرح حکومت نے ہر صوبے میں ایک دو بیورو کریٹ رکھ لیے۔ آپ کی گورنمنٹ کا انداز ہی ایسا ہے کہ آپ محنت نہیں کرنا چاہتے ہر سیکرٹری کے ساتھ بیٹھ کر بات نہیں کرتے اور ذریعوں کو وقت نہیں دیتے۔ آپ نے بس سادہ سامیہ کا نمزم رکھا ہوا ہے کہ ہمیں ہر مسئلے کا نمونہ دیا اور بتایا جائے کہ کدھر دستخط کرنا ہیں۔ جو چیز ان کی اپنے ذاتی مفاد میں ہو وہ تو سمجھ میں آ جاتی ہے۔

س: آپ سیکرٹری داخلہ بھی رہے ہیں۔ ہمارے داخلی سیکرٹری کے معاملات جس طرح خراب ہوتے جا رہے ہیں آپ کی نگاہ میں انہیں کیسے درست بنایا جاسکتا ہے؟

ج: اس میں دو باتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اندرونی سیکرٹری جو لوگ خراب کر رہے ہیں وہ کہاں سے آتے ہیں، کس طرح پیدا ہو رہے ہیں اور ان کو آپ کس طرح روکیں گے۔ جہادی تنظیمیں، دہشت گردی اور مافیا گینگ بڑھ رہے ہیں۔ گویا ہمارے سیکرٹری، کرائم اور جہاد کے تین بنیادی ایٹوز ہیں۔ ہمیں اس امر پر بھی غور کرنا ہوگا کہ معاملات کنٹرول کرنے والوں کی صلاحیتیں کیا ہیں اور آپ کے پاس ان سب کو قابو کرنے کی طاقت ہے یا نہیں۔ آپ کی قانون نافذ کرنے والی ایجنسیاں کس حال میں ہیں۔ میرا ایک سادہ سا نسخہ ہے کہ جب سے آپ نے

گورنمنٹ کے ذریعے کام کرنا تھا اور مشرف نے بھی یہی کہا۔ انہوں نے سب کچھ لوکل گورنمنٹ کے کھاتے میں ڈال دیا پیسے بھی زیادہ دیے مگر یوں بیورو کریسی کا ترقیاتی میدان اور اس کی خود اعتمادی ختم کر دی۔ اس وقت ڈی سی او کے پاس ڈی سی سے فنانشل پاور سو گنا زیادہ ہیں۔ ڈی سی کے پاس مقابلے میں کچھ ہوتا ہی نہیں تھا۔ لیکن آج ہم تڑپ رہے ہیں کہ اسلام آباد میں پولیس والے کو مار پڑ رہی ہے۔ آج ہم ٹی وی پر دیکھتے ہیں کہ ملتان میں ایک عورت نے پورے پونگ اسٹیشن کو برغمال بنا لیا۔ سب پولیس والے اس کے سامنے بے بس تھے۔ یہ تو ہمارے حالات ہو چکے۔ بھارت میں بھی حالات تبدیل ہوئے میڈیا کو آزادی ملی لیکن بیورو کریسی کا بنیادی ڈھانچہ وہی ہے۔ جب کہ پاکستان میں اس کی شکست و ریخت کے باعث لائینڈ آرڈر پر حکومت کا کنٹرول نہیں رہا۔ اسلام آباد میں چالیس جزار پولیس والے احتجاجیوں کو کنٹرول کرنے پر لگے رہے پھر بھی ان پہ قابو نہ پاسکے۔

آپ بیورو کریسی کو مزید ماریں، اسے ذمے دار ٹھہرائیں، تو حالات مزید خراب ہوں گے۔ سرکاری افسر جہاد کرنے کے بجائے نوکری کرنے آتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ہاشمیرو غیرت والے ایماندار لوگ بھی سول سروس میں ہیں اور ۹۰ فیصد ملک و قوم کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ الگ بات کہ ”نور“ دکھانے کی خواہش بھی ان میں ہوتی ہے۔ لیکن ہوا یہ کہ وہ نور آپ نے ختم کر دی جس کے باعث کام کرنے کا جذبہ سرد پڑ گیا۔ اب اس قسم کا شخص جب سیکرٹری بنے تو اس کی شخصیت ہی بدلی ہوتی ہے۔ اس میں اعتماد ہوتا ہے اور نہ اس کی شخصیت کے اندر کوئی رعب و اب۔ وہ سیاستدان کو پکارتا ہے کہ میری فلاں جگہ پوسٹنگ کرادو۔ نتیجہ یہ کہ جو کچھ اس سے سیاستدان کرانا چاہے افسروں ہی کرتا ہے۔

س: نورانی صاحب سول سروس میں اصلاحات کی رپورٹیں آتی رہی ہیں کیا ان کا کچھ فائدہ ہوا؟

ج: ”مجھے یہ علم ہے کہ ۱۹۴۷ء سے اب تک پچاس پچھن رپورٹیں آئی ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ نذر امام صاحب نے رپورٹ تیار کرنے میں بہت وقت لیا تھا۔ اس کے بعد ابھی حال ہی میں ڈاکٹر عشرت حسین نے چار پانچ سال محنت کر کے ”گڈ گورننس“ کے موضوع پر رپورٹ مرتب کی۔ اس میں بیورو کریسی کی اصلاحات کو بھی برتا گیا۔“

س: آپ نے آئینی تحفظ کی بات کی ہے اس کی ضرورت کیا تھی؟

ج: سرکاری افسر کو حاصل آئینی تحفظ یہ تھا: ”وہ حکومت کا نہیں مملکت کا ملازم ہے۔“ دراصل حکومت تو منتخب ہو کر آتی ہے جبکہ سرکاری افسر صدر کے ماتحت ہوتا ہے۔ اب تو صدر کے عہدے کی بھی تذلیل ہونے لگی ہے۔ ۱۹۷۲ء سے پہلے کی بیورو کریسی میں بھی کچھ برائیاں تھیں اور منفی پہلو پائے جاتے۔ مگر سرکاری افسر حکمرانوں کی ہاں میں ہاں نہیں ملا تھے۔ ناراضی کی صورت میں حکومت ان کو وائس ڈی ہائی یا میا نوالی تہا دلہ کر دیتی تھی۔ اس زمانے میں کسی کو سزا دینا ہوتی تو اسے میا نوالی یا ڈی جی خان بھیج دیا جاتا۔ جو ایماندار لوگ تھے وہ اس زمانے میں بھی غلط کام نہیں کرتے تھے۔ وہ میا نوالی یا ڈی جی خان پلے جاتے مگر جی حضور ہی نہ کرتے۔ ان دنوں تنخواہ میں گزارہ بھی بہتر ہوتا تھا۔ پچاس اور ساٹھ کی دہائی میں سول سروس کی تنخواہ صرف تین ہزار روپے ہوتی تھی، جب کہ اس کے مقابلے میں آج سے چار پانچ لاکھ روپے ملتے ہیں۔ ابھی انہوں نے حالیہ دنوں میں مزید تنخواہ بڑھائی ہے۔ مگر اسے دستور میں جو ضمانت دی گئی کہ وہ ملازمت سے نکالا نہیں جائے گا وہ اس کے لیے بڑی نفسیاتی طاقت

معائنہ ہوتا۔ کسی نے اگر اپنی طاقت کا غلط یا ناجائز استعمال کیا، تو اس کے خلاف کارروائی ہوتی تھی۔ اس طرح مجسٹریٹ کا ادارہ کنٹرول میں رہتا۔ آج جرائم کے خاتمے کے لیے جو اہلیت درکار ہے، اس کا نوے فیصد تک فقدان ہے۔“

س: آپ یہ بتائیے کہ دہشت گردوں کا قلع قمع کیسے ممکن ہے؟

ج: ”اب ہم جہادیوں کی بات بھی کرتے ہیں وہاں بھی معاملہ ہدایت نامی کے باعث خراب ہو رہا ہے۔ آپ سندھ میں ایک اچھا آئی جی لگاتے ہیں اور وہ کام شروع کرتا ہے۔ ایک مرحلہ آتا ہے کہ آپ نے آٹھ ارب روپے کا اسلحہ یا گاڑیاں خریدنی ہیں۔ یہ کام آئی جی یا زیادہ سے زیادہ ہوم سیکرٹری کا ہے۔ آپ اسے کہتے ہیں کہ فلاں شخص کو آرڈر دو۔ وہ کہتا ہے، میں تو نہیں دے سکتا۔ آپ اس کی تذلیل کر کے اسے چار مہینے بعد بدل دیتے ہیں، لہذا جب حاکم جرائم کا خاتمہ ہی نہ چاہتا ہو، تو پھر آپ کراچی یا کسی اور شہر میں امن کیسے لائیں گے؟ سوچنا چاہیے کہ ہماری پولیس فورس سے فوج کیوں بہتر ہے؟ کیا آپ میجر جنرل کو کہہ سکتے ہیں کہ فلاں سپاہی کو چھٹی دے دو، اس کی بیوی بڑی بیمار ہے، یا فلاں کو اس جگہ سے وہاں تعینات کر دو، یہ بڑا بیمار ہے؟ وہ تو الگ ہے، لیفٹیننٹ جنرل بھی ایسا نہیں کہہ سکتا۔ وجہ یہی کہ بریگیڈ ٹر اپنے میجر جنرل کی بات نہیں سنتا۔ سفارش کے معاملے میں وہ کہتا ہے کہ یہ میری ذمہ داری ہے اور یہ میری کمانڈ ہے، آپ اس کے اندر مداخلت نہ کریں۔ یہ جو آئی جی ہے، اس کی کمان میں ایک لاکھ کے لگ بھگ نظری ہوتی ہے۔ آپ اسے بلا تے اور ٹی وی کے سامنے اسے کہتے ہیں کہ اگر دو دن میں لڑکی کی آبروریزی کرنے والا ظلم برآمد نہ ہوا تو تم اپنے آپ کو فارغ سمجھو۔ اب ایک ڈیڑھ لاکھ فورس کا کمانڈر ہے، اس سے آپ ذاتی ملازم کی طرح پیش آئیں، تو وہ کیسے درست کام کرے گا؟

”اگر ہم جرائم کی بات کرتے ہیں تو کراچی کا ایک مثال ہے۔ وہاں آدمی سے زیادہ پولیس فورس ایک جماعت یادگیر جماعتوں کی بھرتی کرائی ہوئی ہے۔ اس لیے وہ فورس غیر جانبدار نہیں۔ وہ آئی جی کی طرف دیکھنے کے بجائے اپنے علاقے کے جماعتی کمانڈر یا درست ایم پی اے کی طرف دیکھتی ہے، لہذا جب تک یہ خرابیاں دور نہیں ہوتیں، نظام بہتر نہیں ہوتا، تب تک امن عامہ بگاڑ سے دوچار ہی رہے گا۔“

س: جرائم کنٹرول کرنے کے بارے میں آپ نے تفصیل سے اظہار خیال کیا، مگر ہمیں انتہا پسندی اور دہشت گردی کے ناسور کا بھی سامنا ہے۔ اس بارے میں آپ کی تجاویز کیا ہیں؟

ج: ”جہادی جنگجو لوگ ہیں۔ وہ جہاں بس رہے ہوں وہاں کا تھانیدار کہتا ہے کہ مجھے معلوم ہے، یہ لوگ کیا کر رہے ہیں مگر میرے علاقے میں تو کچھ نہیں کرتے۔ اس لیے اسلام آباد والے ان سے نمٹیں۔ ہمارے زمانے میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو ہر جتنے رپورٹ آتی تھی کہ فلاں مسجد کے خطیب نے واعظ میں کیا کہا ہے۔ اگر وہ کوئی الٹی سیدھی بات کرتا، تو اسے بلا لیا جاتا تھا۔“

س: ایسا کب تک ہوتا رہا؟

ج: ”میں ۷۷-۷۸ء تک خود فیلڈ میں تھا۔ تب تک تو یہ نظام قائم تھا۔ ہمارا ایک آئٹل برانچ کا آدمی رپورٹ تیار

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا عہدہ ختم کیا، تب سے آپ کی صلاحیت ٹھکی سطح پر ختم ہوگئی۔ اب سو آدمی کہیں سے نکل آتے ہیں، تو آپ گھبرا جاتے ہیں، کیونکہ آپ کے پاس اس وقت جو اسلحہ یا طاقت ہے، اس کا کوئی رابطہ کار (کوآرڈینیٹر) ہی نہیں۔ میرے خیال میں ڈی سی او کا کام لائینڈ آرڈر کو سنہان نہیں، وہ ضلع کا سب سے بڑا افسر ہے۔ پولیس کا کام ہے لائینڈ آرڈر کو کنٹرول کرنا، اب آپ بتائیے پولیس کو لاشی چلانے کی تربیت ملی ہے یا وہاں سے بھاگ جانے کی! درمیان میں بات چیت اور معاملات طے کرنا پولیس کی تربیت میں شامل نہیں۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا یہ کردار ہوتا تھا کہ وہ علاقے کو کنٹرول کرنے کے لیے چھوٹے موٹے جرائم پر مجرموں کو فوراً سزا دیتا اور انھیں نقص امن توڑنے پر قید کر سکتا تھا۔ چنانچہ شہری قانون پہ عمل درآمد کرتے۔ اب انتظامیہ کے پاس طاقت ہی نہیں رہی۔“

اب ہوتا ہے کہ اگر میں آپ کے خلاف کوئی کیس بناؤں، تو وہ جو ڈسٹریکٹ مجسٹریٹ کے پاس جاتا ہے۔ وہ آپ کو ایک دن میں فارغ کر دیتا ہے، نیچے ہوں۔ یوں معاملہ ختم ہو ہے کہ حالات ٹھیک کرو، حالانکہ صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔ مزید پیچیدگیاں پیدا کر دی گئی ہیں۔ وہاں آپ جیسے جیسے افسر لگا پھیلتا جا رہا ہے۔ تیسری چیز جس پر ہم نے توجہ نہیں دی۔ فورس چاہیے تو صرف ایک لیے جاتے ہیں۔ اگر انھیں تو ہم ان کو جیسے یا تین مہینے بعد داری سوچ دی۔ پھر بہتری نہیں آ رہی۔ دراصل لائینڈ آرڈر تب کنٹرول ہوتا ہے جب مجرم کو علم ہو کہ مجھے سزا ہو سکتی ہے۔ اگر کسی کو پورا یقین ہو کہ اسے سزا نہیں ہو سکتی تو وہ بے خوفی سے جرم کرتا چلا جائے گا۔ آپ نے اسلام آباد میں پولیس کو مار پڑتے دیکھی۔ دھرنے کا سارا علاقہ احتجاجی خود کنٹرول کر رہے تھے اور پولیس ان سے ڈر کر بھاگ رہی تھی۔ عام جرائم عوام کی زندگیوں کو متاثر کرتے ہیں۔ دوسری طرف دہشت گرد خوف و ہراس پھیلاتے ہیں۔ میرا یہ نظر یہ ہے کہ آپ جب تک ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو واپس نہیں لاتے، گے تب تک معاملات بہتر نہیں ہو سکتے۔ مجسٹریٹ نظام ٹھکی سطح پر جرائم قابو کرنے کا موثر ہتھیار تھا۔ یہ یاد رہے کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا ہائیکورٹ معائنہ کرتا تھا، مجسٹریٹ کو طاقت بھی ہائیکورٹ دیتا تھا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مادر پدر آزاد نہیں ہوتا تھا، اس کی عدالتوں کا



جنرل پرویز مشرف جنسوں نے کئی متنازع اقدامات کر ڈالے

ایک دن میں فارغ کر دیتا ہے نیچے ہوں۔ یوں معاملہ ختم ہو ہے کہ حالات ٹھیک کرو، حالانکہ صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔ مزید پیچیدگیاں پیدا کر دی گئی ہیں۔ وہاں آپ جیسے جیسے افسر لگا پھیلتا جا رہا ہے۔ تیسری چیز جس پر ہم نے توجہ نہیں دی۔ فورس چاہیے تو صرف ایک لیے جاتے ہیں۔ اگر انھیں تو ہم ان کو جیسے یا تین مہینے بعد داری سوچ دی۔ پھر بہتری نہیں آ رہی۔ دراصل لائینڈ آرڈر تب کنٹرول ہوتا ہے جب مجرم کو علم ہو کہ مجھے سزا ہو سکتی ہے۔ اگر کسی کو پورا یقین ہو کہ اسے سزا نہیں ہو سکتی تو وہ بے خوفی سے جرم کرتا چلا جائے گا۔ آپ نے اسلام آباد میں پولیس کو مار پڑتے دیکھی۔ دھرنے کا سارا علاقہ احتجاجی خود کنٹرول کر رہے تھے اور پولیس ان سے ڈر کر بھاگ رہی تھی۔ عام جرائم عوام کی زندگیوں کو متاثر کرتے ہیں۔ دوسری طرف دہشت گرد خوف و ہراس پھیلاتے ہیں۔ میرا یہ نظر یہ ہے کہ آپ جب تک ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو واپس نہیں لاتے، گے تب تک معاملات بہتر نہیں ہو سکتے۔ مجسٹریٹ نظام ٹھکی سطح پر جرائم قابو کرنے کا موثر ہتھیار تھا۔ یہ یاد رہے کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا ہائیکورٹ معائنہ کرتا تھا، مجسٹریٹ کو طاقت بھی ہائیکورٹ دیتا تھا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مادر پدر آزاد نہیں ہوتا تھا، اس کی عدالتوں کا

جب سرکاری افسر تقرری و تہاد لے میں سیاست دانوں کا محتاج ہو جائے تو وہ ان کے سامنے کیسے کھڑا ہوگا
 دیں۔ کسی کو پتا ہی نہیں تھا گولی چلانے کا آرڈر کس نے دیا۔

”اب آپ دیکھیں کہ حکومت کو پولیس فورس پہ اعتماد نہیں چناں چہ ان سے ہسٹول واپس لے لیے گئے۔ ایک پولیس
 والے کی یونیفارم میں ہسٹول اس کا حصہ ہے۔ اب حکومت کو یہ خطرہ ہے کہ وہ کہیں چلا نہ دے۔ پہلے بھی پولیس کے پاس
 ہسٹول ہوتے تھے مگر یہ کبھی نہیں ہوا کہ وہ بغیر آرڈر کے گولی چلا دے کیونکہ اگر اس نے چلائی تو اس پہ قتل کا کیس ہو جائے گا۔“
 س: اس سے پہلے اسلام آباد میں سکندر کا ڈراما کافی دیر لگا رہا تھا؟

ج: ”ہاں یہ ہے کہ میڈیا کی موجودگی میں حالات کچھ بدلے ہیں اور اب وہ ہر معاملہ خوب اچھا لہا ہے۔ دوسری
 طرف ہماری پولیس ایسے معاملات سے نمٹنے کی تربیت نہیں رکھتی۔ دراصل احتیاجیوں سے نمٹنے والی پولیس بڑی اچھل
 قسم کی فورس ہوتی ہے جو ہزاروں مظاہرین کو حد میں رکھتی ہے۔ جیسا حال ہی میں ہانگ کانگ میں ہوا۔ کوریا میں ہوتا
 رہتا ہے۔ اس پولیس فورس کا یہی کام ہے کہ احتیاجیوں کو کنٹرول کرے اور وہ کسی سے نہیں ڈرتے۔ ہماری فورس کو یہ
 جانوروں کی طرح ٹوکوں میں بھر کے لے آتے اور کہتے ہیں کہ جی ہم نے دس ہزار فورس اکٹھی کر لی۔“

س: آپ کا مطلب یہ ہے ہماری قابلیت محدود اور ہمارا سسٹم بھی ٹھیک نہیں؟
 ج: ”میں نے ۲۰۰۳ء میں ایک اسکیم بنائی جو سابق وزیر اعظم جمالی صاحب کو پیش کی تھی۔ اس وقت اسلام آباد
 میں سات ہزار پولیس والے موجود تھے۔ ان میں سے صرف ۳۰۰ پولیس والے تھانوں میں تھے باقی پانچ ہزار سات
 سو باہر مختلف ڈیوٹیاں انجام دیتے۔ میں نے ان سے کہا کہ ڈراما مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو آپ ریجنرز بلا لیتے ہیں۔ ڈراما
 سا خوف محسوس، فریٹمز کا تسلیلری بلا تے ہیں۔ تھانے کا کام تفتیش کرنا ہے۔ اس کے لیے آپ پولیس کو رہنے دیں اور
 سکھو رٹی کے دیگر مسائل پر قابو پانے کی خاطر ڈھائی ہزار کی الگ سے فورس بنائیں۔ اس فورس میں جوان اس طرح
 بھرتی کریں جس طرح ریجنرز کرتے ہیں۔ میں نے انہیں ایک قانون بھی بنا کر دیا کہ اس کے تحت نئی فورس کام
 کرے۔ یہ جو ڈھائی ہزار کی فورس ہوگی اس کو آپ کمانڈو تربیت دیں، انہیں سترہ، اٹھارہ سال کی عمر میں ریکروٹ
 کریں جس طرح فوج میں ہوتا ہے اور ۳۶، ۳۵ سال کی عمر میں فارغ کر دیں۔ ان کے افسرانہی کے ساتھ رہیں۔
 اس میں سے ۵۰۰ جوانوں پر مشتمل فسادات روکنے والی (anti riots) فورس بنائیں اور باقی کے ۲ ہزار وی آئی چیز
 اور عمارتوں کی حفاظت کریں۔

پچھلے دنوں اسلام آباد کی عدالتوں میں طالبان گھس آئے تھے جنہوں نے جج کو مار دیا۔ وہاں پولیس والے
 کھڑے تھے، مگر انہوں نے گولی نہیں چلائی اور کہا کہ ہم سے چل گئی تو ایک سال تک کیس ہمارے خلاف چلتا رہے
 گا۔ اگر آپ کی کوئی پروفیشنل فورس ہو جسے احتجاج اور دہشت گردی سے نمٹنے کی تربیت دی جائے تو سکھو رٹی کی
 حالت کئی گنا بہتر ہو جائے گی۔ میں نے کہا کہ یہ ڈھائی ہزار کی فورس شہر کے لیے کافی ہے، مگر ان کی رہائش اچھی ہو۔

کرتا تھا۔ پھر جو شہر پسند مولوی ہوتے تھے ان پہ خاص طور پر نظر رکھی جاتی۔ اس وقت ہر ضلع میں دو تین شہر مولوی ہوتے
 تھے مگر ان سے انتظامیہ کا رابطہ رہتا۔ کبھی ڈائمی کو ہاتھ لگایا جاتا کبھی سختی بھی کی جاتی تھی۔ اب ہر چیز آئی ایس آئی کر
 رہی ہے۔ مقامی انتظامیہ کا یہ تاثر ہے کہ اگر کوئی دہشت گرد ہے تو اسے آئی ایس آئی دیکھے گی ہمارا تو یہ کام ہے کہ کسی
 شخص نے قتل کیا ہے اس پہ کیس بنایا جائے۔ اس طرح جہادیوں کو آزادی ملی ہوئی ہے۔“

س: کیا انٹیلی جنس بیورو (آئی بی) کچھ نہیں کرتی؟
 ج: ”آئی بی معلومات دے دیتی ہے۔ اس کی اہلیت تو ہے یعنی اگر وہ کچھ کرنا چاہے تو کر سکتی ہے مگر اس کے اندر
 بھی ایک قسم کا خوف پایا جاتا ہے۔ لہذا وہ بھی کامل طریقے سے کام نہیں کرتی۔“
 س: دہشت گردوں کا خوف؟

ج: ”جی ہاں۔ آئی ایس آئی مختلف طریقے سے کام کرتی ہے اس کے ذرائع کئی گنا زیادہ ہیں اور وہ بہت بھی
 متحرک ہے لیکن کئی دفعہ وہ بھی جہاد کے ہارے میں اپنی سوچ رکھتی ہے۔ بہر حال سکھو رٹی کا نظام خرابیوں سے پاک
 ہو جائے، تو ہمارے ہاں جلد امن آسکتا ہے۔ آج کل ”نول پروف سکھو رٹی“ کا بڑا چرچا ہے جس کی کسی بھی کتاب
 میں تعریف درج نہیں۔ کہتے ہیں، نول پروف سکھو رٹی دے دی گئی ہے۔ اور وہ کیا ہے کہ چند ڈرپوک سے پولیس
 والے ادھر ادھر پھر رہے ہیں ڈراما دھماکا ہوا تو بھاگ کھڑے ہوئے۔ ایک اور چیز میں ہمیشہ سوچتا ہوں کہ فوج والا
 کیوں لڑتا ہے؟ وہ اس لیے کہ پستان اور عام فوجی کئی سال تک ساتھ رہتے ہیں۔ ایک یونٹ میں آفسر کی ہسٹنگ ہوتی
 ہے اور سو دو سو فوجی اس کے ماتحت ہوتے ہیں ان کو وہ ذاتی طور پر جانتا ہے۔ وہاں سبھی کے اہل خانہ کھل مل جاتے
 ہیں۔ وہ ایک قسم کی نیم ہوتی ہے۔ پولیس میں کیا ہوتا ہے اس کا تماشا آپ نے اسلام آباد میں دیکھا کہ چالیس ہزار
 اہلکار گئے۔ کوئی ریلوے پولیس کا تو کوئی آزاد کشمیر پولیس کا اور کوئی پنجاب پولیس کا۔ ادھر سے پکڑ کر ادھر دے دیا۔ وہ
 ایک دوسرے کو جانتے بھی نہیں تھے۔ پہلی دفعہ مل رہے تھے۔ افسر پر اگر گولی چلے گی یا گولہ گرے گا تو کیا وہ اس افسر
 کے کہنے پہ کھڑا ہوگا؟ آپ نے دیکھا کہ ایس پی کو جب جہوم نے مارا تو بجائے اس کے کہ پولیس والے اس کی خاطر
 لڑتے وہ بھاگ نکلے۔ کیا فوج میں آپ سوچ سکتے ہیں کہ اس طرح ہوگا؟“

س: یہ بتائیے کہ دھرنوں کے دوران اگر آپ سیکرٹری داخلہ ہوتے تو کیا کرتے؟
 ج: ”دیکھیے اگر ایک لیڈر کے خلاف نفرت پائی جاتی ہے اور اس کی مخالفت میں کوئی دوسرا لیڈر اٹھتا ہے تو اس
 احتجاج کو پوری طرح سے ختم کرنا کسی بھی انتظامیہ کا کام نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ جو انہوں نے کیا تو ایک لحاظ سے
 ٹھیک تھا کہ اپنی تذلیل کروالی۔ مگر کتنے یہ ہے کہ اتنی زیادہ فورس اکٹھا کرنے اور معاملے کو خوب اچھا لہنے کی ضرورت کیا
 تھی؟ ان کی حکمت عملی یہ تھی کہ ہم نے کوئی تشدد نہیں کرنا۔ اور ویسے بھی طاقت استعمال کرنے کی ان میں ہمت نہیں تھی
 کیونکہ ماڈل ٹاؤن واقعے کے بعد زبردست رد عمل سامنے آیا تھا۔ یہ واقعہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نہ ہونے کے باعث رونما
 ہوا کہ وہاں کسی کو نہیں معلوم، آرڈر کس نے دیا ہے۔ ہوا یہ کہ جب گولیاں چلیں تو سب نے گولیاں چلائی شروع کر

روپے آج کے سو کروڑ روپے کے برابر تھے۔ میں نے یہ کیا کہ ڈسٹرکٹ کونسل میونسپل کونسل اور فارمز نو مارکیٹ والوں کو اپنی اپنی سڑکیں بنانے کا حکم دے دیا۔

”آخر میں صرف تین کروڑ روپے کی ضرورت رہ گئی۔ اس پوری اسکیم کا کوئی پی سی ون نہیں بنا اور منظوری کے لیے پی این ڈی پی کے پاس بھی نہیں گئی۔ ہائی وے کے ایس ای نے اسے سپروائز کیا، اور ایک سال میں بائی پاس سڑک بن گئی۔ اس کے ذریعے سارے شہر کا پتھر ہی بدل گیا اور تمام گودام وہاں منتقل ہو گئے۔ زمینوں کی قیمتیں بڑھ گئیں۔ کچھری بازار کا ہجوم کم ہوا اور گھنٹا گھر میں بھی ہجوم گھٹ گیا۔

”پھر میں نے ایک اور کام کیا۔ جب چناب کلب میں لوگوں کا ہجوم رہتا تھا۔ میں نے میونسپل کارپوریشن والوں سے پوچھا کہ ہر مناسب جگہ پر ایک اسپورٹس کلب بن سکتا ہے؟ انہوں نے کہا، جی بن سکتا ہے۔ میں نے لاہور سے آرکیٹیکٹ بلا یا اور اسے کہا کہ ایک اسپورٹس کمپلیکس ڈیزائن کرو جس میں کثیرالعیاد ہال ہوں یعنی وہاں والی بال کھیلا جاسکے، اس میں اسکوائش کورٹ ساتھ چھوٹا سا جم اور لائبریری بھی ہو۔ وہ ڈیزائن تیار ہو گیا تو برائے تعمیر پیسے اکٹھے کرنے کے لیے میں نے فیصل آباد کے صنعتکار بلائے۔ بارہ لوگ تھے، انہوں نے شاید بارہ بارہ یا پندرہ پندرہ لاکھ روپے دیے۔ انہوں نے ۶۰ فیصد پیسے دیے اور ۳۰ فیصد میونسپل کارپوریشن نے وسائل فراہم کیے۔ ہمارا آئیڈیا چھ کورٹس بنانے کا تھا۔ چھ تو نہ بن سکے چار بن گئے۔ پنجاب میں صرف منٹو پارک کا ہال ایسا ہے کہ وہاں والی بال کھیلا جاسکتا ہے یا پھر فیصل آباد کے چار کمپلیکس ہیں۔ اس وقت آئیڈیا یہ تھا کہ علاقہ مجسٹریٹ کلب کا صدر ہو گا اور کئی کوچوں میں کھیلنے والا بچہ بھی وہاں کھیل سکے گا۔

”اس کے بعد میں نے ٹرانسپورٹ کی بہتری کے لیے کام کیا۔ فیصل آباد میں سوزو کی تھی پارکسے چلتے۔ ان میں بھیڑ بکریوں کی طرح مسافر ٹھونس دیے جاتے۔ میں نے کبھی ٹرانسپورٹ پر کام نہیں کیا تھا۔ تاہم ایک شمالی جنوبی اور ایک مشرقی مغربی روٹ بنایا۔ اور وہ سارے کچھری بازار سے گزرتے تھے۔ درمیان میں ایک انٹرمیڈیٹ بنایا۔ اس طرح روٹ پلاننگ کی گئی۔ میں نے کہا کہ درمیان میں ایک ایسی جگہ ہو جہاں پہ بسیں کھڑی ہو سکیں۔ وہاں کوئی ایسی جگہ ہی نہیں تھی۔ جہاں کچھری بازار ختم ہوتا، وہاں سرکاری گھر تھے۔ ان سے میں نے کوئی آٹھ کینال زمین نکالی اور ایک سنٹرل ٹرمینل بنایا۔ اس وقت پرائم فکٹر اسکیم کی ویکٹیں بہت آئی ہوئی تھیں۔ مفت میں مل رہی تھیں جو لوگوں نے لے لیں مگر ان کا کوئی خاص استعمال نہیں ہو رہا تھا۔

میں نے ایک کہنی بنائی اور اسے رجسٹرڈ کرایا۔ اس کا نام رکھا: ”فیصل آباد اور بن ٹرانسپورٹ سسٹم“۔ اس کا ایک لوگو ڈیزائن کیا اور ہم نے کہا، جو شخص اپنی ویکٹیں اس سسٹم میں ڈالتا ہے ہم اس کو روٹ پر مٹ دیں گے۔ وہ ہماری مرضی کے مطابق چلے گا، اس کو اچھا کرایہ ملے گا مگر گاڑی میں اگر چودہ بیٹھیں ہیں تو وہ چودہ لوگ ہی بٹھائے گا، اور لوڈنگ نہیں ہوگی۔ گاڑی کا دروازہ بند ہو گا اور موسیقی نہیں چلے گی۔ ان کو سپروائز کرنے کے لیے سیکورٹی کہنی سے ہم نے سو آدمی رکھ لیے۔ یہ لوگ ان گاڑیوں کے روٹ چیک کرتے تھے۔ ہم نے پی سی سواری کرایہ پانچ روپے ملے کیا۔

ان کی تذلیل نہ کی جائے ان کو ٹرانسپورٹ کے ذریعے لایا جائے، جس طرح فوج اپنے جوانوں کا خیال رکھتی ہے، فورس زیادہ نہ ہو مگر پوری طرح پیشہ ور ہو۔

”اس اسکیم کے لیے ہمیں پیسے بھی مل گئے مگر تب تک میرا تبادلہ ہو چکا تھا۔ انہوں نے بعد میں اسلام آباد پولیس سیکورٹی ڈویژن بنا دیا۔ میرے منصوبے والی فورس یہ ایک قسم کی پولیس ہی تھی۔ یہ پولیس آفیسروں کے ماتحت تھی مگر اس کی تربیت پیرا ملٹری انداز میں ہونا تھی۔ اس میں ریپڈ فورس اور اینٹی ٹیررست فورس بھی شامل ہوتی۔ اگر یہ کامیاب ہو جاتا تو پھر دوسرے شہروں کے لیے بھی یہی نظام وضع کیا جاسکتا تھا۔ میں نے اس پر ایک کتابچہ بھی لکھ کے دیا جس پر میں نے ڈیڑھ سال کام کیا تھا۔

اب دھرنوں کا مسئلہ سامنے آیا تو انہوں نے کہا ”اسلام آباد پولیس کچھ نہیں کر سکتی“ آپ پنجاب پولیس کو بلائیے۔ وہ پولیس ہے۔ اب آپ دیکھیں کہ طرح کے ہیں وہ تو مہذب کے لیے آپ کو فورس تو چاہیے۔ فارغ کر سکتے تو ان میں سے نئی فورس تیار کر لیں۔ گیارہ میں نے کہا تھا کہ اس میں کوئی اگر ان کی تربیت ایک سال کی آئے گا۔



کہتے ہیں کہ یہ بڑی مہذب اسلام آباد میں دہشت گرد تو ہر نہیں۔ پھر انہیں کنٹرول کرنے چلیے آپ ساری فورس نہیں ۲ ہزار کی نفری کم کر کے اس سے سال قبل میں نے حل بتایا تھا۔ جلد بازی نہیں کی جائے گی۔ ہے تو یہ نتیجہ ایک سال بعد ہی س: آپ نے شعبہ اس کے کیا نتائج نکلے؟

”ج: میں جب فیصل آباد آزادی میسر تھی کہ میں نے کبھی ہی نہیں! ایوب خان کے دور کا مطالبہ چلا آرہا تھا کیونکہ ہر سڑک گھنٹا گھر سے ہو کے جاتی ہے۔ لہذا ہر سڑک پر بہت ہجوم رہتا۔ ایوب خان کے زمانے سے فنڈ نہیں آرہے تھے، میں نے وہاں پرنٹنڈنٹ انجینئر سے گزارش کی کہ سروے کرو اور دیکھو کہ ہماری کتنی سڑکیں ہیں، فارمز نو مارکیٹ روڈ ہے، ڈسٹرکٹ کونسل کی سڑک ہے، میونسپل کونسل کی سڑک ہے۔ انہیں ملا کر اگر ہم کوئی سڑک بنالیں تو کتنی نئی سڑکیں بنانا پڑیں گی۔ ایک مہینے بعد مجھے بتایا گیا کہ یہ بائی پاس ۳۰ کلومیٹر طویل ہے۔ گوڈلیاں والہ سے لے کر جھنگ تک اور اس میں صرف ۷ کلومیٹر ہمیں نئی سڑک بنانا پڑے گی اور ہم پرانی سڑکوں کو شادہ کر سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ دس کروڑ روپے کا نسخہ ہے۔ یہ ۱۹۹۳ء کی بات ہے، اس وقت کے دس کروڑ

میں عمران خان کے علاوہ کسی لیڈر کے ساتھ بیٹھنے کو تیار نہیں! سبھی ذاتی خواہشات کے اسیر ہیں

ہوتا اور اسی لیے کوئی بڑا سرمایہ کار آگے نہیں آتا۔ میں نے کہا کہ جو دو ارب روپے آپ نے بجٹ میں رکھے ہیں، وہ آپ کمپنی کو مستقل دے دیں۔ اس سلسلے میں بے شک آپ چار ایم پی اے کی کمپنی بنا دیں جن پہ آپ کو اعتماد ہے۔ ایک سسٹم ہو گا جس کے ذریعے جو شخص بس چلائے گا۔ اسے شیڈول کے مطابق ہر مہینے ہر مہینے پتے پتے رہیں گے۔ آپ اپنا یہ بندہ بست رکھیں کہ ہمیں دو ارب روپے ہر سال ملتے رہیں۔

”ایک سال تین مہینے میں ان سے کہتا رہا کہ پیسے کمپنی کو تو دیں، مگر وہ کہتے کہ آپ کام شروع تو کریں۔ فنانس ڈیپارٹمنٹ کے پاس پیسے ہیں آپ کو مل جائیں گے۔ انہوں نے ایک دن طعنہ دیا کہ آپ تو کہتے تھے کہ ایک سال میں ہزار بیس چل جائیں گی۔ میں نے کہا یہ نظام اس قدر مضبوط ہے کہ آپ کے پوتے بھی اسے استعمال کریں گے کیونکہ ایک دلچسپ سسٹم بن جائے تو پائیدار بھی ہو گا۔ یہ بھی کہا کہ آپ کاروں پر ٹیکس لگائیں۔ اس وقت شاید کار پہ تین ہزار روپے ٹیکس تھا۔ میں نے اسے ڈبل کرنے کی تجویز دی تاکہ وسائل آٹو ٹیکس طور پر کمپنی میں آئیں اور سرمایہ کاروں کو سب سڈی ملتی رہے۔ یہ نہ ہو کہ فنانس سیکرٹری بدل گیا تو ان کو دو ارب روپے نہیں مل رہے۔ لیکن انہوں نے اس امر پر کوئی توجہ نہ دی۔ ان کے ذہن میں شاید اس وقت میٹرو بس آگئی تھی۔ میں جب اس فورس کا حصہ بنا تو میں نے کہا کہ میں تنخواہ بالکل نہیں لوں گا، لیکن آپ میری بات مانیں گے۔

میں نے ڈیڑھ سال کام کیا۔ اس دوران لاہور ٹرانسپورٹ کا لوگو اور سب کچھ بنایا۔ میں نے اپنے دوست ارشد چودھری کا دفتر لے کر ایک چنڈ بیگ سے کام شروع کیا تھا۔ بعد میں لہرنی میں جو انجینئرنگ کونسل کی بلڈنگ ہے اس کا ایک پورا فلور لیا اور وہاں دفتر بنایا۔ میرٹ کی بنیاد پر افسران اور عملہ بھرتی کر کے پورا ادارہ کھڑا کر دیا۔ جب انہوں نے کوئی دلچسپی نہیں لی تو میں نے استعفا دے دیا۔ انہوں نے شکر یہ کرنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔

اس کے بعد پھر میٹرو بس شروع ہو گئی جس میں ساڑھے تین پونے چار ارب روپے ایک روٹ کا لگتا ہے اور میں ۴۰ روٹوں کے لیے صرف دو ارب روپے مانگ رہا تھا! یہ محض ۶۶ بیس چلتی ہیں جبکہ ہمارے پروگرام کے مطابق ایک ہزار بیس چلنا تھیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ اگر یہ ۴۵ منٹ میں جاتی ہے تو وہ ڈیڑھ گھنٹے میں جاتی۔ اگر آپ وہ کمپنیاں ختم کر دیتے تو ہماری بس بھی تیز ہو جاتی۔ اب سنا ہے کہ اس ادارے کو میٹرو میں ضم کر رہے ہیں۔ جب میں نے چھوڑا تھا تو ۱۰۰ آدمی تھے۔ وہ پھر ۵۰۰ بیس اپنے سرمائے سے لے آئے اور اس کے بعد لوگ تلاش کرتے رہے کہ ۵۰ بیس تم چلا لو اور ۵۰ ہم چلا لیں۔ ان کی چار سو پانچ سو بیس آئی تھیں، جبکہ میرے ماڈل میں وہ بیس نئی سرمایہ کاروں نے خریدنی تھیں۔ ہم نے صرف سبڈی دینا تھی۔

س: اب آپ کا بنایا سسٹم لاہور میں چل سکتا ہے یا نہیں کیونکہ میٹرو بس بن گئی ہے؟
ج: ”کیوں نہیں چل سکتا؟ میٹرو بس تو ایک روٹ ہے جبکہ لاہور شہر تو بہت بڑا ہے۔
س: اس میٹرو منصوبے کا مستقبل کیا ہے؟

”یہ کرایہ دوسری سوزوکی سے زیادہ مگر رکشے سے کم تھا۔ پہلے تو ہم نے مجسٹریٹ کے ذریعے پکڑ دھکڑ کر کے دیکھیں ڈالیں جو بڑی کامیاب ثابت ہوئیں۔ رنٹ رنٹ دیکھیں والوں کو بڑا مالی فائدہ ہونے لگا۔ کیونکہ مسافروں کو جب باعزت نشست ملی، عورتیں اور بچے آسانی سے سفر کرنے لگے تو وہ ادھر ہی آنے لگے۔ ہم دیکھیں والوں سے ۱۵۰۰ روپے مہینہ لیتے تھے۔ یوں باقاعدہ آمدنی ہونے لگی۔ سوچا تھا کہ اس آمدنی سے ٹریک پولیس کی کارکردگی بڑھانے کے لیے اقدامات کریں گے۔ لیکن جب میرا تبادلہ ہوا تو وہاں جو لوگ تھے انہوں نے گاڑی رجسٹرڈ کرنے پہ رشوت لینا شروع کر دی۔ بہر حال یہ مائل چلتا رہا اور لیصل آباد کو بغیر کسی سرکاری سرمایہ کاری کے ایک ٹرانسپورٹ سسٹم مل گیا۔

س: آپ نے اتنا عظیم کارنامہ انجام دیا اس پر حکومت نے آپ کی بڑی قدر افزائی کی ہوگی؟

ج: ”میں اس کی کتنا بھی سناتا ہوں۔ جب شہباز شریف آئے تو انہوں نے فرنیچر ٹرانسپورٹ ماڈل متعارف کرایا۔ یوں اچھے خاصے سسٹم کا گلہ گھونٹ دیا گیا۔ ان کے پہلے دور حکومت میں ایک تجویز آئی تھی کہ جو شخص ۵۰ بیس چلائے، اسے دو روٹ کی اجازت داری دے دی جائے۔ چنانچہ چودھری نذیر کے بیٹے زاہد نذیر نے بیس چلا لیں۔ اس تجربے کی بنا پر جب میں ۲۰۰۵ء میں ریٹائرڈ ہوا تو شہباز شریف نے کہا کہ آپ لاہور کے لیے کچھ بنائیں۔ میں نے ہائی بھری۔ انہوں نے پھر ایک ٹاسک فورس بنا دی۔ اس میں مایہ ناز لوگ شامل تھے اور میں اس فورس کا سربراہ تھا۔ ہم نے تین مہینے کام کر کے ایک ایکسٹیم بنائی کہ لاہور میں بھی ایک کمپنی بنائی جائے۔ اس کو پارلیمنٹ کے ذریعے یہ اختیار دلا جائے کہ وہ روٹ پر مت دے اور بسوں کو ٹریک بھی کرے۔

کمپنی کی بیس ڈسپلن میں لانے کے لیے میں نے کہا کہ جیسے یہ ٹریک پولیس ہے اسی طرح ایسی پولیس الگ سے بنائی جائے جو پبلک ٹرانسپورٹ کو مانیٹر کرے۔ ہم اس کو ریگولیٹ کریں اور دیکھیں گے کہ اس روٹ پر اسے کتنے روپے وارے کھاتے ہیں۔ اس کا کام صرف بس چلانا ہے، باقی نظام سے اس کا کوئی تعلق یا کسی قسم کا کوئی واسطہ نہیں ہو گا۔

”ہم نے پھر سرمایہ کار سے کہا کہ آپ کا روٹ نمبر ۱۰ ہے اور تم نے ہمیں ۳۰ بیس دینی ہیں۔ ٹکٹ آپ لیں گے اور ٹائم ٹیبل ہم دیں گے۔ ہمیں معلوم ہے کہ آپ کو اس روٹ پر چلنے کے لیے پانچ روپے کلومیٹر زیادہ درکار ہوں گے تاکہ پانچ سال میں سرمایہ واپس آجائے۔ ہم نے بس پہ ٹریک لگایا کہ بس جتنے کلومیٹر چلے گی وہ کمپیوٹر ہمیں بتا دے گا۔ اس کے اصول دو تین بنائے۔ کرایہ طے کرنے اور سروے کرانے کے لیے بڑی ٹک و دو کے بعد ایک یونیورسٹی کے ماہر سے سروے کرایا۔

”اب سرمایہ کاروں نے کہا کہ آپ کا نظام بہت اچھا ہے مگر ہمیں نہیں لگتا کہ پنجاب حکومت کوئی سبڈی دے گی۔ میں نے شہباز شریف سے کہا کہ مجھے ایک سال کے لیے دو ارب روپے چاہئیں اور یوں ایک ہزار بس اس شہر میں چل جائے گی۔ وہ دو ارب روپے ان کو بطور سبڈی دینے ہوں گے کیونکہ اربن ٹرانسپورٹ میں زیادہ منافع نہیں

تک آپ بجلی چوری ختم اور ریکوری نہیں کریں گے تو ایک سال میں دوبارہ ساڑھے چار سو ارب روپے کے بل جمع ہو جائیں گے۔ انہوں نے کہا کہ کونکے کے بجلی گھر بنائیں گے۔ اب ایک سال ہو گیا ہے اور انہیں سمجھ نہیں آتا کہ گوادریں بنانا ہیں یا اندرون سندھ۔ جب اندرون سندھ بنانے کا سوچا تو لوگوں نے کہا کہ اس کو چلانے کے لیے تو آپ کو دس ٹریلین چاہیے ہوں گی روزانہ کونڈ لانے کے لیے! اب شاید پھر گوادریں بنانے کا سوچ رہے ہیں۔ انہوں نے کوئی کام ٹھیکیداروں کے بغیر نہیں کیا۔ دنیا میں کوئی قوم ایسی ہے جو بغیر صحت اور تعلیم کے ترقی کر سکے؟“

س: نورانی صاحب! آپ بیورو کریٹ ہیں۔ سرکاری معاملات کو آپ نے نہایت قریب سے دیکھا ہے۔ اب جس سیاسی پارٹی میں آپ آئے ہیں اس کا تجربہ کیسا رہا؟

ج: ”میں سیاسی پارٹی میں کوئی ذاتی مقصد پورا کرنے نہیں آیا۔ بات یہ ہے کہ عمران خان حماقتیں کرتا ہوگا، لیکن آج اس سے زیادہ ایماندار دلیر اور نیک نیت آدمی کوئی نہیں اور میں ان کی انہی خوبیوں کا معترف ہوں۔“

س: کب سے معترف ہیں؟

ج: ”میں انہیں پچھلے پانچ برس سے جانتا ہوں۔ شاید وہ اچھا سیاستدان نہیں، اچھا ایڈمنسٹریٹر بھی شاید نہ ہو، مگر بنیادی بات یہ ہے کہ وہ ایماندار ہے۔ اگر مجھے شک ہو کہ یہ شخص اپنے لیے کچھ کر رہا ہے اپنا فائدہ دیکھتا ہے تو پھر میں اسے چھوڑ دوں گا۔ جہاں تک اس کی فہم و فراست یا عقل مندی کا تعلق ہے تو اس حوالے سے آپ سوال کر سکتے ہیں۔ ہم بھی اس سے بحث اور لڑائی کرتے ہیں، مگر اس میں خاصیت ہے کہ جس چیز کو وہ درست سمجھے، کر گزرتا ہے۔“

س: یہ کوئی انہی بات تو نہیں؟

ج: ”میں یہ نہیں کہہ رہا کہ یہ اچھی بات ہے۔ مگر اس کی خوبیوں میں سے یہ بھی ایک خوبی ہے۔ آپ خود سوچئے، جس شخص کے ۹۰ فیصد اثاثے ملک سے باہر ہوں، قوم اس پہ کیسے اعتماد کر سکتی ہے؟“

س: اکثر لیڈروں کے اثاثے باہر ہیں۔

ج: ”باقی تو چھوٹے لیڈر ہیں، ناچوٹی کے لیڈروں کے ساتھ بھی یہی معاملہ درپیش ہے۔ یہ تو ہماری قیادت کر رہے ہیں۔ ان سے پھر آپ کیا توقع کر سکتے ہیں؟“

س: آپ کے خیال میں پی ٹی آئی صحیح اصولوں پر پھل پھول رہی ہے؟

ج: ”میں سمجھتا ہوں کہ وقت کے ساتھ ساتھ جماعتی کام میں بہتری آرہی ہے۔ میرے خیال میں کام سیکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ وقت تو لگتا ہے اور قیمت تو دینا پڑتی ہے۔“

س: آپ کی پارٹی میں جو اندرونی انتخابات ہوئے، تو اس کے حوالے سے کئی منفی باتیں سامنے آئیں۔ آپ کے الیکشن ٹریبونل نے ہر نوع کی بے قاعدگیوں کے باعث انہیں کا اہل قرار دے دیا ہے اور مارچ میں نئے انتخابات کرانے کی بات کی ہے۔

ج: ”بات وہی ہے کہ معاملات کو صحیح خطوط پر چلانے میں وقت لگتا ہے۔ اس الیکشن میں ساری چیزیں بہتر ہو

ج: ”انہوں نے جو پل وغیرہ بنائے تو میرے خیال میں ۶۰، ۷۰ ارب روپے خرچ کر دیے۔ یہ دیکھیے کہ آپ نے صرف خوب صورت بسیں دکھانے کے لیے اتنے پیسے لگا دیے۔ ۳۰ ارب روپے میں تو ایک شہر کو بھروسہ بنایا جاسکتا ہے۔“

س: آپ نے بہت سے سیاستدانوں کے ساتھ کام کیا اور انہیں قریب سے دیکھا۔ وہ کیا سمجھتے نہیں، سنتے نہیں یا مانتے نہیں! آخر ان کا مسئلہ کیا ہے؟

ج: ”ہر سیاست دان کا اپنا انداز کار ہے۔ یہ باہر جائیں تو وہاں سے کوئی آئینڈ یا لے آتے ہیں۔ مثال کے طور پر بڑے میاں صاحب کی تو دلی خواہش ہے کہ ”ماڈل ٹاؤن ٹرمی“ تیز رفتار ریل یا موٹروے بن جائے۔ یہ ان کا مشن تھا۔ اب وہ گوادریں بات کرتے ہیں، مگر بات یہ ہے کہ کیا محض انفراسٹرکچر سے سارے مسائل حل ہو جائیں گے؟“

ہے کہ انفراسٹرکچر معیشت میں تیزی پیدا آتا ہے، لوگوں کو جب وسائل کم ہوں وسیع کرنی ہو جب تو رکھتا ہے؟



مشرور بس منصوبہ انتہائی مہنگا ہونے کے باعث تنقید کی زد میں۔ ایک رپورٹ کی رو سے منصوبہ جاری رکھنے کے لیے پنجاب حکومت روزانہ 5 لاکھ روپے کی سبسڈی دے رہی ہے

س: کہا جاتا ہے کہ روپیہ روزگار لاتا ہے۔ اور آپ کو معیشت انفراسٹرکچر اہمیت ج: میں اگر میرے پاس میں اس سے ایک گزارہ کیسے ہوگا؟ نے ۵۰ لاکھ میں

گھر بنوایا، دس لاکھ بچوں کی تعلیم پر صرف کیے پانچ لاکھ ان کی صحت پر خرچ کیے اور پندرہ یا بیس لاکھ کاروبار میں لگایا۔ اب آپ دیکھیں کہ کون سا منصوبہ بہتر ہے؟“

س: کیا وجہ ہے کہ سیاسی حکومتوں کو پورا وقت نہیں دیا جاتا؟ ان کے ذہن میں یہی ہوتا ہے کہ سال ڈیڑھ سال ہی میں کچھ کر جاؤ۔ میاں صاحب کو سال بھی نہیں ہوا کہ انہیں دھرنے اور اسٹیبلشمنٹ کے ذریعے بنانے کی کوشش کی گئی؟

ج: ”پچھلی حکومت کو پانچ سال پورے دیے گئے اور نتیجہ لوگوں نے دیکھ لیا کہ انہوں نے کوئی کام نہیں کیا۔ اب لوگ اس نتیجے پہ پہنچ چکے کہ اگر حکمران کام نہیں کرتے تو انہیں نکال دو۔ حقیقت یہ ہے کہ حکمران طبقے نے گٹھ جوڑ کیا ہوا ہے۔ پہلے سال تو انہیں کسی نے تنگ نہیں کیا۔ اب اس سال میں سمت کا تعین ہو جاتا چاہیے تھا۔ ایک سال میں یہ ہوا کہ ساڑھے چار سو بلین روپے اکٹھے کر کے بجلی کی کپنیوں کو دے دیے۔ اب کس بیوقوف کو یہ نہیں پتا تھا کہ جب

پاکستان میں مجھے کئی مصائب اور مشکلات برداشت کرنا پڑیں لیکن میں نے بیرون ملک جانے کا نہیں سوچا

میں سے ۲۵ فیصد مفت تعلیم پاتے ہیں۔ اس کا معیار اپنی سن جیسا ہے۔ ہمارا مشن ہے کہ ہر صوبے میں ایک کینڈا کالج بنانا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمیں بہت اچھی تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ اس لیے دوسرے بچوں کو بھی معیاری تعلیم ملنی چاہیے۔ ہم نے وانا اور قبائلی علاقوں کے بچوں کو کمزور میں پہنچا دیا ہے۔ ہمارے اسکول کے بچوں میں سے کوئی اسکالرشپ پر ترکی چلا گیا، تو کوئی یورپی ملک میں۔ ہمارے پاس بچے ۱۳ سال کی عمر میں آتے اور ۱۸ سال کی عمر تک رہتے ہیں۔ کینڈا کالج سے پڑھ کر میں گورنمنٹ کالج میں آ گیا اور وہاں سے بی ایس کیا۔

س: آپ کے خاندان کا مستقل ٹھکانا کہاں تھا؟

ج: ”والد صاحب لاہور ریلوے کالونی میں رہتے تھے۔“

س: آپ کی پیدائش کب ہوئی؟

ج: ”۱۹۳۵ء میں پیدا ہوا۔ ۱۹۶۰ء میں میٹرک کیا اور ۱۹۶۶ء میں ایم ایس سی جیالوجی پنجاب یونیورسٹی سے کیا۔ مجھے مہم جوئی کا بہت شوق تھا چنانچہ ۷ سال کی عمر میں اپنے دوست کے ساتھ کچھ پیسے لے کر بذریعہ سڑک تہران گیا۔ ہم نے وہاں کوئی مہینہ گزارا۔ پھر جب ۱۹ سال کا ہوا تو والد صاحب سے ۵۰۰ روپے لے کر ہم دونوں دوست ہائیکنگ کرتے ہوئے لندن گئے۔ پاکستان سے ریل پر ایران گئے، پھر بس کے ذریعے ترکی پہنچے۔ ترکی میں ریل کے ذریعے استنبول جا پہنچے جہاں سے اورینٹ ایکسپریس چلتی تھی۔ اس پر یورپ چلے گئے۔ لندن میں نے چار ہفتے مزدوری کی اور اتنا پیسہ کمایا کہ لندن کی سیر کرنے کے بعد پیرس بھی گئے۔ ساڑھے تین چار مہینے بعد واپس آ گئے۔ اس سفر سے خود اعتمادی پیدا ہوئی۔ ہم ایک بھائی اور ایک بہن ہیں۔ جب میں پنجاب یونیورسٹی میں تھا تو میں نے ۱۹۶۵ء میں یونین کا الیکشن لڑا۔ اس زمانے میں وکیل حامد خان سیکرٹری تھے۔ ایم ایس سی کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی میں جیالوجی ڈیپارٹمنٹ میں لیکچرار ہو گیا۔ ۱۹۶۷ء میں سی ایس ایس کا امتحان دیا۔ اس وقت میرا خاندان آٹل کہنیوں میں شامل تھا۔ اس وقت ان کی آمدن ۲۰ ہزار روپے تھی اور سی ایس ایس کی تنخواہ صرف ساڑھے تین سو روپے۔ میں زیادہ قابل طالب علم نہیں تھا زیادہ تر وقت غیر نصابی سرگرمیوں میں گذرتا۔ جیسے تقریریں کرنا، الیکشن لڑنا پھر بھی میں نے تین مہینے سی ایس ایس کی تیاری کی اور میری پاکستان میں چوتھی پوزیشن آئی۔ پہلی پوزیشن اور مجھ میں صرف ۲ نمبروں کا فرق تھا۔

۲۰ فیصد میرٹ کا کوٹہ ہوتا اس کے بعد پنجاب کا کوٹہ تھا۔ بیس فیصد میں یہ چار سینیٹس شامل تھیں۔ ہم ٹاپ کے چار لڑکے میرٹ پر آئے۔ ۱۹۶۸ء میں سول سروس جوائن کی اور ۲۰۰۵ء میں ریٹائر ہوا۔ ۳۷ سال نوکری کی۔ میں نے ایک دن کی بھی ایکسٹینشن نہیں مانگی اور نہ ملی۔ ۶۰ سال کی عمر میں ریٹائر ہوا۔

س: آپ نے طویل عرصہ بیوروکریسی میں گزارا۔ اس دوران کچھ دلچسپ واقعات ضرور پیش آئے ہوں گے؟

سکتی تھیں۔ مثال کے طور پر ایک بحث ہوئی کہ نکت تمام نوجوان اور شریف لوگوں کو ملنے چاہئیں یا ان کو بھی جو تھوڑے فنڈز مگر تجربہ کار ہیں۔ فیصلہ یہ ہوا کہ ۳۰ فیصد، ۳۵ فیصد جوانوں کو دے دو جن کا تجربہ نہیں، ۰۱ فیصد باقیوں کو دے دیں جن کا تجربہ ہے۔ تحریک انصاف اس وقت شاید اتنی اچھی تنظیم نہیں لیکن دوسری یا تیسری دفعہ جماعتی الیکشن کے بعد بہتر ہو جائے گی۔“

س: لوگ کہتے ہیں کہ الیکشن میں پیسا بہت استعمال ہوا۔ مثلاً عظیم خان جیسے لوگوں نے دولت کی بنا پہ نکت لے لیے۔ چودھری اعجاز اور محمود الرشید جیسے لوگ جو بڑے عرصے سے جماعت کے لیے کام کر رہے تھے، وہ پیچھے رہ گئے اور پیسا آگے آ گیا۔

ج: ”میں سمجھتا ہوں کہ آگے چل کر حالات بہتر ہوں گے۔“

س: اچھا یہ بتائیے کہ پی ٹی آئی کے دور حکومت میں خیبر پختون خواہ کے حالات کچھ بہتر ہوئے؟

ج: ”اس صوبے میں کرپشن وزیر سے لے کر ٹی ٹی سی تک خاصی کم ہو چکی ہے۔ کرپشن ختم کرنے کے لیے ہی خان صاحب نے پہلے شیر پاؤ کے وزیر ہٹائے، حالانکہ حکومت گر سکتی تھی۔ اس کے بعد کوئی دو تین اپنے وزیر بھی نکال دیے۔ دوسری بات یہ کہ پولیس جیسا اہم محکمہ وہاں سیاسی دھاڑ سے آزاد ہے۔ وزیر داخلہ کے ضلع میں ایس پی اس کی پسند کا نہیں لگا بلکہ آئی جی نے لگایا ہے۔ یہاں تک کہ تھانیدار بھی آئی جی کی اپنی پسند کے ہیں۔ وہ کسی کی کوئی سفارش نہیں لیتا۔ اس طرح وزیر تعلیم ہے، اس نے اساتذہ کی حاضری پہلے سے بہتر کر دی۔ طلبہ بڑی تعداد میں اسکولوں میں آ رہے ہیں۔ محکمہ صحت میں بھی اسی طرح بہتری آ رہی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم موازنہ کرتے ہیں کہ وہاں کوئی ہل بنا؟ کوئی میٹروپولی؟ یہ کام نہیں ہوئے تو کہتے ہیں، وہاں کچھ بھی نہیں ہوا۔

س: نورانی صاحب اب اپنے بارے میں بھی کچھ بتائیں کہ تعلیم کہاں سے پائی، بچپن کہاں گزارا اور بیوروکریسی میں کیسے آئے؟

ج: ”میں ایک متوسط خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ میرے والد ریلوے میں آفیسر تھے۔ ہم جالندھر سے پاکستان آئے۔ والد کے دیگر بھائی ہجرت کے بعد کراچی چلے گئے۔ میرے والد صاحب کی پہلی تقرری رانیوٹھ میں ہوئی۔ بعد میں شیخوپورہ اور خانپور بھی رہے۔ میں جب گیارہ سال کا ہوا تو مجھے کینڈا کالج سرگودھا داخل کر دیا گیا۔ اس اسکول میں شاندار طالب علم زیر تعلیم تھے۔ مجھ سمیت انہی طلبہ نے آج ایک ٹرسٹ بنا رکھا ہے۔ اس کے پہلے چیئرمین تھے ایئر چیف مارشل فاروق فیروز خان۔ اب پچھلے چار سال سے میں چیئرمین ہوں۔ اس کے ایک رکن جنرل احسان الحق ہیں جو آئی ایس آئی کے چیف رہے۔

ہم دوستوں نے سوچا کہ ملک کے لیے کچھ اچھا کرنا چاہیے۔ جب جنرل احسان الحق آئی ایس آئی میں تھے اور میں وزارت داخلہ میں، تو ہم نے کچھ پیسے جمع کیے۔ نذواللہ یار میں ہمارے ایک پرانے ساتھی نے ۱۵۰ ایکڑ زمین ہمیں عطیہ کی۔ اس پر ہم نے ایک کینڈا کالج بنایا۔ اس وقت وہاں ساڑھے چار سو بچوں کو تعلیم دے رہے ہیں۔ ان

ج: ہم جب بارڈر ڈیویژن میں گئے تو وہاں ایک دانشور، مائیکل پوٹر کے ساتھ ہمارا دو تین دن مکالمہ جاری رہا اور بحث ہوتی رہی۔ انہوں نے کہا کہ اب حکومتیں بہت سے محکمے تنہا نہیں چلا سکتیں جن میں سرفہرست تعلیم، صحت اور ٹرانسپورٹ ہیں۔ ٹی سیکٹر کو بھی انتظام مملکت میں شامل کرنا پڑے گا۔ آپ نے بھی کہا کہ ٹی سیکٹر کے ذریعے کام بہتر ہو سکتا ہے۔ دراصل مسائل بہت زیادہ ہیں جیسے پولیس کا معاملہ، پنواری کا مسئلہ، صحت، تعلیم وغیرہ۔ لیکن خیبر پختونخواہ میں ہمیں کچھ ہوتا نظر نہیں آتا؟

ج: خیبر پختونخواہ میں تھوڑی سی پریشانی یہ ہے کہ وہاں کام کرنے والے پشتون ہونے چاہئیں یعنی میں اگر پی ٹی آئی میں ہوں تو میرا وہاں بیٹھ جانا مناسب نہیں۔

ج: جہاں گھبر ترین تو وہاں بہت آ جا رہے ہیں؟

ج: نہیں وہ تو ریٹائرمنٹ کنٹرول ہیں اور اس سے سارا کام نہیں ہو سکتا۔ مجھے بھی انہوں نے ایک مشاورتی گروپ میں ڈالا ہے مگر اس طرح کام نہیں چلتا کیوں کہ آپ ایک مشیر ہیں چیف ایگزیکٹو تو نہیں۔ آپ روزانہ دفتر نہیں جاتے۔ آپ ایک دو ہفتے بعد پوچھ رہے ہیں کہ کیا ہوا؟ اس نے کوئی بات بتادی، آپ واپس آ گئے۔ پھر وہاں چلے گئے۔ تو وہ جو آپ کی اہلیت ہے وہ عمل طور پر میسر نہیں۔ وہاں جو لوگ منتخب ہوئے وہ پہلی دفعہ آئے ہیں۔ ان کا تجربہ ہے اور نہ کبھی انہوں نے سرکاری کام کیا ہے۔ چنانچہ انہیں کام کرتے ہوئے دشواری پیش آرہی ہے۔

ج: انہوں نے اسلام آباد میں ایک اینڈوانٹری کمیٹی بنائی جس میں مجھے بھی شامل کیا گیا۔ چیئرمین صاحب نے مجھے دو تین اسائنمنٹ بھی دیں۔ میں جاتا رہا۔ وزیر اور سیکرٹری سے کہا کہ اس طرح کام ہونا چاہیے۔ وہ کہتے ہاں سر ہانکل ٹھیک ہے۔ ایک ہفتے بعد فون کیا تو کہا، ہاں جی بس ہو رہا ہے۔ اگر میں وہاں انچارج ہوتا تو پھر میری قابلیت وہاں استعمال ہوتی نا۔ اب ریٹائرمنٹ کنٹرول سے تو آپ نتیجہ نہیں لے سکتے۔

ج: ہم بلوچستان گئے تو وہاں ہماری عبدالملک صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ ان کے پاس محدود وسائل ہیں لیکن وہاں ہمیں کام ہوتا نظر آیا۔ بیشتر لوگوں نے بتایا کہ کام ہو رہا ہے۔

ج: وجہ یہ ہے کہ انہیں اچھا چیف سیکرٹری ملا جس نے حکومت کو سنبھال لیا۔ پھر پہلے حالات اتنے زیادہ مفروض تھے کہ تھوڑا سا کام کرنے پر فرق نظر آنا شروع ہو گیا۔ مزید یہ کہ جو بلوچ احتجاج کرتے تھے اب وہ خود وزیر اعلیٰ بنے ہوئے ہیں۔ ادھر انہوں نے لوکل گورنمنٹ ایکشن کرا دیے جس میں چیف سیکرٹری کا بہت اہم کردار تھا۔ اس نے بہت ہمت کی اور فون بھی اسے اسپورٹ کرتی رہی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر مالک صاحب کو ایکشن کی طرف لانے والا بھی یہی شخص تھا۔

ج: تحریک انصاف کی ایک دم احتجاجی سیاست سامنے آئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسٹیبلشمنٹ کی حمایت حاصل ہے۔ خواص و عام میں یہ تصور موجود ہے۔

ج: میرے خیال میں پی ٹی آئی کی احتجاجی سیاست نے سسٹم سے مایوسی کے باعث جنم لیا۔ تحریک انصاف

ج: میں سمجھتا ہوں کہ اگر مجھے دوسری زندگی بھی ملے تو مسائل کے باوجود سول سروسز میں جانا پسند کروں گا۔ کیونکہ سرکاری نوکری میں پہچان ملی تبھی آج آپ انٹرویو لے رہے ہیں جبکہ ہمارے جو دوست کروڑ پتی ہیں، شاید انہیں کوئی جانتا بھی نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ جہاں بھی نوکری کی وہاں یہ مقصد سامنے رکھا کہ وقت نہیں گزارنا بلکہ کچھ کر کے دکھانا ہے، جیسے میں نے فیصل آباد اور سنگاپور کی کہانی سنائی۔ میں جب نماز پڑھتا ہوں تو اکثر یہ دعا مانگتا ہوں کہ اے اللہ مجھے توفیق دے کہ میں قومی سسٹم درست کرنے کے لیے کچھ کر سکوں۔ اپنے اور بچوں کے لیے تو سارے ہی کرتے ہیں۔ یاد اس شخص کو رکھا جاتا ہے جو اپنے سسٹم کے لیے کچھ کرے۔ درویشی پر میں نے کبھی یقین نہیں رکھا۔

ج: جب میں سیکرٹری تعلیم تھا تو میں نے ایک این جی او بنائی۔ اس کا نام تھا ریڈ (READ) یعنی Rural Education And Area Development۔ اس میں کچھ پیسے اپنی طرف سے ڈالے اور باقی اکٹھے کیے۔ میں پنجاب کا سیکرٹری تعلیم ۲ سال رہا۔ ۲۰۱۳ء تک میں نے یہ کام کیا کہ چھ اسکول لیے اور لاکھوں روپے ان پر خرچ کیے۔ فرنیچر لیا، واش روم بنوائے، بجلی لگوائی، ہر اسکول کو ایک ایک استاد دیا اور اس کی تنخواہ ادا کی لیکن منصوبہ اتنا کامیاب نہیں ہوا۔

کیونکہ ہم اساتذہ کرتے تھے۔ ان کی ہے۔ جب تک آپ رہتے ہیں وہ بڑے جب آپ کہتے ہیں تو اساتذہ ناراض ہو بڑے دعوؤں اور ساتھ چیزیں شروع جاتی ہیں۔



پولیس کے نظام کی اور بالنگ سے امن وامان کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے

ان کو پیسے دیتے خوش رہتے ہیں۔ کہ پڑھاؤ جاتے ہیں۔ اشتہاروں کے ہوتی پھر ختم ہو س: تحریک

دیا کیا وہ پاکستان کے لیے مفید ثابت ہوا؟ اگر اگلے سال انتخابات میں یہ کامیاب ہوتی ہے تو وہ حقیقی تبدیلی لے آئے گی؟

ج: ایک نئی پارٹی میں اہلیت آہستہ آہستہ جنم لیتی ہے۔ نئے در کر آتے رہتے ہیں۔ کوئی جذباتی ہوتا ہے اور کوئی نااہل۔ سال ڈیڑھ سال میں معاملہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ پی ٹی آئی میں میرے جیسے لوگ بھی ہیں جو زیادہ سامنے نہیں آتے۔ دھرنے میں جاتا تو کنٹینر پر پیچھے بیٹھا رہتا کیونکہ مجھے وحکم پیل کی عادت نہیں اور مجھے کوئی شہرت بھی نہیں چاہیے۔ اللہ نے جو عزت دی، وہ کافی ہے۔ سو کام کرنے والے بندے بھی ہیں مگر جیسے میں نے عرض کیا کہ وقت کے ساتھ پارٹی بہتر ہو جائے گی۔ پارٹی قیادت کو یہ خواہش نہیں کہ سارے فیصلے وہ خود کرے، بلکہ وہ میرٹ پر کام کرنا چاہتی ہے۔ آپ شوکت خانم کا تجربہ دیکھ لیں، ہر کام ایک نظام کے تحت میرٹ پر ہو رہا ہے۔

تحریک انصاف کے احتجاج نے ناکارہ نظام حکومت (سسٹم) کی بدبو سے بیزار ہو کر جنم لیا

س: فارغ وقت میں کیا کرتے ہیں؟ گالف کھیلتے ہیں؟

ج: ”جی گالف کھیلتا ہوں اور تیراکی کرتا ہوں۔“

س: مشرف صاحب کے ساتھ گالف کھیلے ہیں آپ نے؟

ج: ”نہیں“ مشرف سے میری ذاتی دوستی نہیں تھی۔ البتہ اپنے وزیر، جنرل (ر) معین الدین حیدر کے ساتھ گالف کھیلے ہیں۔

س: آپ نے شیرپاؤ کے ساتھ بھی کام کیا تھا؟

ج: ”نہیں وہ میرے بعد آئے تھے۔ میں جنرل نقوی کے دور میں سیکرٹری تھا۔ میں ڈی سی او کے نظام پر ان

سے طویل بحث کیا کرتا۔ مگر وہ مشرف صاحب کو ایسا بریف کر کے لاتے کہ وہ کسی کی سنتا ہی نہیں تھا۔ ایک دفعہ میں

نے جنرل نقوی سے کہا کہ کمشنر اور ڈپٹی کمشنر کے نظام میں وہ حکومت کے پیسے لگوائے بغیر کام کراتے تھے۔ آپ نے

وہ نظام ہی ختم کر ڈالا۔ میں نے انھیں فیصل آباد کی مثال دی کہ وہاں حکومت پاکستان کا ایک روپیہ بھی نہیں لگا۔ کہنے

لگے، آپ ہی کی وجہ سے تو وہ ختم کیا ہے۔ وہ کام عوام کے نمائندوں کو کرنا چاہیے۔“

س: آپ کے تفریحی مشاغل کیا ہیں؟

ج: ”مجھے لکھنا بہت پسند ہے اور لکھتا بھی ہوں۔ آپ اگر میرے نام سے گوگل پر سرچ کریں تو آپ کو میرے

مضامین ملیں گے۔ ڈان اور نیوز میں لکھتا ہوں۔ ساتھ ہی مجھے کھیلوں سے بھی دلچسپی ہے۔ خاص طور پر کرکٹ کا

بہت شوق ہے۔ میں فروری میں ورلڈ کپ دیکھنے اٹھا کہ گیا تھا۔ ٹینس دیکھنے ویسبلڈن دو مرتبہ جا چکا ہوں موسیقی کا

بھی شوق ہے۔“

س: کس کو زیادہ سنتے ہیں، کلاسیکل یا کچھ اور؟

ج: ”خود گاتا ہوں لیکن کوئی رسمی تربیت نہیں پائی۔“

س: کون سا میوزک سنتے ہیں؟

ج: ”آج کل کے گانوں کے علاوہ جتنے بھی پرانے فلمی گانے ہیں وہ سنتا ہوں۔ صوفی میوزک جس میں عابدہ

پردین بڑی حیثیت رکھتی ہیں اور کوک اسٹوڈیو کے بھی اچھے گانے ہیں، وہ بھی سنتا ہوں۔“

س: آپ کس شخصیت کو آئیڈیل سمجھتے ہیں؟ کہیں عمران خان تو نہیں؟

ج: ”میں آج کل عمران خان ہی کو آئیڈیل سمجھتا ہوں۔ اس وقت جو ہماری لیڈر شپ ہے اس میں صحیح آدمی ہے۔“

س: آپ نے بے نظیر کے ساتھ کام کیا؟

ج: ”کام تو نہیں کیا البتہ ملاقات ہوئی ہے۔ میں نے کسی حاکم کے ساتھ کام نہیں کیا۔ مشرف دور میں پانچ چھ

سال سیکرٹری رہا۔ ملاقات بھی پانچ چھ دفعہ ہوئی۔ ہو سکتا ہے کہ میٹنگ میں بیٹھ گئے اور ہاتھ اٹھا کے دو جملے کہہ دیے۔

میرے والد صاحب کا جب انتقال ہوا تب ان کا فون آیا تھا۔“

کابینہ بنتے ہو چکا کہ نارل سسٹم کے ذریعے عوام کو کچھ بھی نہیں ملے گا لہذا احتجاج کے ذریعے ہی اسے درست کرنا

چاہیے۔ شروع میں وہ چار نشستوں کی بات کرتے تھے پھر چالیس پر آئے۔ اب نہ تو چار کی بات ہو رہی ہے اور نہ

چالیس کی اب تو نمٹزم انکیشن کی بات ہو رہی ہے۔ حکومت نے خود اپنے لیے ایسے حالات پیدا کیے ہیں۔“

س: آپ اپنے بچوں کے بارے میں کچھ بتائیے؟

ج: ”میرے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ بیٹی پی ایچ ڈی کر رہی ہے۔ یل (Yale) اور ہارورڈ میں دو سال رہ

کے آئی ہے۔ اس کا سبیکٹ ہسٹری آف آرٹ ہے۔ میرا ایک بیٹا لوم سے پڑھ کے این سی اینڈ یونیورسٹی چلا گیا جو

جرس کے قریب ہے۔ وہاں سے ایم بی اے کر کے آیا تو میکرو کمپنی میں وہ کنسلٹنٹ ہو گیا جو دنیا کی ٹاپ کمپنی ہے۔

اب پچھلے ایک سال سے استغدادے کر پاکستان آیا ہے۔ کمپیوٹر ایپس ڈیزائن کر رہا ہے۔ دوسرے بیٹے نے بھی امریکا

سے گریجویشن کی ہے۔ وہاں چار پانچ سال ملازمت کے بعد وہ بھی این سی اینڈ گیا۔ اس نے بھی نوکری چھوڑ دی اور

سال ڈیڑھ سال پہلے پاکستان آ گیا۔ اب اپنی کہنی لائچ کی ہے۔ وہ ڈیجیٹل اینڈ ورنٹائزنگ، سوشل اینڈ ورنٹائزنگ کرتا

ہے۔ سب سے چھوٹی بیٹی لوم میں پڑھ رہی ہے۔“

س: حیرت کی بات ہے کہ آپ کے بچوں میں سے کسی نے سول سروسز جانے کا نہیں سوچا؟

ج: ”چھوٹے بیٹے میں جذبہ موجود ہے۔ وہ سوشل ویلفیئر پیغامات کے ذریعے محکمہ تعلیم کی رفتار تیز کرنا چاہتا

ہے۔ کبھی کہتا ہے کہ سیکرٹری تعلیم سے مجھے ملو ادیں، کبھی کہتا ہے میں فلاں کو آئیڈیا دینا چاہتا ہوں کہ اساتذہ کی

حاضری کیسے بہتر بنائی جائے۔ کوئی ایسی اسکیم بنانی چاہیے جس سے ان کی حوصلہ افزائی ہو سکے۔ استاد کے شعبے کی

عظمت کو اجاگر کیا جائے، تو اس کی ایسی سوچ ہے۔ سب سے چھوٹی بیٹی سول سروس میں جانے کی خواہش کرتی ہے، تو

میں اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہوں۔“

س: آپ پرانے اے سی آر سسٹم پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ کیا کارآمد ہے؟ یا جدید پرفارمنس اپریزل یعنی کے پی آئی

(KPI) سسٹم مفید ثابت ہو سکتا ہے؟

ج: ”کے پی آئی سسٹم فنی سیکٹر سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے لیے آپ کو نظام اور کلچر بھی بدلنا ہوگا۔ جب کہ

ہمارے ہاں کلچر بھائی چارے کا ہے یعنی کسی کو برا کہا جائے نہ بری رپورٹ دی جائے۔ کوئی سو میں سے پانچ صحیح

رپورٹ کرتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اگر کسی نے بری رپورٹ دی بھی ہو تو وہ بھی ٹھیک ہو جاتی ہے۔ اس پر وہ

نظر ثانی کر لیتا ہے البتہ چند لوگ پھنس جاتے ہیں۔ سول سروس کی کارکردگی کا جائزہ اتنا مشکل نہیں کیونکہ ایک

سرکاری افسر کی کارکردگی کے بارے میں علاقے کے عوام بتا دیتے ہیں۔ اگر آپ کو سیاسی انعام نہ دینا ہو تو آپ کو

اچھے افسر کی تشخیص میں کوئی دقت نہیں آتی۔ یہ پہلی دفعہ شہباز شریف نے ڈپٹی کمشنر میرٹ پر لگائے تھے۔ اس وقت

ڈپٹی کمشنر کا دور تھا۔ انھوں نے تب ضلع اچھی طرح چلائے مگر تب بھی اسسٹنٹ کمشنر اور ڈی ایس پی ایم پی این کی

سفارش پر لگائے گئے تھے۔“

س: سول سروس میں کوئی ایسا افسر جو آپ کو بہت پسند آیا؟

ج: ”ہمارے ایک ایسے افسر کنور اور لیس ہیں۔ ماشا اللہ حیات ہیں۔ چیف سیکرٹری سندھ رہے اور ڈان میں بہت لکھتے تھے۔ فرٹینئر میں بھی انہوں نے کام کیا۔ خاموش، مضبوط کردار کے مالک اور مصنوعی تشہیر سے کوسوں دور! کچھ افسر اپنی پہلنی زیادہ کرتے اور حاکموں سے زیادہ بنا کے رکھتے ہیں۔ لیکن سول سروس کا سرمایہ کنور اور لیس جیسے افسر ہیں۔“

س: آنے والے دس پندرہ برس میں آپ پاکستان کو کہاں کھڑا دیکھتے ہیں؟

ج: ”مجھے اپنے وطن کا مستقبل تاننا دکھائی دیتا ہے اس لیے میں نے کبھی ہجرت کا نہیں سوچا۔ کبھی کسی بچے کو نہیں کہا کہ تم باہر چلے جاؤ۔ کسی کے پاس غیر ملکی قومیت نہیں اور نہ کسی نے درخواست دی۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں دنیا کے جس حصے میں پیدا کیا ہمارے آباؤ اجداد بھی وہیں پیدا ہوئے۔ اب یہ برا ہے یا اچھا ہمارا مقدر یہی ہے۔ یہاں سے فرار میں کوئی فائدہ نہیں۔ آپ عارضی طور پر پھنسی پر یا پڑھنے چلے جائیں تو ٹھیک ہے مگر رہنا اور مرنا یہیں ہے۔ یہ سب کچھ میں اپنے بچوں کو بتاتا رہتا ہوں۔ یہاں مسائل بڑھ رہے ہیں تو آپ محنت کر کے اپنے ذریعہ معاش کا بندوبست کریں۔ اس کے بعد معاشرہ بہتر کرنے میں حصہ ڈالیں۔ جہاں تک پاکستان کے بارے میں ناامیدی ہے تو ۲۵ سال پہلے بھی لوگ اس کا اظہار کرتے تھے۔ کئی خوشحال لوگ کینیڈا منتقل ہو گئے مگر وہاں جانے کے بعد انہیں احساس ہوا کہ ادھر بھی حالات خاص مختلف نہیں۔ اب کئی لوگ واپس آ رہے ہیں۔ جو پڑ امید ہیں ان کو امید تب بھی تھی اور آج بھی ہے۔ جتنی دولت آپ یہاں کما سکتے ہیں باہر نہیں کمائی جاسکتی۔“

س: انتخابات لڑنے کا ارادہ ہے؟

ج: ”الیکشن لڑا جاسکتا ہے مگر اب مجھ میں چالیس سالہ سرکاری ملازمت کا خاص مزاج راسخ ہو چکا۔ اب کھدر کی شلوار قمیص پہن کے ۲۴ گھنٹے لوگوں کو سلام کرنا میرے بس میں نہیں رہا۔“

س: اگر نیکو کریش کی حکومت بنی تو اس میں شامل ہوں گے؟

ج: ”وہ پوچھیں گے ہی نہیں۔ نیکو کریش حکومت کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ پائیدار نہیں ہوتی مگر میں مطمئن ہوں کہ کوئی بھی ایسی فیلڈ جس میں میرا تجربہ ہے، مجھے مل جائے اور دو تین سال دیے جائیں تو اس سیکٹر کے مسئلے حل کرنے کی کوشش کر سکتا ہوں۔“

س: آپ کون سا سیکٹر چاہتے ہیں؟ معیشت، صحت یا سیکورٹی؟

ج: ”معیشت، تعلیم، صحت اور سیکورٹی ہی میرے شعبے ہیں۔ معیشت کے لیے کام کرنا زیادہ پسند کروں گا۔ میرے نزدیک معیشت سادہ چیز ہے بس آپ کو خرچے کم کرنا اور آمدن بڑھانی ہے۔ باقی مسئلے خود ہی حل ہو جائیں گے۔ آمدن بڑھانے کے لیے آپ کو ٹیکس لگانا پڑے گا۔ تب عوام ناخوش ہو کر کہیں گے کہ ہمارا کاروبار خراب ہو گیا۔ لیکن سچ یہی ہے کہ جس کو پیسے دینے چاہئیں وہ نہیں دے رہا۔ وہ بڑا ڈھیٹ ہے لڑتا ہے، کہتا ہے سڑکوں پر آ جاؤں گا، دکانیں بند کروں گا۔“

یہ انداز فکر شہریوں کو تعلیم دے کر بدلنا ممکن ہے مگر ہم نے اس سمت توجہ ہی نہیں دی۔ جب منظور دنو آئے تو میں سیکرٹری تعلیم تھا۔ میں نے کہا کہ تعلیم کو اہمیت دینے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ آپ کا جو سب سے اچھا سرکاری افسر ہے اسے محکمہ تعلیم میں لگائیں۔ پھر ایک اسکیم بنائی کہ جو ڈی ایم جی افسر اکیڈمی سے لگتا ہے اس کو پہلا سال تعلیم کے محکمہ میں گزارنا ہوگا چنانچہ اے ڈی سی لٹریسی کی ایک پوسٹ بنائی گئی پھر جو بھی افسر اکیڈمی سے نکل رہے تھے میں نے ان کو قائل کیا کہ وہ پہلے محکمہ تعلیم میں ایک سال گزاریں۔ وہ کہنے لگے ہم نے ماسٹر بننے کے لیے تو سی ایس ایس نہیں کیا۔ بہر حال میں نے منظور دنو کو رضا مند کر لیا کہ جوڑ کے تازہ دم ہیں انہیں ضلع کی تعلیم کا ناسک دیا جائے۔ پوری اسکیم میں نے بنائی۔ افسر آئے اور لڑتے جھگڑتے ضلعوں میں چلے گئے۔ مگر جیسے حکومتوں میں ہوتا ہے کہ جب آپ کوئی اچھی اسکیم متعارف کراتے ہیں تو آپ کا تہا دلہ ہو جاتا ہے۔ سو میری اس قسم کی اختراعات ادھوری رہ گئیں۔ انہیں دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔“

س: ہم جتنے بھی افسروں سے ملے وہ یہی کہتے ہیں کہ انہیں کچھ کرنے نہیں دیا گیا۔ اس کا سبب کیا ہے؟

ج: ”ایسی بات نہیں۔ فیصل آباد میں تو جو کچھ میں نے سوچا وہ کر دیا کیونکہ مجھے وہاں کام کرنے کے لیے دو تین سال مل گئے تھے۔ دراصل ایک ڈیڑھ سال گزارنے کے بعد ہی سرکاری افسر کو اندازہ ہوتا ہے کہ اُسے کیا کرنا ہے لیکن اب ہمارے اتنے طویل دور ایسے نہیں رہے۔ تین سال کا دورانیہ انگریز نے اسی لیے رکھا تھا کہ پہلے سال سیکھو، دوسرے سال عمل کرو اور تیسرے سال نتائج کو مستحکم کرو۔ اگر یہی دور ایسے دوبارہ نافذ کر دیے جائیں تو حالات بہتر ہو سکتے ہیں۔“

”اسی طرح جب میں سیکرٹری کا مرس تھا تو سفارت خانوں میں تعینات کمرشل کنسلروں کو ایک شیڈول پوسٹ ملتا اور دوسرا اسٹنٹ اکاؤنٹنٹ۔ میں سیکرٹری بنا تو میں نے کہا ان دو لوگوں کی ضرورت نہیں کیونکہ تنخواہ تو گورنمنٹ دیتی ہے۔ اگر کرایہ گھر، بچوں کی تعلیم اور میڈیکل الاؤنس کا حساب لگایا جائے تو انہیں خاصی رقم صرف ہوتی ہے۔“

میں نے کہا ایک عہدہ مٹم کر دو اور جو رقم بچے اس پر ایسا آدی لے آؤ جو مقامی زبان چانتا اور تعلیم یافتہ ہو۔ وہ سفارت خانے میں آ کر بیٹھے اور تجارت کو بڑھائے۔ ملکی تاجروں اور جمہیر آف کامرس کے ساتھ اس کی تعلق داریاں ہوں۔ سفارت خانے کے پاس اتنا پیسا ہوتا ہے کہ وہ اچھے سے اچھا مقامی ملازم رکھ سکتے ہیں۔ پھر میں نے ان کو بجٹ دلوا یا کیونکہ ہمارے کمرشل کنسلروں کی تنخواہ بھی کم ہوتی ہے۔ میں نے انہیں فارن الاؤنس کے علاوہ انٹرنیشنل کے پیسے بھی دلوائے۔ ٹرانسپورٹ کے بھی علیحدہ پیسے رکھے تاکہ ان کی کارکردگی بہتر ہو سکے۔ انہیں مقامی عملہ دیا اور یہ نظام آج بھی چل رہا ہے۔ میں نے کمرشل کنسلر کی تعیناتی سفارش کے بجائے میرٹ کی بنیاد پر کی۔“

س: آپ حکمرانوں میں کیزے ڈالتے رہتے ہیں جبکہ وہ کہتے ہیں ہم نے انہیں دھماکا کیا اور ملک کو ایشی طاقت بنا دیا؟

ج: ”ایشی دھماکا کیا تھا ایٹم بم تو نہیں بنایا! اگر ایٹم بم بنایا ہوتا تو شاید میں ان کو کریڈٹ دے دیتا۔ انہوں نے تو صرف دھماکا کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ کچھ عرصہ قبل جنرل شعیب امجد ایک ٹی وی پروگرام میں کہہ رہے تھے کہ میں اس

بھارت سے کہیں زیادہ آگے ہوتا اگر ہماری قیادت ایماندار ہوتی۔ اب تو بنگلہ دیش بھی ہم سے آگے نکل گیا ہے۔“

س: آپ کو کیا لگتا ہے کہ مذہم انکیشن ہو جائیں گے؟

ج: ”میرا خیال ہے کہ لوگوں میں بددلی پھیل چکی۔ اپنی طرف سے تو حکومت نے بڑی چالاکی سے دھرنے جاری رہنے دیے مگر وہ ڈھائی مہینے میں ان کی کارکردگی ہر کسی کو معلوم ہوگئی۔“

س: جاوید ہاشمی کی بار سے کوئی فرق پڑے گا؟

ج: ”میں سمجھتا ہوں کہ جاوید ہاشمی نے بہت زیادتی کی۔ ان کا یہ کہنا بالکل غلط تھا کہ فوج آجائے گی۔ وہ عمران خان کے حلقے میں کبھی نہیں رہے۔“

س: لیکن وہ پی ٹی آئی کے صدر منتخب ہوئے تھے؟

ج: ”اس لیے کہ پی ٹی آئی میں وہ نمایاں عوامی شخصیت کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس وقت لوگ کہتے تھے کہ آپ کے پاس ہے کون؟ تو ان کو صدر بنا دیا گیا۔“

س: لیکن ہارون الرشید اور بہت سارے صحافیوں نے لکھا ہے کہ عمران خان بہت سادہ ہیں؟

ج: ”میں بہت میٹنگوں میں عمران خان کے ساتھ رہا ہوں۔ انھوں نے کئی سوالات کے جواب دیے تھے۔ جب ہم اسلام آباد پہنچے اور بیٹھ گئے تو ہم بار بار پوچھتے رہے کہ آگے کیا ہوگا؟ اس سوال پہ عمران خان خاموش ہو جاتے اور کہتے، ان شاء اللہ ٹھیک ہوگا۔ انھوں نے یہ کبھی نہیں کہا تھا کہ فوج آجائے گی۔“

س: یہ بتائیے، شروع سے طے شدہ تھا کہ وزیراعظم سے استعفا لیں گے؟

ج: ”نہیں نہیں، پہلے تو چار حلقوں کا ایشو تھا۔ استعفا کا معاملہ درمیان میں آ گیا۔“

س: لیکن جاوید ہاشمی کہتے ہیں، ہمیں بتایا گیا کہ آگے قادری صاحب جائیں گے اور ہم پیچھے ہوں گے؟

ج: ”میں اس میٹنگ میں نہیں تھا وہ جو کنٹینر پر ہوئی۔ مگر آئیڈیا یہی تھا کہ ہم کوئی غیر جمہوری چڑھائی نہیں کریں گے۔ یہ نہیں تھا کہ ہم پرائم منسٹر باؤس کے اندر گھس جائیں گے، ایسا کچھ نہیں تھا، لیکن اس قسم کے معاملات میں کبھی کبھار کچھ فیصلے موقع پر ہوتے ہیں۔ یہ فیصلہ اگر ہوا، تو اتنا اچھا نہیں تھا، لیکن کیا ایک وفادار آدمی اس بات پر مستعملی ہو جائے کہ پہلے انھوں نے کہا تھا کہ یہیں رہیں گے اور آگے نہیں جائیں گے۔“

س: آپ کو لگتا ہے کہ انکیشن جلدی ہوں گے اور اصلاحات کے بغیر؟

ج: ”میری دعا ہے کہ وطن عزیز میں ایسا نظام آجائے جو پائیدار ہو۔ موجودہ حکومت اسے تکمیل نہیں دے سکتی۔ عوامی گورنمنٹ کا پتا نہیں کیسے آئے گی۔ اللہ کرے کہ عدالتیں کوئی بڑا قدم اٹھالیں۔“

س: انکیشن آپ کو ہوتے نظر آ رہے ہیں؟

ج: ”موجودہ حکومت چلتی نظر نہیں آ رہی۔ اتنی زیادہ فرسٹریشن ہے کہ یہ خود ہی تھک جائیں گے۔ ایک خبر یہ بھی ہے کہ ان کے اندر بھی فرسٹریشن بڑھ رہی ہے۔ جب شیر کمزور ہوتا یا بیمار ہو کے ذرا لڑکھڑاتا ہے تو پھر مخالف کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کل دوست محمد کھوسہ جو ان کا ستایا ہوا ہے وہ یہ کہہ رہا تھا کہ پانچ آدمی ان کے ساتھ ہیں۔ باقی

میننگ میں شامل تھا جس میں میاں صاحب دھماکا کرنے کے حق میں نہیں تھے۔“

س: اس کے مقابلے میں اگر فوجی حکمرانوں کو دیکھیں تو انھوں نے کیا کام کیے؟

ج: ”ایوب خان نے اپنی طرف سے خاصے کام کیے لیکن وہ بہ حیثیت جمہوری ملک کو تباہی کی طرف لے گیا۔ مشرف صاحب کی نیت بھی ٹھیک نہیں تھی، وہ لوکل گورنمنٹ کے ذریعے اپنی ایک لابی بنانا چاہتے تھے جیسی ایوب خان نے بنائی تھی۔ بھٹو نے بھی اسی کے قومی تحویل میں لا کے کچھ کرنے کی کوشش کی تھی۔“

سوال یہ ہے کہ جب موجودہ حکمرانوں کا بھی کوئی ویرن ہی نہیں تو پھر یہ ملک کے لیے کیا کریں گے؟ کیا وہ جرائم کا خاتمہ اور معیار تعلیم بلند کر سکیں گے؟ کیا لوگ سڑکوں پر موٹر سائیکل بہتر طریقے سے چلائیں گے؟ پبلک ٹرانسپورٹ سسٹم بہتر ہو جائے گا؟ کیا فی ایکڑ پیداوار ۳۰ من سے ۵۰ من کر سکیں گے؟ یا پانی کا صاف پانی میاں کر دیں گے؟

”میری جب بھی عمران سے بات ہوتی تو میں ان کی ہاں میں ہاں نہیں ملاتا۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ جناب یہ مسائل ہیں اور یہ حقائق! اب لیڈر وہ ہے جس میں اسے ایک حد تک سمجھا سکتا ہوں۔ اگر میری قائل کرنے کی استعداد نہیں، تو وہ پھر میری کمزوری ہے۔“

س: آپ نے دیکھا ہوگا کہ پچھلے دس برس میں جن ممالک نے ترقی کی ہے، ان میں بھارت سرلہرست ہے۔ اب آپ دہلی، ممبئی، بنگلور دیکھ لیں وہاں میٹرو بھی بنی ہے، پلازے بھی بنے، انڈر گراؤنڈ سسٹم بھی بنے، لیکن غربت میں کمی نہیں ہوئی۔ بچے وہاں مرنے لگے ہیں۔ پانی کی کمی کا بھی مسئلہ ہے، لیکن وہاں نواز شریف یا شہباز شریف حکومت میں نہیں رہے۔ چین میں بھی غربت کم کرنے کے لیے بہت کام کیا گیا ہے مگر اس وقت بھی کروڑوں چینی غریبانہ زندگی گزارتے ہیں۔ یہاں تک کہ بھارت میں تو کسان خودکشی کر رہے ہیں۔ مجھے لگتا ہے، ہم نے اپنے قومی مسائل کو اتنا بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے کہ اس سے عوام میں ناامیدی پھیل رہی ہے۔ بھارت سے جب صنعتکار آتے تو وہ ہماری موٹروں کے انڈسٹریل اسٹیٹ جو کہ پرویز الہی دور میں بنا سرسبز لاہور کی صفائی اور شوکت خانم اسپتال دیکھ کر بڑے حیران ہوتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے آپ لوگوں نے ہمیں بہت زیادہ ناامید کر رکھا ہے۔

ج: ”دیکھیے بھارت ہم سے آٹھ گنا بڑا ہے۔ یہاں اگر چار یا پانچ قومیں بستے ہیں، تو وہاں ڈیڑھ سو قومیتیں ہیں۔ ہمارا ایک مذہب ہے ان کے ہاں پانچ چھ مذاہب ہیں۔ ان کے مسائل بھی ہم سے دس گنا زیادہ ہیں پھر بھی وہ ہم سے بہتر کارکردگی دکھا رہے ہیں۔ ہمارے لوگ بھی محنتی ہیں، لیکن اپنے ملک میں خاص کارکردگی نہیں دکھا پاتے۔ البتہ بیرون ملک جا کر کارہائے نمایاں دکھاتے ہیں۔ چین ہم سے ۲۰ گنا بڑا ہے۔ ان کے بے پناہ مسائل ہیں۔ مثلاً ان کے کھانے مختلف ہیں اور رسم و رواج بھی لیکن وہ تو بھارت سے بھی زیادہ ترقی کر گئے۔ اب وہ دنیا کی بہت بڑی معیشت بن چکے۔ بھارت میں یقیناً غربت ہے، لیکن وہاں آپ جائیں تو جو شخص آپ کو چائے پائے گا وہ بھی انگریزی اسکول میں اپنے بچے پڑھا رہا ہوگا۔“

”اگر ایک ملک کا تعلیمی معیار بلند ہو جائے تو اس کی آبادی بہت بڑا اثاثہ بن جاتی ہے۔ آپ پھر لاکھوں لوگ یورپ بھیج سکتے ہیں۔ چین اور بھارت میں مسائل ہیں اور وہاں نواز شریف حکمران نہیں رہے۔ میرا یہ کہنا ہے کہ پاکستان کم از کم

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ ٹماہہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای ٹیک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ ہر ای ٹیک کا ڈائریکٹ اور رٹریوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای ٹیک کا پرنٹ پر یو ایچ
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

WWW.PAKSOCIETY.COM 2014 Pa

سارے بھی تکلیف میں ہیں۔ شاید دو چار مہینے میں کوئی فارورڈ بلاک بن جائے۔"

س: آپ تحریک انصاف میں کس عہدے پہ فائز ہیں؟

ج: "میں کور کمیٹی کارکن ہوں۔ یہ ارکان فیصلہ سازی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس کمیٹی میں ۳۵ ارکان شامل ہیں۔" ہمارا انٹرویو چار گھنٹوں پر محیط تھا جس میں قومی اہمیت کے بڑے بڑے مسائل زیر بحث آئے اور جناب تسنیم نورانی نے اپنے تجربات کی روشنی میں ان کا حل پیش کیا۔ وہ دن ملتان میں ضمنی انتخابات کا تھا اور ۷ بجے شام کے قریب جاوید ہاشمی کا یہ اہم بیان آ گیا تھا کہ ابتدائی نتائج ان کے خلاف ہیں اور اگر عامر ڈوگر جیت گئے تو میں انہیں مبارکباد پیش کروں گا۔ انہوں نے فی الواقع جمہوری اسپرٹ کا مظاہرہ کیا تھا۔ ان کا انٹرویو اردو ڈائجسٹ اکتوبر کے مہینے میں شائع ہوا۔ اس میں ہمارا موقف تھا کہ انہوں نے ایسپائر کی انگلی کی نشاندہی کر کے ملک پر بہت بڑا احسان کیا اور پاکستان نیکو کریش کی حکومت سے محفوظ رہا۔ جناب تسنیم نورانی کا نقطہ نظر ہم سے مختلف تھا جو ان کے انٹرویو میں پوری وضاحت سے موجود ہے۔ ہمیں بھرپور احساس ہے کہ ان کی صلاحیتوں سے قوم کو فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ہماری بڑی دعا ہے کہ عمران خاں اپنے اندر قیادت کے اوصاف پیدا کریں اور نوجوانوں کو اعلیٰ نصب العین اور اعلیٰ اخلاق سے مزین کرنے کا راستہ منتخب کریں۔ یہ ان پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ بد نظمی اور بے راہروی سے قوموں کو عروج نہیں ملتا اور زوال ان کا مقدر بن جاتا ہے۔

5. The bidder shall sign each and every page of the bids documents & initial all the corrections therein and shall be bound in all respects to the conditions laid down therein.
6. Conditional bids shall not be entertained.
7. Acceptance of the highest bid shall rest with the Chief Engineer (North), Punjab Highway Department Lahore who reserves the right to reject the same without assigning any reason thereof.
8. Documents and other terms & conditions pertaining to the bid can be seen in the office of the undersigned on any working day during office hours.
9. Tender Fee in shape of C.D.R by any Scheduled Bank of Pakistan in favour of the Executive Engineer, Provincial Highway Division-I Sargodha.

Note: - Auction Tenders for the above toll plaza if not received on 16.11.2014, the same will be issued on 17.11.2014 and received on 17.11.2014 at 01.00 PM and will be opened at 02:30 PM.

Executive Engineer
Provincial Highway Division-I
Sargodha

IPL-13768

Superintending Engineer,
Provincial Highway Circle
Sargodha

اردو ڈائجسٹ 52

نوٹ

منی آرڈر یا کتابیں بنام ادارہ ارسال فرمائیں۔ دستی دیتے وقت ادارے کی رسید وصول کریں۔ شخصی نام پر ہرگز ارسال نہ فرمائیں۔ شکریہ

بغیر نمود و نمائش

تعلیم القرآن، دین کی نشر و اشاعت اور انسانیت کی فلاح کے لیے، بغیر نمود و نمائش دیے گئے عطیات کا ادارہ خیر مقدم کرتا ہے۔ اپنے عطیات بذریعہ چیک یا ڈرافٹ ارسال کرنا چاہیں تو ڈرافٹ یا چیک آمنہ جنت فاؤنڈیشن اکاؤنٹ نمبر 102745 ایم سی بی چونیاں برانچ نمبر 0240 کے نام بھجوائیں۔ آن لائن بھی جمع کرا سکتے ہیں۔ اس صورت میں مطلع ضرور کریں۔

آن لائن اکاؤنٹ ایم سی بی 1002745067344040 PK86MUCB ماڈل اکاؤنٹ آمنہ جنت ویلفیئر فاؤنڈیشن ایم سی بی چونیاں برانچ
نوٹ: ادارہ گورنمنٹ سے منظور شدہ ہے۔ ادارے کو دیے جانے والے تمام عطیات انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں، مزید رابطے کے لیے:

پرنسپل رضیہ پروین: آمنہ جنت فاؤنڈیشن

ماڈل اسکول چونیاں ضلع قصور

فون نمبر: 0322-7614497-0300-4735932

محترمی و مکرمی جناب.....
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

کیا آپ کے پاس ایک قرآن مجید ہے؟

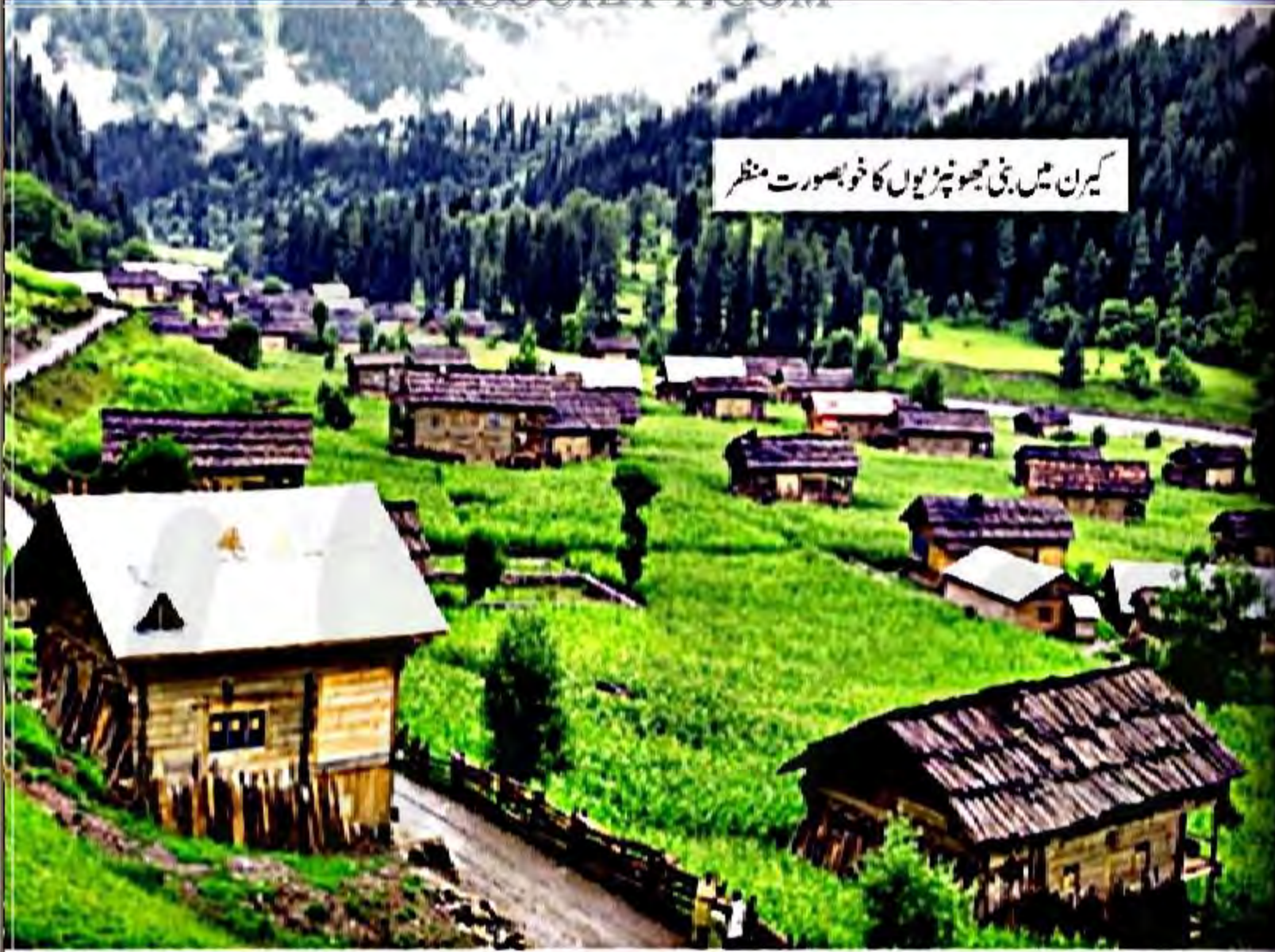
تمام مسلمان بہن بھائیوں اور خصوصاً آپ سے التجا ہے کہ آپ کے پاس اگر ایک سے زیادہ مترجم قرآن مجید، قائدے، سپارے، بخاری شریف یا حدیث کی کوئی کتاب یا دیگر اسلامی کتابیں موجود ہوں تو ضائع نہ کریں بلکہ ادارہ آمنہ جنت کی لائبریری کو عطیہ کریں۔ جب تک طالبات ان کو پڑھتی رہیں گی ثواب بھی آپ کو ملتا رہے گا اور یہ صدقہ جاریہ ہے۔

اپنے والدین اور مرحومین کے بلند درجات کے لیے

ادارہ کو تفاسیر قرآن کریم، کتب حدیث اور دیگر اسلامی کتابیں خود تشریف لا کر پہنچا دیں یا ان کی قیمت بذریعہ منی آرڈر بنام ادارہ ارسال فرمادیں۔ ہم تفاسیر قرآن کریم بازار سے لے کر رسید آپ کو بھجوادیں گے۔ ان شاء اللہ

دعوت

آپ کو دعوت دی جاتی ہے کہ آپ ماسوائے اتوار کے کسی بھی دن کسی جب آپ کو آسانی ہو، ادارے کا وزٹ فرمائیں، ہمارے کام تعلیم القرآن و عصری تعلیم کو چیک کریں۔ اگر دل گواہی دے کہ کام بطریق احسن سے ہو رہا ہے تو پھر تفاسیر قرآن کریم و کتب حدیث عنایت فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔



کیمرن میں بنی جموں پٹیوں کا خوبصورت منظر

بہر حال مجھے رضا کی یہ تجویز پسند آئی اور میں نے اس کا تذکرہ اپنے چچا محترم الطاف حسن قریشی سے کیا۔ میں بچپن ہی سے اپنے چچا الطاف حسن، تایا گل حسن اور ماموں محترم ضیاء الرحمن کے بہت قریب تھا جو اردو ڈائجسٹ سے طویل عرصہ وابستہ رہے۔ میں والد محترم کے ساتھ ساتھ ان بزرگوں کی خدمت کرنے اور ان کے ساتھ وقت گزارنے میں خوشی محسوس کرتا۔

چچا الطاف نے اپنے ایک دوست چودھری یوسف کو مظفر آباد فون کر کے ہمارے ارادے سے آگاہ کیا۔ چودھری صاحب آزاد کشمیر حکومت میں سیکرٹری تعلیم کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ انہوں نے سیاحتی دورے سے متعلق تمام انتظامات کرنے کا وعدہ کر لیا۔ یوں ہم دوستوں کو بظاہر مشکل لگنے والا معاملہ محترم چچا کی شفقت سے حل ہو گیا۔ وقت نے پھر ثابت

میں کشمیر کی خبریں و تحریریں تو اتر سے شائع ہو رہی تھیں۔ ان میں ایک طرف تو کشمیر کی جنت نظیر خوبصورتی کا ذکر ہوتا تو دوسری جانب کشمیریوں پہ ہونے والے بھارتی مظالم کا تذکرہ رد نکلنے کھڑے کر دیتا۔ پاکستان میں ہر طرف ایک ہی نعرہ تھا کہ کشمیر ہماری شہ رگ ہے۔ جبکہ بھارتی سیاستدان کشمیر کو بھارت کا اٹوٹ اٹک قرار دے کر اپنے عوام کو بھڑکانے کی سعی کرتے۔

کنٹرول لائن پر پاکستانی اور بھارتی افواج کے مابین جھڑپیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ خاص طور پر چکونگی سیکٹر آئے دن خبروں کا موضوع بنا رہتا۔ ان دنوں ابھی تک ”آزاد میڈیا“ کی برکات ہم تک نہ پہنچی تھیں لہذا اپنی ٹی وی اور اخبارات کے ذریعے آئے روز مقبوضہ کشمیر میں ہڑتالوں، کرفیو، پتھر اور بھارتی فوج کے مظالم کا ذکر شد و مد سے کیا جاتا۔

سفر نامہ

مئی ۱۹۹۰ء کی تعطیلات موسم گرما میں ہم تینوں اکٹھے ہوئے تو سوچا کہ کیسے ان چھٹیوں کو ہا مقصد تفریح کر کے گزارہ جائے؟ پہلے تو مری اور ناران کاغان جانے کا پروگرام بنا پھر رضوانے یہ تجویز دی کہ کیوں نا آزاد کشمیر جایا جائے؟ ان دنوں بڑے تو اتر کے ساتھ اخبارات و رسائل ’ریڈیو‘ ٹی وی اور خود اردو ڈائجسٹ

ان دنوں کی بات ہے جب میں نے سینٹرل ماڈل اسکول لوز مال لاہور سے میٹرک کے بعد آئی کام کرنے کی خاطر ہاشمی میموریل کالج میں داخلہ لیا۔ میرے دو دوستوں سید محمد رضا اور راشد بٹ نے گورنمنٹ کالج لاہور اور ایف سی کالج کی راہ لی۔ یوں ہماری کئی برس کی رفاقت جدائی میں بدل گئی۔

یادگار لمحے جو مثل جنت مقام پر گزرے

آزاد کشمیر میں پندرہ دن

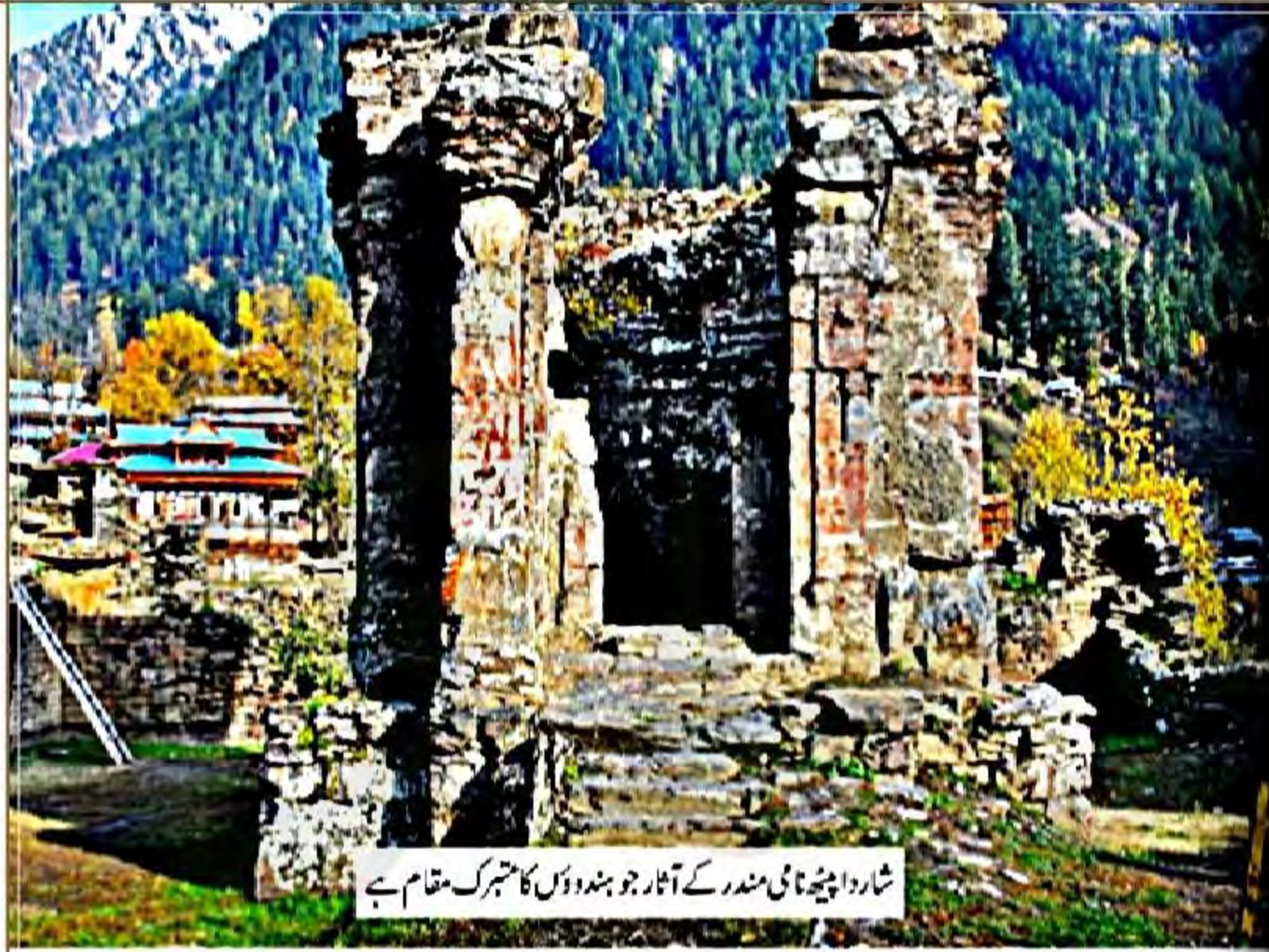
ایک لاہوری نوجوان کے قلم سے کشمیری علاقوں و معاشرت کی دلچسپ جھلکیاں،

جس نے چوبیس برس قبل اس سرسبز و شاداب سرزمین پر سیاحت کرتے ہوئے بھرپور لطف اٹھایا

طیب اعجاز قریشی



کیل میں اشاروں کی زبان میں مخونفٹلو کشمیری



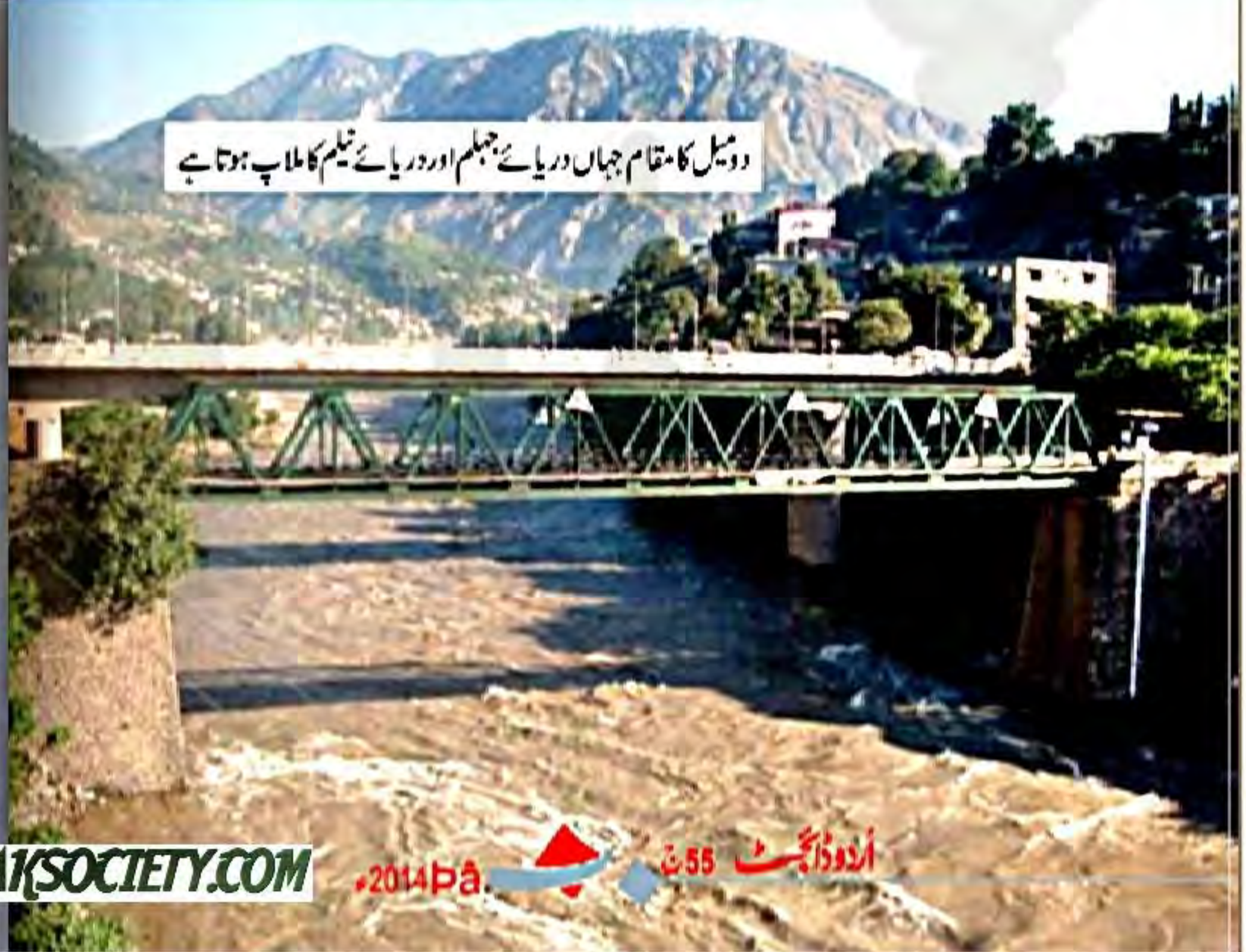
شاردا پیٹھ نامی مندر کے آثار جو ہندوؤں کا تہرک مقام ہے

پیرودھائی بس اسٹینڈ سے فتح جنگ جانے والی بس میں بیٹھ کر کھوڑ پینچے۔ رات ہم نے وہیں قیام کیا۔ اگلے روز جیپ ہمیں راولپنڈی بس اسٹینڈ چھوڑ گئی جہاں سے ہم مظفر آباد جانے والی بس پر سوار ہوئے۔ مری تک کا راستہ تو آرام سے کٹ گیا۔ سڑک اتنی دشوار گزار نہ تھی۔ اب تو خیر ایکسپریس وے بننے کی وجہ سے مری کا سفر نہایت آرام دہ ہو گیا ہے۔

مری کے علاقے 'سٹی بینک' پہنچ کر کچھ دیر آرام کیا۔ پھر کوبالہ کی طرف سفر شروع ہو گیا۔ راستہ انتہائی اعصاب شکن اور مکمل طور پر ڈھلوانی تھا۔ ایک طرف دیوہیکل پہاڑوں کا طویل سلسلہ اور دوسری جانب انتہائی گہری کھائیاں! بس بھی پرانی طرز کی تھی جس نے سفر کو مزید دشوار بنا دیا۔ اس لیے ہم پہ کچھ خوف بھی سوار رہا۔ خیر اللہ اللہ کر کے بخیر و عافیت دریائے جہلم کے پل

کیا کہ کشمیر کا ہمارا سفر یادگار ثابت ہوا۔ ان دنوں میرے بہنوئی اور پھوپھی زاد بھائی فیضان الرحمن ایک آئل کمپنی میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ کھوڑ آئل فیلڈ کے انتظامی معاملات انہی کی زیر نگرانی تھے۔ انگریزوں کے زمانے کی اس آئل فیلڈ میں انیسویں اور ملازمین کے لیے نہایت عمدہ انتظامات کیے گئے تھے۔ اسکول، اسپتال، ملازمین کی رہائش گاہیں اور انیسویں کے لیے ایکڑوں پر محیط ہنگے بڑی بڑی گاڑیاں اور کلب جن میں سونٹنگ پول، ٹینس، اسکواش کورٹس، لائبریری اور سنو کریمسی گیمز اور آسٹینس موجود تھیں۔ ہم بھائی اکثر گرمیوں کی چھٹیوں میں ان کے ہاں جاتے اور خوب پیراکی کیا کرتے۔ اس بار بھی دوستوں کے ہمراہ پہلا قیام کھوڑ ہی میں ہوا۔

لاہور سے بذریعہ فلائنگ کوچ راولپنڈی پہنچے اور پھر



دوبیل کا مقام جہاں دریائے جہلم اور دریائے تیلیم کا ملاپ ہوتا ہے

پر پہنچے۔ اس پل کے ایک طرف پاکستان اور دوسری جانب آزاد کشمیر واقع ہے۔ وہاں سے مظفر آباد جانے کے لیے بس ہائیں طرف مزگنی۔ اب تو خیر مری سے کوبالہ تک سڑک بہت بہتر ہو چکی، مگر ۲۴ سال پہلے نہ صرف یہ خستہ حال تھی بلکہ بسیں بھی بہت کم چلتی تھیں۔ چنانچہ بس میں مسافر زیادہ ہونے کی وجہ سے مجھے دروازے کے ساتھ نصب ایک اسٹول پر بیٹھنا پڑا۔

مظفر آباد میں ہمارا قیام ایم ایل اے ہاسٹل میں تھا۔ مشہور جگہ ہونے کی وجہ سے وہاں پہنچنے میں خاص دقت پیش نہ آئی۔ کمرے انتہائی آرام دہ تھے۔ ہماری راہنمائی کے لیے ایک انفارمیشن آفیسر عندلیب بٹ کی ڈیوٹی لگائی گئی جو چند منٹے قبل ہی تعینات ہوئے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ موصوف کی شادی بھی کچھ عرصہ قبل ہوئی ہے۔

ایم ایل اے ہوسٹل میں ہمارا قیام بطور سرکاری مہمان تھا جس کی وجہ سے ہمیں خاصا پروٹوکول ملا۔ وہیں ہماری ملاقات ایک ترک صحافی 'شیرف' (Sheriff) سے ہوئی جو ترکی کے ایک مشہور روزنامے سے منسلک تھے۔ وہ کشمیری مہاجرین کے حوالے سے اپنے اخبار کے لیے مضمون لکھ رہے تھے۔ ان کی وساطت سے میں پہلی بار ترکی اور ترک تہذیب و ثقافت سے آشنا ہوا۔

کشمیر پہنچنے کے اگلے ہی دن کچھ لوگ ہمیں ملنے آئے۔ انہوں نے ہمیں کشمیری مہاجرین کی مشکلات سے آگاہ کیا۔ ساتھ ہی ساتھ اردو ڈائجسٹ اور محترم الطاف حسن قریشی کی ان کوششوں کو سراہا کہ جن کے ذریعے کشمیری مہاجرین کے مسئلے کو اجاگر کیا گیا۔ اگلے دن ہم مظفر آباد میں واقع مہاجرین کے کیمپ گئے۔ ہماری ملاقات ان مہاجرین سے ہوئی جو عمر کے مختلف ادوار سے

۲۷۲۰ فٹ بلندی پہ بنے اس قصبے کی آبادی کم و بیش بیس ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔

بھارتی فوج اس تحصیل کو اکثر نشانہ بناتی ہے۔ اسی لیے علاقے میں کئی گھر تباہ شدہ بھی نظر آئے۔ ایک جگہ رک کر سیکرٹری صاحب نے زیر تعمیر ایک اسکول کا جائزہ لیا جو نقشے کے بالکل برعکس تعمیر ہوا تھا۔ وہ کافی برہم ہوئے اور ٹھیکیدار کی خوب سرزنش کی۔ راستے میں پھیلیوں کا ایک فارم دیکھا۔ وہاں پھیلیوں کی افزائش کر کے انھیں دریائے جمیلہ میں چھوڑا جاتا تھا۔ یہ فارم پہاڑ پر کچھ اونچائی پہ واقع تھا۔

اندھیری اور پراسرار رات

اب ہماری منزل کیرن گاؤں تھی۔ یہ دیہہ دریائے نیلم کے کنارے پانچ ہزار فٹ بلندی پر واقع ہے۔ دریا کے قریب ہی ایک بلند پہاڑ ہے۔ اس باعث وہاں دن میں بھی اندھیرا چھایا رہتا ہے۔ دریا پار مقبوضہ کشمیر کا علاقہ تھا۔ وہاں آباد ہونے والا گاؤں بھی کیرن کہلاتا ہے۔ کنارہ دریا ہی ریسٹ ہاؤس بنا ہوا ہے۔ وہاں پہاڑ اور دریا کے قرب کی وجہ سے قدرے خشکی محسوس ہوئی۔ دریا کا پاٹ کافی چوڑا تھا۔ سچ دریا میں کچھ درخت لگے دکھائی دیے۔ یہ دریا پاک بھارت سرحد کا کام دیتا ہے۔ کیرن گیٹ ہاؤس کے انچارج نے گرجوٹی سے ہمارا استقبال کیا۔ ہم سب ستانے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ دوسری جانب پہاڑ کی چوٹی پر بھارتی چوکی نظر آ رہی تھی..... گویا ہم اس وقت بھارتیوں کے نشانے کی زد میں تھے۔

رات کو کھانے کے لیے کمرہ طعام پہنچے تو وہ انتہائی مسور کن خوشبو سے مہکا ہوا تھا۔ مہک کا مرکز کمرے سے

بھی ساتھ لے لیا تھا کیونکہ اس نے بھی یہ وادی نہیں دیکھی تھی۔ دونوں کا تعلق لاہور سے تھا اور وہ شادی کے بعد کشمیر منتقل ہوئے تھے۔ چکار پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے تو خاصی خشکی کا احساس ہوا۔ وہاں ہمارے لیے کھانے کا عمدہ انتظام کیا جا چکا تھا۔

وادی نیلم میں آمد

اگلے دن ہم نے وادی نیلم کی سیاحت کا پروگرام بنایا۔ سیکرٹری تعلیم اور ڈائریکٹر انفارمیشن بخاری صاحب بھی ہمارے ہمراہ تھے۔ ایک جیپ میں ہم اور سیکرٹری صاحب سوار ہوئے۔ دوسری میں ڈائریکٹر صاحب اور دیگر صاحبان بیٹھ گئے۔

منظر آباد کے شمال مشرق میں واقع وادی نیلم کمان کی شکل میں دو سو کلومیٹر تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہ وادی کاغان کے پہلو پہ پہلو چلتی ہے۔ تیرہ ہزار فٹ بلند برف پوش پہاڑ دونوں کو جدا کرتے ہیں۔

آزاد کشمیر کے ضلع نیلم کا بیشتر علاقہ اسی وادی پر مشتمل ہے۔ اس ضلع کی دو تحصیلیں ہیں: اٹھمقام اور شاردا۔ وادی نیلم حسین فطری مناظر، فلک بوس پہاڑوں، اٹھیلیاں کرتے جھرنوں، سرسبز جنگلوں، شفاف پانی سے لبریز ندی تالوں اور دریائے نیلم کی وجہ سے سیاحوں کے لیے بڑی پرکشش حیثیت رکھتی ہے۔

منظر آباد سے یہ براہ نیلم روڈ منسلک ہے۔ یہ سڑک کیل تک جاتی ہے۔ منظر آباد سے اٹھمقام تک سڑک پکی ہے پھر کچے راستے کا آغاز ہوتا ہے۔ موسم سرما میں برف باری کے باعث نیلم روڈ اکثر بند ہو جاتی ہے۔

ہم سب سے پہلے اٹھمقام پہنچے جو منظر آباد سے ۸۴ کلومیٹر دور واقع ہے۔ یہ ضلع نیلم کا صدر مقام ہے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو امیبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر ریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں
↩ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



منسلک ہاورچی خانہ تھا۔ محفل کے آداب ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ہم نے سیکرٹری صاحب سے معذرت کی اور ہاورچی خانے میں چلے گئے۔ وہاں لکڑیوں کی آگ پر کھانا پک رہا تھا۔ معلوم ہوا یہ لکڑیوں کے دھوئیں اور پکتے کھانے کی خوشبو تھی جس نے ہمیں وہاں جانے پر مجبور کیا۔

کھانا انتہائی لذیذ تھا۔ بعد ازاں چائے پینے کے دوران سیکرٹری اور ڈائریکٹر صاحب ہمیں رات گئے تک لطیفے اور اپنی زندگی کے ناقابل فراموش واقعات سناتے رہے جو انتہائی دلچسپ اور حیران کن تھے۔ ہمیں بوریٹ کا بالکل احساس نہ ہوا۔

ہمارے پاس دو کمرے تھے جن میں ہم تین دوستوں کو قیام کرنا تھا۔ ہر کمرے میں دو بستر تھے۔ دریا کا سناٹا اور دشمن کی چوکی..... ان تمام عوامل کی وجہ سے یہ فیصلہ نہیں ہو پایا کہ کون تنہا سوائے گا۔ آخر کار میں نے ہمت کا مظاہرہ کیا اور اکیلے سونے کا فیصلہ اس شرط پر کیا کہ میں بتی جلا کے سوؤں گا اور سب میرا مذاق نہیں اڑائیں گے۔

ابھی چند گھنٹے ہی گزرے تھے کہ اچانک بجلی چلی گئی جس سے کمرے کا ماحول پر اسرار ہو گیا۔ میں بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ باہر سے آنے والی درندوں کی آوازوں اور تاریکی نے مجھے خوفزدہ کر دیا۔ مجبوراً اندھیرے میں نارچ لیے رضا اور راشد کے کمرے پر دستک دی۔ چند لمحوں بعد رضائے دروازہ کھولا تو میں نارچ اور گدا ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔ وہ رات ہم تینوں نے ایک ہی کمرے میں گزاری۔

اگلی صبح جب کمرے سے باہر نکلے تو ایک لڑکے اور لڑکی کو دریا کنارے بیٹھے دیکھا۔ ہم نے انہماج گیٹ ہاؤس سے ان کے بارے میں استفسار کیا۔ پتا چلا کہ دونوں کی ابھی شادی ہوئی ہے اور ان کے کافی رشتے دار

مقبوضہ کشمیر میں رہتے ہیں۔ یہ ان کا انتظار کر رہے ہیں کہ شاید دریا پار انہیں کوئی عزیز نظر آجائے اور یہ اسے اپنی شادی کے متعلق بتائیں کیونکہ ان دنوں ٹیلی فون کی سہولت موجود نہ تھی۔ خوش قسمتی سے اسی دن ان کی ”ملاقات“ اپنے رشتہ داروں سے ہو گئی۔ اشاروں کی زبان میں انسان کیا کچھ کہہ سکتا ہے یہ ہمیں اس دن پتا چلا۔

ہماری اگلی منزل: شاردرا

ہم پھر شاردرا کی سمت روانہ ہوئے۔ راستے میں کافی اونچائی پر جا کر ایک بریڈنگ فارم دیکھا۔ وہاں حکومت آزاد کشمیر کے محکمہ جنگلی حیات نے پرندوں کو مصنوعی مگر قدرتی ماحول فراہم کیا ہوا تھا۔ ان کے لیے بڑے بڑے پتھرے بنائے گئے جن میں درخت بھی لگے تھے۔ وہاں ٹیئرٹ بریڈنگ کے بعد پرندوں کو جنگلوں میں چھوڑا جاتا۔ پرندے بیرون ممالک سے منگوائے گئے تھے جو علاقے کی خوبصورتی میں مزید اضافے کا باعث بنتے۔

ہماری واپسی کے بعد اس علاقے میں بھارتی فوج نے شدید گولہ باری کی اور سڑک پر ٹریفک بالکل منفلوج کر دی۔ اس وجہ سے کیرن بائی پاس روڈ بنائی گئی۔ آج کل یہی سڑک زیر استعمال ہے۔

دو دنیاں نامی مقام پہنچنے پر پتا چلا کہ کچھ دیر پہلے مجاہدین کی ایک جماعت وہاں گزری ہے۔ ہم جیب سے اترے اور لائن آف کنٹرول کی طرف چل پڑے تاکہ مجاہدین سے ملاقات کر سکیں۔ پیدل چلنے کا یہ راستہ پہاڑی کے دامن میں واقع تھا۔ پہاڑ چنار کے درختوں سے لدا ہوا تھا۔ دوسری طرف شفاف پانی کا نالہ تھا اور پھر پہاڑ شروع ہو جاتا۔ یہ منظر انتہائی دلکش تھا۔ دور برف پوش پہاڑ نظر آرہے تھے۔

ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت کے بعد جب ہم اپنی منزل پہنچے تو پتا چلا کہ تھوڑی دیر قبل مجاہدین کا قافلہ مزید آگے روانہ ہو چکا۔ مٹی کے مینے میں بھی وہاں اچھی خاصی سردی تھی۔ راستے میں فوجی کیمپ نظر آئے جن کے اردگرد خاردار تاریں نصب تھیں۔ اور ان پر ٹن کے بے شمار خالی ڈبے لگے رہے تھے۔ مدعا یہ تھا کہ اگر دشمن داخل ہونے کی کوشش کرے تو ڈبوں کے شور سے پہریدار ہوشیار ہو جائے۔

شاردرا سے کچھ دور پہلے ایک نالہ آیا جس میں بہتے پانی کی رفتار انتہائی تیز تھی۔ ہم جھپوں سے اتر آئے اور اس پہلے کے ذریعے پیدل نالہ عبور کیا جو درختوں کے دو تے جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ ہمارا ایک ساتھی پہلے سے گزرتے ہوئے نالے میں گرنے سے ہال ہال بچا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر نالہ دریائے جہلم میں ضم ہو رہا تھا جو اس وقت اپنے جوہن پر تھا۔

شاردرا کا قصبہ مظفرآباد سے ۱۳۶ کلومیٹر دور ہے۔ یہ ۶۵۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع اور دریائے نیلم کے کنارے ہی آباد ہے۔ اس وادی کا یہ نام ہندوؤں کی دیوی سرسوتی کے نام پر رکھا گیا جو شاردرا بھی کہلاتی ہے۔ اسی نام کا ایک پہاڑ بھی گاؤں کے نزدیک واقع ہے۔

دراصل ماضی میں شاردرا بدھ مت اور ہندو مت کی مذہبی تعلیم کا بڑا مرکز تھا۔ اسی لیے علاقے میں کئی پرانے مندروں کے آثار موجود تھے۔ ان میں سب سے مشہور ”شاردرا پینچ“ نامی مندر سرسوتی دیوی کے لیے مخصوص تھا۔

مقامی طور پر یہ بھی مشہور ہے کہ شاردرا اور ناردا نامی

پہاڑوں کے نام دو ہندو بہنوں کے ناموں پر رکھے گئے۔ شاردرا آزاد کشمیر میں ہے اور ناردا جموں و کشمیر میں۔ نالے سے لے کر شاردرا تک کا سفر تقریباً تین چار کلومیٹر طویل رہا۔ سڑک دریائے نیلم کے بائیں جانب تھی اور شاردرا دائیں جانب۔ ہوا میں معلق ایک ہل ان کو آپس میں ملاتا رہا تھا جس پر سے لوگ پیدل جا سکتے تھے۔ ہمیں بھی گاڑیاں سڑک ہی پر کھڑی کرنا پڑیں۔ رات کے پچھلے پہر جب پانی کا زور کم ہوا تو گاڑیوں پر سوار ہو کر نالہ عبور کیا گیا۔

شاردرا میں ایک یوتھ ہوٹل واقع تھا جو تب ہمیں بالکل خالی ملا۔ وہاں سامان رکھنے کے بعد ہم علاقے کی سیر کرنے نکل پڑے۔ قریبی پہاڑ کی چوٹی پر بدھ مت کے زمانے کی ایک درگاہ واقع تھی۔ چاروں طرف بدھا کے اشکال پتھروں پر بنی تھی۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے بڑے بڑے پتھروں کی سیڑھیاں بنائی گئی تھیں۔ ہم یہ سوچ کر دنگ رہ گئے کہ اتنے بڑے پتھر آخر وہاں تک کیسے پہنچائے گئے؟ ڈاگرہ راجا کا ایک قلعہ بھی دیکھا جو فلکست درخت کے باعث کھنڈر بن چکا تھا۔ وہیں زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا کہ پانی سے چلنے والی بجلی سے کس طرح آنا چوسا جاتا ہے۔

ہوا میں معلق ہل سے گرد و پیش کا نظارہ بہت خوبصورت تھا۔ اگرچہ وہاں واضح طور پر لکھا تھا کہ تصویر اتارنا منع ہے مگر منظر کی خوبصورتی دیکھتے ہوئے ہم نے ایک تصویر بنوائی تو ڈیوٹی پر متعین گارڈ دوڑتا ہوا آیا۔ اسی اثنا میں قریب کھڑے ساتھی استاد کے بتانے پر کہ یہ سیکرٹری تعلیم کے مہمان ہیں اس نے ہمیں تصویریں بنانے کی اجازت دے دی۔ سنا ہے

آج کل وہاں فوجی چوکی بن چکی مگر علاقے میں پاک فوج موجود نہ تھی۔

ہونے کی وجہ سے ہم آگے نہیں جاسکے۔

☆☆

کیل: سفر کا آخری پڑاؤ

اب ہماری منزل کیل گاؤں تھا۔ منظر آباد سے ۱۵۵ کلومیٹر دور یہ دیہہ ۶۸۷۹ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ لائن آف کنٹرول اس کے بالکل نزدیک ہے۔ علاقے میں جنگلات کی کثرت ہے جہاں ریچھ اور تیندوے بھی گھومتے نظر آتے ہیں۔ موسم سرما میں شدید برف باری کے باعث کیل تک پہنچنا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔

وادئ نیلم میں سفر کرتے جا بجا اتار کے درخت بکثرت نظر آئے۔ اس وقت تو سڑک عمدہ حالت میں نہیں تھی اب سنا ہے کہ وہ پہلے سے بہتر ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ کیل تک سڑک تعمیر کرتے ہوئے راہ میں کئی چھوٹے بڑے گلیشیر بھی آئے۔ پاکستانی ہنرمندوں نے جانفشانی سے گلیشیر اور پہاڑ کاٹ کر راستہ بنا لیا۔ شاعر مشرق نے ایسے دلیر و جری مسلمانوں کے متعلق فرمایا ہے:

یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رانی
شاید یہ اس سفر کے اثرات تھے کہ میرے
دلوں دوست بعد میں پاک فوج میں شامل ہو گئے
اور آج اعلیٰ عہدوں پر فائز مادر وطن کی حفاظت میں
مصروف عمل ہیں۔ وہ دشمن کی مکروہ چالوں کا منہ توڑ
جواب دینے میں اپنا اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔
قارئین سے درخواست ہے کہ اپنے بچوں کو ملک کی
سیر کرائیں تاکہ ان میں وطن سے محبت پر دان
چڑھے اور وہ دشمنوں کے پروپیگنڈہ سے متاثر ہوئے
بغیر اپنی مٹی کی اصل خشو سے لطف اندوز ہو سکیں۔
یقین کیجئے ہمارا وطن بہت خوبصورت ہے اور ہمارے
لوگ بڑی محبت کرنے والے ہیں، ان کی طرف ذرا
قدم تو بڑھائیے۔

آج کل وہاں فوجی چوکی بن چکی مگر علاقے میں پاک فوج موجود نہ تھی۔

کیل: سفر کا آخری پڑاؤ

اب ہماری منزل کیل گاؤں تھا۔ منظر آباد سے ۱۵۵ کلومیٹر دور یہ دیہہ ۶۸۷۹ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ لائن آف کنٹرول اس کے بالکل نزدیک ہے۔ علاقے میں جنگلات کی کثرت ہے جہاں ریچھ اور تیندوے بھی گھومتے نظر آتے ہیں۔ موسم سرما میں شدید برف باری کے باعث کیل تک پہنچنا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔

کیل جاتے ہوئے پاک فوج کے قافلے سے
ہمارا آنا سامنا ہوا۔ فوجی ٹرک موسم سرما کے لیے راشن
لے جا رہے تھے۔ جس جگہ ہمارا ٹاکرا ہوا وہاں سے
صرف ایک گاڑی گزر سکتی تھی۔ چنانچہ ہمیں اپنی
جیبوں میں تقریباً آدھا کلومیٹر پیچھے کرنا پڑا تاکہ ٹرک گزر
سکیں۔ ہم بالکل سڑک کنارے پر تھے اور نیچے میٹق
گہرائی میں دریائے نیلم پھرا سو جیس مار رہا تھا۔

کیل پہنچے تو بھارتی گولہ باری نے ہمارا استقبال
کیا۔ ہم آپس میں بحث کرنے لگے کہ یہ فائر کس
ہتھیار کا ہے؟ رضا کے بقول توپ کا گولہ تھا۔ بعد میں
پتا چلا کہ وہ مارٹر کا فائر تھا۔ وہیں ہم نے ایک اسکول
کا سائنس ڈیپارٹمنٹ دیکھا تو حیران رہ گئے۔ وہ
معیار میں ہمارے اسکول کے شعبہ سائنس سے کسی طور
کم نہ تھا۔ کیل میں اس وقت بھی پاک فوج کافی تعداد
میں موجود تھی۔ آگے ایک ہائیڈل پاور پلانٹ بھی فوج
کے تعاون سے نصب کیا گیا تھا مگر راستہ صاف نہ

ہونے کی وجہ سے ہم آگے نہیں جاسکے۔

☆☆

وادئ نیلم میں سفر کرتے جا بجا اتار کے درخت
بکثرت نظر آئے۔ اس وقت تو سڑک عمدہ حالت میں
نہیں تھی اب سنا ہے کہ وہ پہلے سے بہتر ہے۔ یہ بات
قابل ذکر ہے کہ کیل تک سڑک تعمیر کرتے ہوئے راہ
میں کئی چھوٹے بڑے گلیشیر بھی آئے۔ پاکستانی
ہنرمندوں نے جانفشانی سے گلیشیر اور پہاڑ کاٹ کر
راستہ بنا لیا۔ شاعر مشرق نے ایسے دلیر و جری
مسلمانوں کے متعلق فرمایا ہے:

یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رانی
شاید یہ اس سفر کے اثرات تھے کہ میرے
دلوں دوست بعد میں پاک فوج میں شامل ہو گئے
اور آج اعلیٰ عہدوں پر فائز مادر وطن کی حفاظت میں
مصروف عمل ہیں۔ وہ دشمن کی مکروہ چالوں کا منہ توڑ
جواب دینے میں اپنا اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔
قارئین سے درخواست ہے کہ اپنے بچوں کو ملک کی
سیر کرائیں تاکہ ان میں وطن سے محبت پر دان
چڑھے اور وہ دشمنوں کے پروپیگنڈہ سے متاثر ہوئے
بغیر اپنی مٹی کی اصل خشو سے لطف اندوز ہو سکیں۔
یقین کیجئے ہمارا وطن بہت خوبصورت ہے اور ہمارے
لوگ بڑی محبت کرنے والے ہیں، ان کی طرف ذرا
قدم تو بڑھائیے۔

عرق النسا

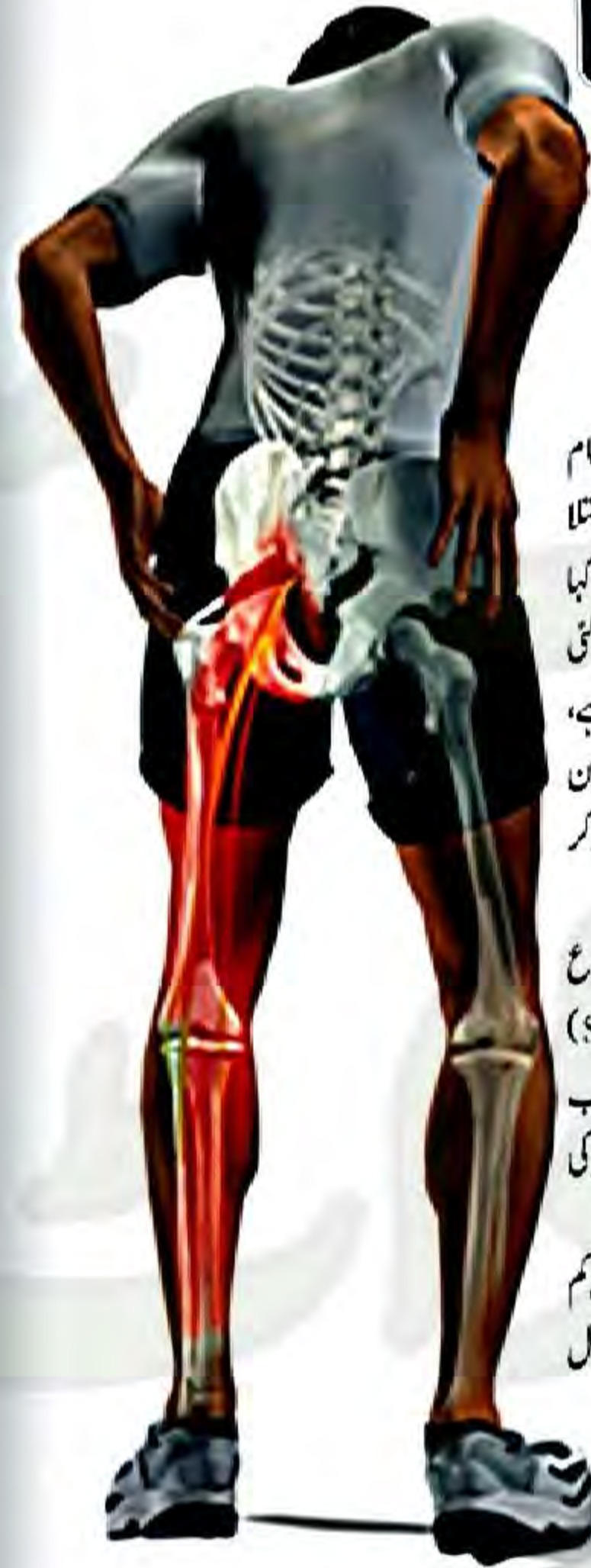
تیس سے پچاس سال کے مرد و زن کو نشانہ بنانے والی انوکھی بیماری

مبانیق

جدید میں شاینا (عرق النسا) کا درد عام دور ہو چکا۔ اس درد میں زیادہ تر خواتین مبتلا ہوتی ہیں، اسی لیے اسے عرق النسا کہا جانے لگا۔ اسی نام کی وجہ سے لوگوں میں یہ غلط فہمی پھیل گئی کہ مرد اس تکلیف میں مبتلا نہیں ہوتے۔ ایسا نہیں ہے، مرد بھی اس درد کا شکار ہوتے ہیں مگر خواتین کی نسبت ان کی تعداد کم ہے۔ یہ درد پیرو (Pelvis) سے شروع ہو کر ٹانگ کے پچھلے حصے سے ہوتا ہوا ٹخنے تک جاتا ہے۔

یہ ایک عصبی درد ہے کیونکہ یہ پیرو سے شروع ہونے والی ایک عصب (Nerve) شاینا (Sciatic) میں جنم لیتا ہے۔ یہ انسانی جسم میں پائی جانے والی سب سے لمبی عصب ہے۔ یہ ریزہ کی ہڈی سے نکل کر پیر کی اڑنی تک جاتی ہے۔

درد عموماً ایک ٹانگ میں ہوتا ہے اور اس کی شدت کم یا زیادہ ہوتی رہتی ہے۔ تکلیف میں مبتلا مریض مسلسل بے چینی کا شکار رہتا ہے۔ بعض اوقات متاثرہ ٹانگ بھاری ہو جاتی ہے اور مریض کے لیے اس پر



بوجھ ڈالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ متاثرہ ٹانگ میں کمزوری محسوس ہوتی ہے۔ اکثر ٹانگ سن ہو جاتی ہے۔ بیٹھنے اور کھڑے رہنے سے بھی درد کی شدت بڑھتی ہے۔

اس درد کا خطرہ عموماً درمیانی عمر میں زیادہ ہوتا ہے۔ امریکن اکیڈمی آف آرٹھوپڈک سرجنز کے مطابق تیس سے پچاس برس کی عمر میں مریض اس کا زیادہ نشانہ بنتے ہیں۔ شاینا کی تکلیف مختلف وجوہ کی بنا پر جنم لیتی ہے۔ لہذا علاج سے قبل تشخیص بے حد ضروری ہے۔

کمر کو شدید جھٹکا گئے، ریزہ کی ہڈی کے مہرے ہل جانے، مہروں کے درمیان خلا کم یا زیادہ ہونے، کولہ کے پتھوں کی سوزش، قبض، زیادہ دیر نمدار جگہ پر بیٹھنے، بہت زیادہ بوجھ اٹھانے، اعصابی تناؤ، مسلسل ایک ہی کراٹ لینے رہنے، غلط طریقوں سے چلنے، بیٹھنے، اٹھنے، کسی حادثے کے باعث، غرض وہ تمام عوامل جو شاینا عصب پر بوجھ ڈالیں اور تناؤ کا باعث بنیں، جب درد بن سکتے ہیں۔ عمر کے ساتھ ہونے والی جسمانی توڑ پھوڑ بھی اس میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔ نیز اونچی اڑنی پہننے والی خواتین، نرم گدوں پر سونے والے اور فرہ لوگ بھی اس درد کا شکار آسانی سے ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کی شاینا عصب پہ مسلسل دباؤ پڑتا رہتا ہے۔

شاینا کا مریض عموماً ٹانگ تھسٹ کر چلتا ہے۔ متاثرہ ٹانگ میں اکثر بل بھی پڑ جاتا ہے اور نسیں اکڑ جاتی ہیں۔ مریض کرسی پر ٹانگ لٹکا کر بیٹھا ہو اور گھٹنے کو دھایا جائے تو اسے ناقابل برداشت درد محسوس ہوتا ہے۔ بھارا ٹانگ کو آسانی سے پیٹ کی طرف موڑ نہیں سکتا کیونکہ کھچاؤ سے مزید تکلیف ہوتی ہے۔ ذرا سی بھی ٹھنڈک درد بڑھا دیتی ہے۔

عرق النسا کے درد میں جس قدر دوا کی ضرورت ہوتی

ہے، اتنا ہی پرہیز اور احتیاط بھی درکار ہے۔ دوا، پرہیز اور احتیاط سے عموماً چھ ماہوں میں مریض صحت یاب ہو جاتا ہے۔ سب سے پہلے تو مریض کو اپنے اٹھنے، بیٹھنے، چلنے اور سونے کے طریقے بدلنے چاہئیں۔ مثال کے طور پر وہ بیٹھنے اور سونے کے دوران اپنی پوزیشن بدلتا رہے۔ زیادہ دیر کھڑے ہونے اور زیادہ دیر بیٹھنے سے گریز کرے۔ سیدھا سوتے وقت ٹکیہ اپنے گھٹنوں کے نیچے رکھے۔ کراٹ لے کر لیٹے تو ٹانگیں ذرا موڑ کر گھٹنوں کے درمیان ٹکیہ رکھ کے سوئے۔ اس سے ریزہ کی ہڈی اور اعصاب پر کم دباؤ پڑتا ہے۔ بیٹھتے وقت کرسی کے پیچھے ٹکیہ اور کٹن وغیرہ رکھے تاکہ کمر کو سہارا ملتا رہے۔

عرق النسا سے چھٹکارا پانے میں غذا کا کردار بہت اہم ہے۔ مریض ایسی غذا کھائے جو غذائیت سے بھرپور ہو اور خصوصاً اسے قبض سے بچائے۔ اس بیماری کے باعث شاینا عصب پر مزید دباؤ پڑتا ہے۔ کیلشیم و وٹامن سے بھرپور غذا اعصاب اور پتھوں کو تقویت بخشتی اور درد سے بچاتی ہے۔ پوٹاشیم بھی پتھوں میں لچک پیدا کرنے میں معاون بنتا ہے۔ چناں چہ دہی، دلیہ، مغزیات، پھل اور تازہ سبزیاں اپنی غذا میں شامل رکھیے۔ گاجر اور چھندر کارس نوش کیجیے۔ یہ شاینا سے جلد نجات دلانے میں مدد کرے گا۔ پانی خوب پیجیے۔ اورک، لہسن، ہلدی کو اپنی غذا میں شامل رکھیے۔ یہ جزی بوٹیاں سوزش کم کر کے درد سے آرام دیتی ہیں۔ تلس، روز میری، بابونہ وغیرہ کی چائے بھی اس مرض میں مفید ہے۔

شاینا کا علاج بس لینے رہنے نہیں بلکہ خود کو متحرک رکھنے میں مضمحل ہے۔ کیونکہ اس سے اعصاب اور پتھوں کو خون اور غذائی اجزا کی فراہمی بہتر طریقے سے ہوتی ہے۔ روزانہ ۲۰ سے ۳۰ منٹ تک پیدل ضرور چلیے۔ ورزش بھی

اسلامی زندگی

تھی۔ میں نے بھی بیٹی کو اپنی ہانہوں میں لے لیا۔ مشروب سے لت پت لمبیدہ چند سیکنڈ بیٹھنے کے بعد واپس اپنی فرشی نشست پر چلی گئی۔ مگر میرا سفید جوزا لمبیدہ کے ہاتھوں بری طرح خراب ہو گیا۔

میں نے پیار بھری سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے اسے کہا "آپ نے میرا جوزا خراب کر دیا۔" یقین چاہیے وہ ڈیڑھ سالہ بچی میری بات سمجھ کر بلاتا خیر اپنے ننھے منے ہاتھوں سے میرے کپڑوں پر لگا مشروب صاف کرنے لگی۔ سفید جوزے نے صاف کیا ہونا تھا، مزید خراب ہو گیا۔ مگر تب باپ بیٹی کی محبت کے ٹھامیں مارتے سمندر کا مظہر دیکھ کر فرشتوں نے بھی ہم پر رشک کیا ہوگا۔

لمبیدہ کا پیار بھرا طرز عمل دیکھ کر کا ایک مجھے چودہ سو سال پہلے کی ایک ننھی عرب بچی کا قصہ یاد آنے لگا۔ جب آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک سمندر رواں ہو گیا۔ زمانہ جاہلیت میں عرب اپنی بچیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت ملی تو یہ رسم ہمیشہ کے لیے



قلب انسان منور کرنے والی

نورِ نبوت کی کرنیں

جنہوں نے بیٹی کو زندہ دفن کرنے والے

شکدل باپ کی کایا پلٹ ڈالی

اور بیٹیوں کو سر کا تاج بنا دیا

عبدالغفار نواب شاہی

سردیوں کی بات ہے، میں مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا اور ادا کر کے حسب معمول گھر پہنچا۔ میرے تمام گھر والے چھپرتے بے چوٹھے کے گرد بیٹھے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ بیٹھ گیا اور موسم سرما کا (ہاجرے کے موٹے آنے سے بنا) مشروب گھونٹ گھونٹ پینے لگا۔ ساتھ ساتھ آگ پر ہاتھ بھی سینٹا رہا۔

چھپلی

میری داہنی طرف کچھ ہی دور ڈیڑھ سالہ میری بیٹی لمبیدہ بھی اس مشروب سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ وہ اس کے پیٹ میں جانے کے بجائے چہرے ہاتھوں اور کپڑوں کی نذر زیادہ ہو رہا تھا۔ جب باپ بیٹی کی نظروں کا تبادلہ ہوا تو دونوں جانب محبت جوش مارنے لگی۔ اگلے لمحے لمبیدہ میری گود میں

نہار منہ لہسن کے دو جوئے گرم دودھ کے ساتھ کھائیے۔ وزن اٹھانے، مشقت والا کام کرنے اور نم آلود اور ٹھنڈی جگہوں پر بیٹھنے سے پرہیز کیجیے۔ سب سے بڑھ کر ذہنی دباؤ اور پریشانی سے خود کو بچائیے تو آپ جلد اس درد سے نجات حاصل کر لیں گے۔

آج اور کل
وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے وہ قوم نہیں لائق ہنگامہ فرما جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے! اہلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام لا کر برہمنوں کو سیاست کے بیچ میں زقاریوں کو دیر کہن سے نکال دو وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا زوج محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو لکڑی عرب کو دے کے فرنگی تحلیلات اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو افغانیوں کی غیرت دیں گا ہے یہ علاج ملتا کو ان کے کوہ و دمن سے نکال دو اہل حرم سے ان کی روایات چھین لو آہو کو مرغزار ٹخن سے نکال دو اقبال کے فلس سے ہے لالے کی آگے تیز ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو! (علامہ محمد اقبال)

آرام دینے میں معاون ہوتی ہے۔ بشرطیکہ ماہر ڈاکٹر یا فزیوتھراپسٹ باقاعدہ تشخیص کے بعد اسے تجویز کرے۔ اس مرض میں غلط ورزش درد بڑھا دیتی ہے۔ لہذا احتیاط بہت ضروری ہے۔ مگر کچھ ورزشیں تمام مریضوں کے لیے مفید ثابت ہوتی ہیں۔ ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ کمر کے بل لیٹ جائیے اور اپنی ہانگیں ٹانگیں سینے تک موڑ کر لائیے اس طرح کہ گھٹنا آپ کے سینے کو چھو لے۔ اب ۱۰ منٹ تھمتی گئیے۔ پھر دوسری ٹانگیں کے ساتھ یہ عمل دہرائیے۔ یہ ورزش دونوں ٹانگیں کے ساتھ تقریباً پانچ بار دہرائیے پھر دونوں ٹانگیں اکٹھی سینے تک لے جائیے۔
۲۔ کمر کے بل لیٹنے اور اپنی ٹانگیں دیوار پر بالکل سیدھی اپنے سامنے اٹھائیے۔ اس حالت میں ۱۵ سیکنڈ تک رہیے۔ یہ ورزش بھی پانچ بار دہرائیے۔ ورزش کے علاوہ سانس کی مشقیں، یوگا، آکوپنچر اور آکو پریشر بھی شیائیکا کے علاج میں معاون ہیں۔ اگر وجہ ایسی ہو جسے آپریشن کے ذریعے دور کیا جاسکے (جیسا کہ مبروں کے درمیان پٹھے دب جانا ڈسک ہرک جانا وغیرہ) تو وہ بھی تجویز کیا جاتا ہے۔ اپنی ڈیورل سٹرائیڈ انجکشن (Epidural Steriod Injection) بھی درد سے نجات پانے میں مفید ہے۔ مگر اس کا اثر چند منٹے یا مہینے تک رہتا ہے۔ مگر یہ ہر ایک پر اثر نہیں کرتا اور اس کے مضر اثرات بھی ہیں۔ مثلاً پنوں اور اعصاب کی کمزوری۔

ماساج یا ماش بھی شیائیکا کا ایک مستند علاج ہے۔ اگر فزیوتھراپسٹ یا کسی ماہر سے کرایا جائے تو چند دن میں درد جاتا رہتا ہے۔ زیتون کے تیل کی ماش بہتر ہے۔ ایک مفید نسخہ یہ ہے کہ سرسوں کے تیل میں چند لہسن کے جوئے جلا لیجیے۔ پھر اس تیل سے ماش کیجیے۔ مزید برآں روزانہ

دن ہوگئی۔ وہ قصہ یہ ہے:

خاتم الانبیاء رحمۃ اللعالمین ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے۔ ایک شخص آ کر کہنے لگا "اے اللہ کے رسول! زمانہ جاہلیت میں ہم جنوں کی عبادت کیا کرتے تھے اور اپنی بیٹیوں کو قتل کر دیتے۔ میری ایک بیٹی تھی۔ وہ بھی جنوں کی عبادت کرنے لگی۔ جب میں اسے بلاتا وہ خوشی خوشی میرے پاس آتی۔ ایک دن میں اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ قریب ایک کنواں تھا وہاں پہنچ کر میں نے اسے پکڑ کر کنوئیں میں ڈال دیا تاکہ اُسے مار سکوں۔ تب وہ چلاتے ہوئے کہہ رہی تھی "اے میرے ابو! اے میرے ابو!"

یہ ماجرا سن کر رحمت اللعالمین ﷺ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا "پھر سناؤ۔" اس شخص نے وہی قصہ سنایا۔ اس بار آپ ﷺ اتنا زیادہ روئے کہ ڈاڑھی مبارک آنسوؤں سے تر ہوگئی۔ قارئین کرام، یہ ذمگی چھپی بات نہیں قبل از اسلام دنیا کی کئی اقوام میں باپ لڑکی کو اپنے لیے موجب عار و ذلت سمجھتے تھے۔ چنانچہ اسے زندہ دفن کر دیا جاتا۔ مگر آج میرے جیسے کروڑوں مسلمانوں بلکہ تمام انسانوں کی گود میں کئی لمبیدائیں نہ صرف جی رہی ہیں بلکہ ان کے وجود کو باعث خوشی و مسرت جانا جاتا ہے۔

ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے "مجھے اللہ پاک نے بیٹی دی ہے۔ میں نے اسے بیت اللہ میں رو رو کر خدا کریم سے مانگا ہے۔"

اس باپ کو یہ حوصلہ کہاں سے ملا؟ ایک بیٹی باپ کے ظالم ہاتھوں سے کنوئیں کی نذر ہوگئی..... دوسری بیٹی پانے کی خاطر باپ کے ہاتھ سایہ بیت اللہ تلے اٹھے رہے۔ پہلی بیٹی کی چیخ پکار بیکار گئی، آج دوسری بیٹی کے

تازہ برداشت کیے جا رہے ہیں۔

اب لمبیدہ کے ہاتھوں لگنے والی آنسوؤں کو محبت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ منہ میں پیار کی گھنٹی ڈالی جاتی اور اُسے گھر کی زینت سمجھا جاتا ہے۔ محبت کے اس بیج کو بوئے ہوئے چودہ سو سال گزر گئے..... مجال ہے ان محبتوں میں ذرا برابر کی آئی ہو۔ اب مسلمان تو مسلمان غیر مسلموں کے ہاں بھی بچیوں نے عزت پالی۔

ایک زمانہ وہ تھا جب روئے ارض پر سنگ دل انسانوں کی کثرت تھی۔ خود غرضی اور تکبر کے مارے یہ انسان اپنے بچوں کو بھی مارنے سے نہ چوکتے۔

آخر کیا بات ہے کہ جب بیٹی کا وجود پار گزرتا تھا اور آج وہ باعث مسرت ہے؟ اُس وقت کی بیٹی کا چلنا پھرنا باپ کی غیرت کو لاکاتا تھا مگر آج باعث رونق و افتخار بن چکا؟

قارئین! ذرا غور فرمائیے ان لمبیدائوں کی قسمت کیسے بدلی محبت کی یہ جہم ریزی کس نے کی؟ دن رات بدلے نہ زمانہ رات کا اندھیرا کم ہوا نہ سورج کی روشنی پھر آخر یہ انقلاب کیسے آیا؟ ننھی بچیوں کو جینے کا حق کس نے دیا؟ ان کی ذوقی ناؤ کو کنارہ اور موت کو زیست کا پروانہ کس نے دیا؟ اپنے سفاک ہاتھ نہیں لمبیدائوں کے ہاتھ حنا سے سرخ زمین کا پیٹ نہیں ماؤں کی گود آباد کنوئیں اور گڑھے نہیں اسکول اور مدارس آباد کرنے کا سبق کس نے دیا؟ کیسے آئی یہ بہار اور کہاں گیا وہ موسم خزاں جس کے اثر سے درختوں کے پتے نہیں معصوم بچیوں کا جسم جھڑتا تھا درختوں کی شاخیں نہیں ماؤں کی گودیں خالی ہوا کرتی تھیں۔ کیسی تھی وہ خزاں جس کی باد مخالف کا نشانہ گلاب و چنبیلی نہیں حوا کی بیٹی ہوا کرتی تھی؟ خانہ خدا کولات و عزنی جیسے ناپاک جنوں سے آباد کیا گیا اور ارض خدا کو حوا کی بیٹی سے محروم.....!

جب دنیا والے انصاف کرنے سے قاصر ہو گئے اللہ جل شانہ نے خاتم الانبیاء، جسے رحمت اللعالمین کو مبعوث فرمایا۔ سیرت و صورت کے پیکر محسن انسانیت ﷺ نے بے حس لوگوں کی مردہ رگوں میں روح پھونکی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آج کی لمبیدہ دل کی حزن کن اور گھر کی زینت بن چکی..... اُسے ماں بیٹی، بہن اور بیوی جیسے عظیم رشتوں کے ساتھ جینے کا حق مل گیا۔ آج لمبیدائیں اپنا سراونچا کیے اپنی خوشی زندگی بسر کرتی۔ اسی سلسلے میں آقائے نامدار حضرت محمد ﷺ کی چند احادیث مع تشریح ملاحظہ فرمائیے۔

لڑکیوں کی پرورش کا ثواب

- 1- حضرت عقبہ بن عامر بیان کرتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا کہ جس شخص نے تین بیٹیوں کی پرورش کی، ان کے لیے دکھ تکلیف پر صبر کیا اور انھیں اپنے مال میں سے کپڑے پہنائے تو یہ لڑکیاں اس کے لیے دوزخ سے آڑ بن جائیں گی۔
- 2- حضرت جابر بن عبد اللہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس کی تین بیٹیاں ہوں۔ ان کو وہ لھکانا دے ان کی کفالت کرے اور ان پر شفقت رکھے تو ضرور اس پہ جنت واجب ہوگی۔ ایک شخص نے عرض کیا "یا رسول اللہ ﷺ اگر کسی کی دو بیٹیاں ہوں۔ اور وہ ان کے ساتھ حسن سلوک کرے تو کیا اس کا بھی یہی درجہ ہے؟" آپ نے فرمایا "دو بیٹیوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا بھی یہی درجہ ہے۔"

بچی صنف نازک سے تعلق رکھتی ہے۔ آج بھی خصوصاً باپ یہ سوچ کر بیٹیاں نہیں چاہتے کہ انھیں پال پوس کر بڑا کر دو مگر وہ پیاد کے دوسرے گھر چلی جاتی ہیں۔ ایسے گھرانے بچیوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے میں کوتاہی برتتے ہیں۔ آج بھی جاہل لوگ لڑکی کو دوسرے

کے گھر کا کوزا کہتے ہیں۔ زمانہ جاہلیت میں تو بچیوں کو عرب زندہ درگور کر دیتے تھے۔ ان باتوں کے پیش نظر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بچیوں کی پرورش کی بہت زیادہ ترغیب دی۔ نیز ان کی پرورش پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑے اجر و ثواب کا وعدہ فرمایا۔

بہنوں کی پرورش کا ثواب

حضرت ابوسعید خدری سے روایت ہے: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "جس کسی کی تین بیٹیاں یا تین بہنیں ہوں اور وہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرے تو (ان کے ساتھ حسن سلوک کی وجہ سے) وہ جنت میں ضرور داخل ہوگا۔"

سابقہ احادیث کے برعکس اس حدیث شریف میں بیٹیوں کے ساتھ بہنوں کا بھی ذکر ہے۔ یعنی ان کے ساتھ بھی اچھا سلوک کیا گیا تو بھائی ضرور جنت میں داخل ہوگا۔ ان احادیث میں رسول اللہ ﷺ نے حسن سلوک کو لڑکیوں کا صرف حق ہی نہیں بتایا بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر داخلہ جنت اور دوزخ سے نجات کا اعلان فرمایا۔ ایک حدیث میں یہ خوش خبری بھی سنائی کہ لڑکیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے والے اہل ایمان قیامت کے دن اس طرح میرے قریب اور بالکل ساتھ ہوں گے جس طرح ایک ہاتھ کی باہم ملی ہوئی پانچوں انگلیاں ہوتی ہیں۔

واپس آئی لڑکی پر خرچ کرنے کی فضیلت

علی بن رہاغ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے سراقہ بن جعشم سے فرمایا: میں تمہیں سب سے بڑا صدقہ نہ بتا دوں؟ انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ضرور ارشاد فرمائیے۔ فرمایا "تیری بیٹی تیرے پاس آ جائے

سنہرے اوراق

سمجھتے ہیں کہ عدل سے کام لیا۔ تاریخ اسلام میں قاضی سوار بن عبداللہ گزرے ہیں۔ علم میں ممتاز اور حق و انصاف کے معاملے میں جری۔

ان کے زمانے میں بصرہ کا کوتوال (آئی جی پولیس) عقبہ بن مسلم الحسنائی اپنے ظلم و ستم کے باعث مشہور تھا۔ اس نے ایک شخص کو جو دریا سے ہیرا نکال کر لایا تھا، گرفتار کیا اور اس سے ہیرا چھین لیا۔ اس شخص کی بیوی نے قاضی بصرہ، سوار بن عبداللہ کو درخواست دی۔ قاضی سوار نے کوتوال سے جواب طلب کیا۔ اس نے قاضی سوار کو برا بھلا کہا کہ کیونکہ کوتوال ہونے کا نشہ جو دماغ پر تھا۔ قاضی سوار نے اسے لکھا

"طاقت کے نشے نے تمہیں ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا ہے۔ تم اب سچ اور جھوٹ



اسلام میں قاضیوں کا کردار بڑا اہمیت کا حامل رہا ہے۔ وہ عدل و انصاف کے تقاضے پورے کرنے میں کسی بڑی شخصیت کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ آج کل کے تو کئی بیج حاکم وقت کا اشارہ پاتے ہی حق و انصاف کا خون کرتے اور

جب گورنر کو قانون کے سامنے سر جھکانا پڑا

اسلامی عدل و انصاف کے بے مثال واقعات

محمود احمد ظفر

بیٹے! یہ تم نے کیا کیا؟

فارسی مشہور "رموز بے خودی" میں حضرت علامہ محمد اقبال نے اپنے بچپن کا ایک اہم واقعہ لکھا ہے۔ ایک ضعیف فقیر دروازے پر بار بار صدا لگا رہا تھا اور کسی صورت ٹلنے کا نام نہ لیتا۔ ان کو جو غصہ آیا تو اس کے سر پر ایک ڈنڈا رسید کر دیا۔ فقیر لڑکھڑایا اور اس کی جھولی میں جو کچھ تھا، وہ نیچے گر پڑا۔ والد شیخ نور محمد نے جب یہ دیکھا تو تڑپ اٹھے اور سخت آزرده ہوئے۔

شیخ نور محمد: یہ تم نے کیا کیا؟

اقبال: یہ یہاں سے ملتا کیوں نہیں تھا؟
شیخ نور محمد: بیٹے! کل آنحضرت ﷺ کی امت میدان حشر میں جمع ہوگی اس میں ملت بیضا کے غازی، عالم، شہید، زاہد، عاشق، گنہگار سب ہی شامل ہوں گے تو اس مظلوم فقیر کے نالے بلند ہوں گے۔ بیٹے! جب تیرے لیے مرکب کے بغیر راستہ چلنا مشکل ہوگا اس وقت حضور مجھے کہیں گے، اللہ نے ایک مسلمان بچہ تیرے سپرد کیا تھا کہ تو اسے صحیح تعلیم و تربیت دے۔ لیکن اس بچہ نے میرے دین سے کوئی استفادہ نہ کیا اور تو ایک کام بھی نہ کر سکا یعنی تو مٹی سے بنے ہوئے پتلے کو آدمیت کا سبق نہ دے سکا۔ تب میں اس کا کیا جواب دوں گا؟

بیٹے! ذرا خیال کر کہ امت خیر البشر کے اجتماع کے سامنے میری کیا حالت ہوگی۔ خدا کے لیے میری سفید ریش کالی نہ کر، میری امید و بیم کی کیفیت کا خیال کر، اپنے باپ پر اتنے ستم نہ ڈھا اور آقائے کائنات کے سامنے اس بندہ عاجز کو رسوا نہ کر۔
(مکالمات اقبال، پروفیسر سعید راشد (علیگ))

طلاق کے بعد یا شوہر کی وفات کے بعد اور تیرے علاوہ کوئی کمائی کرنے والا نہ ہو تب تو نے اس مجبور اور محتاج پر خرچ کیا تو یہ سب سے بڑا صدقہ ہوگا۔

لڑکی کے لوٹ آنے سے مراد یہ ہے کہ خاوند چل بے، اسے طلاق ہو جائے یا کوئی اور ایسا عارضہ پیش آئے جس کی وجہ سے لڑکی واپس آئے۔ تب اس پر خرچ کرنا افضل ترین صدقہ ہوگا۔

یہ افضل اس لیے ہے کہ اول یہ صدقہ ہے دوسرے مصیبت زدہ کی امداد ہے تیسرے اس میں صلہ رحمی ہے۔ چوتھے اولاد کی خبر گیری ہے اور پانچویں غم زدہ کی دلداری ہے۔ اور سب سے بڑھ کر حضور ﷺ کی حدیث میں ایسا کرنے کا حکم ہوا ہے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ اعمال ہیں۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص کسی مصیبت زدہ کی فریاد رسی کرے، اس کے لیے مغفرت کے بہتر درجے لکھے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک میں اس کے تمام امور کی اصلاح و درستی ہے اور بہتر درجے قیامت میں اس کی ترقی کا سبب ہیں۔ دوسری روایت میں ہے کہ ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ نے حضور ﷺ سے دریافت کیا کہ میرے پہلے خاوند ابو سلمہ کی جو اولاد میرے پاس ہے ان پر خرچ کرنے کا کیا مجھے ثواب ملے گا؟ وہ تو میری ہی اولاد ہیں۔

حضور ﷺ نے فرمایا "ان پر خرچ کیا کرو اس کا تمہیں ثواب ملے گا۔"

یہ ہیں وہ نور نبوت کی کرنیں جن کی شعاعوں سے انسان کا قلب منور ہوا۔ جنہوں نے انسان کو انسانیت سکھائی اور لاکھوں ہمیداؤں کو جینے کا حق دے ڈالا:

(مضمون نگار کوثر گنی کراچی کی جامعہ دارالعلوم سے بطور استاد وابستہ ہیں)

کے مابین تمیز نہیں کر سکتے۔ تم سیدھی راہ پر نہیں آئے، تو خلیفہ کو سارے حالات لکھ بھیجوں گا۔"

بادشاہ تک معاملہ پہنچنے کا سن کر کوتوال کے حواس ٹھکانے پر آئے۔ اس نے نہ صرف شہری کو رہا کیا بلکہ ہیرا بھی اسے واپس کر دیا۔

انہی قاضی سوار کا ایک اور واقعہ ہے کہ ایک بار مشہور عباسی خلیفہ، ابو جعفر منصور کے دربار میں تشریف لائے اور کہا "السلام و علیکم یا امیر المؤمنین ورحمتہ وبرکاتہ۔"

خلیفہ نے جواب دیا "علیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ، ابو عبد اللہ! اقرب آؤ۔"

انہوں نے کہا: "امیر المؤمنین اسلف کے طریق پر قریب آؤں یا آج کل رائج طریقے پر؟"

خلیفہ نے کہا: "نہیں، سلف کے طریقے پر۔"

قاضی سوار رحمہ اللہ آگے بڑھے اور اپنی جگہ بیٹھ گئے..... ابو جعفر کا انہوں نے ہاتھ نہیں چوما۔ اسی وقت ابو جعفر کو چینک آگئی۔ اس نے الحمد للہ نہیں

کہا۔ قاضی صاحب نے یرحمک اللہ کہہ کر جواب نہ دیا۔ خلیفہ کو دوبارہ چینک آئی۔ اب اس نے

"الحمد للہ" کہا تو انہوں نے "یرحمک اللہ" کہہ دیا۔ جب قاضی مجلس سے اٹھ کر چلے گئے تو منصور انہیں

دیکھتا رہا اور ان کے جانے کے بعد کہا:

"اتزعمون ان هذا يحاسبني؟ واللہ! ما حاسبني في عطسته۔" (کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ

کسی معاملے میں جانب داری کریں گے جب کہ یہ چینک میں بھی میری رعایت نہیں کر سکے؟) (اخبار القضاة ج ۲ ص ۸۸)

☆☆

ایک دفعہ خلیفہ ابو جعفر منصور نے قاضی سوار کو کسی

معاملے میں حکم لکھ کر بھیجا۔ قاضی صاحب نے پڑھا تو وہ حق و انصاف کے یک قلم خلاف تھا۔ انہوں نے حکم نافذ کرنے سے انکار کر دیا۔ خلیفہ بڑا ناراض ہوا اور انہیں قاضی کے عہدے سے فارغ کرنا چاہا۔ مگر

دربار یوں نے کہا "قاضی سوار رحمہ اللہ کا عدل و انصاف اور حق پرستی آپ کی خلافت کے باعث زینت ہے۔" یہ سن کر خلیفہ خاموش ہو گیا۔ (اخبار القضاة ج ۲ ص ۶۰)

باغ کا قضیہ

اس دور کے جری قاضی آج جنم لے لیں تو لوگوں کو حصول انصاف میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ زمانہ قدیم کی اسلامی حکومتوں میں قاضی کی خاص حیثیت تھی۔ وہ انتہائی عزت و احترام کا مستحق سمجھا جاتا۔ قاضیوں نے انتظامیہ کے خلاف فیصلے کرنے میں کوئی پس و پیش نہ کی۔ چنانچہ کتابوں میں مرقوم ہے کہ کوفہ میں عدالت کا اہلاس ہو رہا تھا۔ قاضی شریک بن عبد اللہ مقدمات کی سماعت کر رہے تھے۔ باہر لوگوں کا ہجوم تھا جن کے مقدمات کی شنوائی عدالت میں ابھی ہونی تھی۔ اس ہجوم میں ایک بڑھیا بھی کھڑی تھی جس کے چہرے سے لگر و ملال نپک رہا تھا۔ ضعف و مسکت کے آثار بھی نمایاں تھے۔

جب وہ اپنی باری پر قاضی کے حضور پیش ہوئی تو انہوں نے پوچھا "بی بی کیا معاملہ ہے؟"

اس نے بھرائی آواز اور نمناک آنکھوں سے کہا "حکومت وقت نے مجھ پر ظلم کیا ہے۔ میں اس کی فریاد لیے آپ کے پاس آئی ہوں۔"

قاضی صاحب نے تفصیل پوچھی تو اس نے بتایا

"دو پائے فرات کے کنارے میرا کھجور کا ایک باغ تھا جو ہمیں ورثے میں ملا۔ میرے والد فوت ہوئے، تو بھائیوں نے اسے تقسیم کر دیا۔ میں نے اپنے حصے کو دیوار بنا کر علیحدہ کیا اور باغ کی نگرانی و حفاظت کے لیے ایک ملازم رکھ لیا۔ کچھ عرصہ بعد گورنر کوفہ، موسیٰ نے میرے بھائیوں کے حصے خریدے، تو میرے باغ پر حریصانہ نظریں گاڑ دیں۔ چنانچہ اس نے مجھے بر ملا باغ فروخت کرنے کا کہا، لیکن میں نے انکار کر دیا۔ ایک روز گورنر موسیٰ چند نو جوانوں کے ساتھ آیا اور میری تعمیر کردہ دیوار گرا دی۔"

یہ واقعہ بیان کر کے اس پریشان عورت نے کہا "اے قاضی! میں اب تیرے پاس اپنا حق لینے آئی ہوں۔ میں عدالت کے کئہرے میں کھڑے ہو کر یہ اعلان کرتی ہوں کہ اپنا باغ گورنر موسیٰ کے ہاتھ ہرگز فروخت نہیں کروں گی۔"

قاضی شریک بن عبد اللہ نے یہ واقعہ بڑے غور سے سنا۔ جونہی بڑھیا نے بات ختم کی تو قاضی نے لہجہ بھر کے لیے سر جھکایا پھر آواز دی: "خادم!" جب وہ حاضر ہوا تو قاضی نے ایک سمن پر اپنی مہر لگا کر اسے دی اور کہا کہ گورنر موسیٰ کو ساتھ لے کر آؤ۔ خادم جب عدالت کا سمن لیے گورنر کے گھر پہنچا اور اسے ساتھ چلنے کو کہا تو وہ لال پیلا ہو گیا۔ غصے کے باعث آنکھوں سے چنگاریاں جھرنے لگیں۔

اس نے اسی وقت کوتوال شہر کو بلایا اور حکم دیا "نوراً قاضی شریک کے پاس جاؤ اور انہیں میری طرف سے کہو کہ تم بھی عجیب آدمی ہو، ایک بڑھیا کا جھوٹا دعویٰ تم نے تسلیم کر لیا۔ اب مجھے اس دوش بدوش

کھڑا کرنے عدالت بلا رہے ہو۔ تمہیں میرے منصب کا کچھ تو لحاظ ہونا چاہیے۔"

وہ کوتوال قاضی شریک کے مزاج سے بخوبی آشنا تھا۔ اس نے عرض کی کہ آپ میری جگہ کسی اور شخص کو بھیج دیجیے لیکن گورنر نہ مانا۔ ناچار اسے جانا پڑا۔ کوتوال نے قاضی شریک کی عدالت میں حاضر ہو کر گورنر کا پیغام دیا۔ قاضی نے اسی وقت سپاہی کو بلا کر حکم دیا کہ اسے پکڑ کر جیل میں ڈال دو۔

گورنر کو جب پتا چلا کہ قاضی نے کوتوال کو جیل بھیج دیا ہے تو وہ اور سب پا ہوا۔ اب اس نے اپنا حاجب (نائب) قاضی کے پاس بھیجا۔ اس نے کہا: "قاضی صاحب! کوتوال تو صرف گورنر کا پیغام لے کر آیا تھا لیکن آپ نے اسے جیل بھیج دیا۔" قاضی نے اسی وقت سپاہی کو آواز دی۔ جب وہ آیا تو کہا "اس صاحب کو بھی کوتوال کے ساتھ جیل میں بند کر دو۔"

جب گورنر کو پتا چلا کہ قاضی شریک نے حاجب کو بھی جیل بھیج دیا تو زخمی سانپ کی طرح تڑپنے لگا۔ اس کی حالت دیدنی تھی۔ لیکن اسے رہائی کی کوئی صورت بھی نظر نہ آئی۔ آخر اس نے معززین شہر کو بلایا جن میں کئی لوگ قاضی شریک کے دوست احباب بھی تھے اور انہیں کہا "آپ قاضی کے پاس جائیے اور انہیں بتائیے کہ آپ نے میری توجہ کی ہے۔ میں کوئی عام شہری نہیں کہ عدالتوں میں حاضری دیتا پھروں۔ پھر انہوں نے میرے پیغام بروں کو بھی جیل میں ڈال دیا۔"

معززین کوفہ اور قاضی شریک کے دوستوں نے انہیں گورنر کا پیغام پہنچایا۔ قاضی صاحب کو غصہ آ گیا۔ انہوں نے حضرات سے مخاطب ہو کر کہا: "تم لوگ مجھے

کھڑا کرنے عدالت بلا رہے ہو۔ تمہیں میرے منصب کا کچھ تو لحاظ ہونا چاہیے۔"

وہ کوتوال قاضی شریک کے مزاج سے بخوبی آشنا تھا۔ اس نے عرض کی کہ آپ میری جگہ کسی اور شخص کو بھیج دیجیے لیکن گورنر نہ مانا۔ ناچار اسے جانا پڑا۔ کوتوال نے قاضی شریک کی عدالت میں حاضر ہو کر گورنر کا پیغام دیا۔ قاضی نے اسی وقت سپاہی کو بلا کر حکم دیا کہ اسے پکڑ کر جیل میں ڈال دو۔

گورنر کو جب پتا چلا کہ قاضی نے کوتوال کو جیل بھیج دیا ہے تو وہ اور سب پا ہوا۔ اب اس نے اپنا حاجب (نائب) قاضی کے پاس بھیجا۔ اس نے کہا: "قاضی صاحب! کوتوال تو صرف گورنر کا پیغام لے کر آیا تھا لیکن آپ نے اسے جیل بھیج دیا۔" قاضی نے اسی وقت سپاہی کو آواز دی۔ جب وہ آیا تو کہا "اس صاحب کو بھی کوتوال کے ساتھ جیل میں بند کر دو۔"

جب گورنر کو پتا چلا کہ قاضی شریک نے حاجب کو بھی جیل بھیج دیا تو زخمی سانپ کی طرح تڑپنے لگا۔ اس کی حالت دیدنی تھی۔ لیکن اسے رہائی کی کوئی صورت بھی نظر نہ آئی۔ آخر اس نے معززین شہر کو بلایا جن میں کئی لوگ قاضی شریک کے دوست احباب بھی تھے اور انہیں بتائیے کہ آپ نے میری توجہ کی ہے۔ میں کوئی عام شہری نہیں کہ عدالتوں میں حاضری دیتا پھروں۔ پھر انہوں نے میرے پیغام بروں کو بھی جیل میں ڈال دیا۔"

معززین کوفہ اور قاضی شریک کے دوستوں نے انہیں گورنر کا پیغام پہنچایا۔ قاضی صاحب کو غصہ آ گیا۔ انہوں نے حضرات سے مخاطب ہو کر کہا: "تم لوگ مجھے

اسلامی تاریخ

سے زیادہ نہ تھی۔ چودھویں صدی عیسوی میں اناطولیہ میں قائم عثمانی ترکوں کی پہلی سلطنت کا دارالسلطنت بننے کے بعد اسے بروصہ کہا گیا۔ لیکن یہ اعزاز اس شہر کو زیادہ عرصہ حاصل نہ رہا۔ یورپی علاقوں پر قبضہ کر لینے کے بعد دارالسلطنت کو بھی یورپ کی جانب واقع "اورنہ" شہر منتقل کر دیا گیا۔ بعد ازاں قسطنطنیہ کی فتح کے بعد اگلی پانچ صدیوں کے لیے اسی کو پہلے اسلامبول اور پھر استنبول کا نام دے کر رونق بخشی گئی۔

بروصہ ترکوں کے ماضی بعید کا امین ہے۔ ترکان عثمانیہ کے پہلے امیر، غازی عثمان کا مقبرہ وہیں واقع ہے۔ شہر کی مشہور مسجد، علوجامع یعنی مسجد اکبر چودھویں صدی عیسویں کے آخر میں تعمیر کی گئی۔ گویا اس کی تعمیر کو چھ سو سال بیت چکے۔

"علوجامع" کی چھت بیس گنبدوں سے مل کر بنی ہے۔ تقریباً وسط میں واقع ایک گنبد کی جگہ کچھ عرصہ خالی رہی۔ پھر اس پر شیشے سے اسی شکل کا گنبد بنا دیا گیا جس میں سے دھوپ گزر کر مسجد کے ہال کو اضافی روشنی بہم پہنچاتی ہے۔ شیشے کے اس گنبد کے نیچے ایک فوارہ اور برائے وضو ایک حوض واقع ہے۔ اس نے پورے زمینی رقبے کو اس طرح گھیر رکھا ہے کہ

ترکی کا شہر، بروصہ قدیم شہر ہے۔ اس کی بنیاد دوسری صدی قبل مسیح میں "پروسیا" نامی ایک بادشاہ نے رکھی تھی۔ اس کے نام کی مناسبت سے اسے "پروصہ" کہا جانے لگا۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ بروصہ کہلایا اور پھر بروصہ بھی کہلانے لگا۔ لیکن اس کی حیثیت طویل عرصہ عام شہر

ایک مسلمان بادشاہ کے نام

عیسائی بڑھیا کی وصیت

مسلم حکمرانوں کا بے مثال عدل

اجاگر کرتا سبق آموز واقعہ

غزالہ عزیز



کے پاس جا رہے ہیں، تو اب وہ گھبرایا۔ چناں چہ اس نے فوراً فوجی دستہ ساتھ لیا، قاضی کو بغداد کے راستہ میں جا لیا اور لگا مت سماجت کرنے۔ عرض کی "آپ واپس تشریف لے چلیے اور اپنے فرائض ادا کیجیے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ جو کچھ آپ چاہیں، وہی ہوگا۔"

قاضی نے کہا "جب تک وہ سب لوگ جیل نہیں جاتے جو کل تو نے رہا کرائے ہیں، میں ہرگز واپس نہیں جاؤں گا۔ ورنہ امیر المومنین کے دربار میں پہنچ کر جو بوجھ انھوں نے میرے کندھوں پر لا رکھا ہے، ان کی خدمت میں رکھ دوں گا۔"

گورنر موسیٰ نے فوراً شرط مان لی اور ان سب لوگوں کو فوری طور پر جیل بھجوا دیا۔ اب قاضی صاحب نے خدام سے فرمایا کہ گورنر کی سواری کی لگام پکڑ کر انھیں میری عدالت میں حاضر کرو۔ گورنر پھر کی عدالت میں مظلوم بڑھیا کے ساتھ کھڑا کیا گیا۔ قاضی نے اس عورت سے کہا: "بی بی! فریق ثانی حاضر ہے، جو کچھ کہنا ہے، بے خوف ہو کر کہو۔"

عورت نے تمام داستان دہرائی۔ اب قاضی نے گورنر سے پوچھا: "اس خاتون نے جو دعویٰ دائر کیا ہے، اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

گورنر نے جواب دیا: "یہ بالکل درست کہتی ہے۔" قاضی نے کہا "جو دیوار آپ نے گرائی ویسی ہی نئی دیوار فوراً بنوادھیجیے۔"

چناں چہ حکم کی تعمیل کی گئی۔ بڑھیا قاضی کو دعائیں دیتی چلی گئی۔ یوں قاضی شریک بن عبداللہ نے حق و انصاف کی تاریخ میں ایک روشن باب کا اضافہ کر دیا۔

ایسی بات کہنے آئے ہو جسے کہنے کا تمہیں کوئی حق حاصل نہیں۔" پھر انھوں نے خدام کو آواز دی اور کہا "ان سب کو پکڑ کر جیل میں ڈال دو۔"

انھوں نے حیرانی سے پوچھا کہ آخر ہمارا جرم کیا ہے؟ قاضی نے جواب دیا "تم لوگ فتنہ ہو۔ حق کی راہ میں مزاحم اور قوانین شریعت کے نفاذ میں رکاوٹ بن رہے ہو۔ تمہاری سزا قید ہی ہے تاکہ تم آئندہ کسی ظالم کے پیغام برد نہ بن سکو۔"

گورنر موسیٰ کو جب قاضی شریک کے اس حکم کا پتا چلا تو وہ غصہ سے لال بھبھوکا ہو گیا۔ فوراً اپنا گھڑسوار دستہ لیے جیل خانہ پہنچا اور اپنے ان تمام ساتھیوں کو رہا کر دیا جنھیں قاضی نے جیل میں قید کیا تھا۔ اگلے روز صبح قاضی صاحب عدالت لگائے بیٹھے تھے کہ داروغہ جیل حاضر ہوا اور گزشتہ روز کی ساری روداد گوش گزار کر دی۔ بتایا کہ گورنر موسیٰ نے ان سب قیدیوں کو رہا کر لیا جنھیں آپ نے جیل بھجوا یا تھا۔

قاضی صاحب نے جونہی یہ سنا فوراً کھڑے ہوئے۔ عدالت درخواست کر دی اور گھر پہنچے۔ غلام سے کہا "میرا سامان گھر پہنچا دو۔"

غلام نے پوچھا "کیا جناب منصب عدالت چھوڑ دینا چاہتے ہیں؟"

قاضی نے جواب دیا: "بخدا امیر المومنین نے زبردستی یہ منصب اس شرط پر ہمارے سپرد کیا تھا کہ وہ یا ان کا کوئی اہلکار عدالت کے کام میں مداخلت نہیں کرے گا۔ آج یہ مداخلت ہو چکی، لہذا یہ منصب انھیں لوٹانے جا رہا ہوں۔"

گورنر موسیٰ کو جب یہ خبر ملی کہ قاضی شریک رحمہ اللہ نے استعفیٰ دے دیا ہے اور وہ بغداد خلیفہ

محرم الحرام

جگر گوشہ رسول ﷺ

فاطمہؓ کے لعل

نواسہ رسول ﷺ کی حیات مبارکہ
کے یادگار اور سبق آموز پہلو

عمر ابو النضر

جب نبی کریم ﷺ مدینہ منورہ میں مقیم تھے، حضرت حسینؓ شعبان ۳ھ بمطابق جنوری ۶۲۶ء میں وہیں پیدا ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے حسینؓ نام رکھا۔ آپ کی وفات کے وقت حضرت حسینؓ کی عمر سات سال، سات مہینے اور سات دن تھی۔ اس لیے انھیں رسول اللہ ﷺ کی صحبت سے اتنا فیض حاصل کرنے کا موقع نہ ملا جتنا ان کے والد، حضرت علیؓ کو ملا تھا۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ حسن و



شاگرد نوکر

مولوی میر حسن کے صاحبزادے ذکی شاہ راوی ہیں، ایک دفعہ حضرت علامہ محمد اقبال ہمارے گھر کے لیے سودا سلف لے کر بازار سے لوٹے تو مولوی صاحب دروازے پر کھڑے کسی سے باتیں کر رہے تھے۔ حسن: اقبال! میں نے تمہیں کتنی دفعہ کہا ہے کہ بازار سے ہمارا سودا نہ لایا کرو۔

اقبال: کیوں جناب، میرا قصور؟

میر حسن: تم میرے شاگرد ہو، نوکر نہیں۔

اقبال: جناب! میں آپ کا شاگرد نوکر ہوں۔

(مکالمات اقبال۔ (نقاب: الطیب جان، واہ کینٹ)

یعنی اس پر وہ چھت نہ ہو جو مسجد کے دوسرے حصوں پر موجود ہے اور نہ کوئی شخص میری زمین پر نماز پڑھے گا۔“ بڑھیا کی تدفین کے بعد اس کی وصیت دربار تک پہنچا دی گئی۔ سلطان نے اس پر حرف بہ حرف عمل درآمد کا حکم دیا۔ اور وہ حکم آج جیسے سو برس بعد بھی برقرار چلا آ رہا ہے۔

چنانچہ عیسائی بڑھیا کی متروکہ زمین پر وضو تو کیا جا سکتا ہے، لیکن کوشش کے باوجود کوئی شخص وہاں نماز پڑھنے کی جگہ نہیں بنا سکتا۔

یہ واقعہ عیاں کرتا ہے کہ مسلمان حکمران اپنی کمزور اور بے اختیار غیر مسلم رعایا کے ساتھ کیے گئے عہد کی پاسداری کرتے اور انھیں پورا انصاف دیتے تھے۔ یہ شاہی انصاف کی درخشاں مثال ہے۔ ایسی بے شمار مثالیں اسلامی تاریخ کا حصہ ہیں جو آج بزم خود تہذیب اور انسانی حقوق کی رکھوالی کرنے والے مغربی ممالک کے لیے طمانچے سے کم نہیں۔

وہاں نماز ادا کرنے کی گنجائش بالکل نہیں رہتی۔ اس گنبد کی تعمیر کا مصدقہ قصہ بڑا دلچسپ ہے۔

”علو جامع“ کی تعمیر فاتح قسطنطنیہ، سلطان محمد ثانی کے والد سلطان مراد ثانی کے زمانے میں ہوئی۔ تب وہ اناطولیہ کی چھوٹی سی عثمانی سلطنت پر بروصہ سے حکومت کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنے دارالحکومت میں تاریخی مسجد اور اس سے ملحق تعلیمی اور فلاحی عمارت بنوانے کے لیے یہ قطعہ زمین پسند کیا۔ تب اس پر رعایا میں سے کچھ لوگوں کے گھر واقع تھے۔ سلطان نے ان سے گھر اور قطعہ منہ مانگی قیمتوں پر خرید کر انھیں خوش حال کر دیا۔

لیکن ایک لاوارث عیسائی بڑھیا از گنی۔ وہ اپنی کنیا اور تھوڑی سی زمین بڑی سے بڑی قیمت پر بھی فروخت کرنے کو تیار نہ ہوئی۔ یہ زمین شاہی ماہرین تعمیرات کے نقشے کی رو سے عین وسط مسجد میں آتی تھی۔ بڑھیا کو بالآخر بے دخل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ تھک ہار کر بڑھیا کو اس کے حال پر چھوڑ چاروں طرف سے تعمیر کا کام شروع کر دیا گیا۔

رفتہ رفتہ مسجد تعمیر ہونے لگی۔ یہاں تک کہ تقریباً مکمل ہو گئی۔ مگر بڑھیا کے قطع زمین میں کوئی تعمیر نہ کی گئی۔ اتنے میں بڑھیا پر وہ وقت آ گیا جو ہر انسان پر آ کر رہتا ہے اور کسی کے نالے سے نہیں مالا جا سکتا۔

قریب المرگ بڑھیا نے اپنے پادری اور ہستی کے معتبر عیسائی شہریوں کو بلا کر آخری بات یہ کہی ”میرے بعد یہ جگہ لاوارث ہونے کی وجہ سے حکومت کے قبضہ میں چلی جائے گی۔ لیکن سلطان تک میری یہ آخری خواہش ضرور پھنچا دی جائے۔ یہ کہ میری زمین کو مسجد میں شامل کر کے بھی اسے اس کا حصہ نہ بنایا جائے..... اور اس پر سورج کی روشنی کسی رکاوٹ کے بغیر پہنچتی رہے۔“

حسین سے بہت محبت کرتے تھے اور انہیں دیکھنے کے لیے روزانہ حضرت فاطمہؑ کے گھر تشریف لے جایا کرتے۔ انہیں بلا کر پیار کرتے اور کھانا کھلاتے۔

ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ حضرت فاطمہؑ کے گھر کے قریب سے گزرے۔ آپ نے حضرت حسینؑ کے رونے کی آواز سنی۔ آپ گھر کے اندر تشریف لائے اور بیٹی سے فرمایا "کیا تمہیں معلوم نہیں کہ مجھے اس کے رونے سے تکلیف پہنچتی ہے؟"

اسامہ بن زید کہتے ہیں "میں کسی ضرورت کے لیے رات کے وقت رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ کوئی چیز چادر میں چھپائے ہوئے باہر تشریف لائے۔ جب میں اپنی بات پوری کر چکا تو میں نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ آپ چادر میں کیا چھپائے ہوئے ہیں؟"

"آپ نے چادر ہٹائی تو اس کے نیچے حسن اور حسین ظاہر ہوئے۔ آپ نے فرمایا "یہ دونوں میرے بیٹے اور میری لڑکی کے لڑکے ہیں۔ اے اللہ! میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں تو بھی ان دونوں سے اور ان سے محبت کرنے والوں سے محبت فرما۔"

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ حضرت حسن اور حضرت حسینؑ مسجد میں داخل ہوئے۔ وہ دونوں سرخ رنگ کے کرتے پہنے ہوئے تھے اور صغریٰ کی وجہ سے چلتے ہوئے لڑکھڑا رہے تھے۔

رسول اللہ ﷺ یہ دیکھ کر منبر پر سے اترے۔ ان دونوں کو گود میں لے کر اپنے پاس منبر پر بٹھا لیا اور فرمایا: "اللہ نے سچ فرمایا ہے کہ مال اور اولاد انسان کے لیے فتنہ اور امتحان ہیں۔ میں نے دیکھا کہ یہ دونوں بچے چلتے ہوئے لڑکھڑا رہے ہیں تو مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے خطبہ چھوڑ کر ان دونوں کو اٹھا لیا۔"

حضرت عمرؓ بھی آپ بھائیوں پر بہت شفقت فرماتے۔ حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ حضرت حسن اور حضرت حسینؑ سے بہت محبت کرتے تھے اور ہمیشہ ان دونوں کو اپنے لڑکوں پر مقدم رکھتے۔ ایک دفعہ آپ نے لوگوں میں کچھ رقم تقسیم کی اور اس میں سے

دونوں بھائیوں کو دس دس ہزار درہم دیے۔ یہ دیکھ کر آپ کے صاحبزادے عبداللہ بن عمرؓ نے کہا:

"آپ جانتے ہیں کہ میں بہت پہلے اسلام لایا اور ہجرت بھی کی۔ اس پر بھی آپ ان دونوں کو مجھ پر ترجیح دیتے ہیں؟"

حضرت عمرؓ نے فرمایا: "عبداللہ! مجھے تمہاری یہ بات سن کر بہت رنج ہوا۔ تم بتاؤ کیا تمہارا نانا ان کے نانا کے مانند ہے؟ کیا تمہاری ماں ان کی ماں کے مانند ہے؟ کیا تمہاری نانی ان کی نانی کے مانند ہے؟ کیا تمہارا ماموں ان کے ماموں کے مانند ہے؟ کیا تمہاری خالہ ان کی خالوں کے مانند ہے؟ کیا تمہارے چچا ان کے چچا کے مانند ہے؟ کیا تمہاری پھوپھی ان کی پھوپھی کے مانند ہے؟ سنو ان کے نانا

رسول اللہ ﷺ ہیں۔ ان کی والدہ حضرت فاطمہؑ ہیں۔ ان کی نانی حضرت خدیجہؓ ہیں۔ ان کے ماموں رسول اللہ ﷺ کے صاحبزادے ابراہیمؓ ہیں۔ ان کی خالائیں رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادیاں حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ اور حضرت ام کلثومؓ ہیں۔ ان کے چچا جعفر بن ابی طالبؓ ہیں اور ان کی پھوپھی ام ہانئ بنت ابی طالبؓ ہیں۔"

جب بیت المال سے مسلمانوں کے وظیفے مقرر ہوئے تو حضرت عمرؓ نے دونوں بھائیوں کا وظیفہ ان کے والد حضرت علیؓ کی طرح پانچ پانچ ہزار درہم مقرر

کیا حالانکہ اصحاب بدر کے لڑکوں کو وہ دو ہزار درہم وظیفہ ملتا تھا۔

ایک مرتبہ یمن کے کچھ حطے مدینے آئے۔ حضرت عمرؓ نے انہیں لوگوں میں تقسیم کر دیا۔ لوگ وہ حطے یمن کر خوشی سے باہر نکل آئے۔ حضرت عمرؓ مسجد نبویؐ میں تشریف فرما تھے۔ لوگ آپ کے پاس آتے اور سلام کرتے۔ کچھ

دیر بعد حضرت حسن اور حسینؑ بھی اپنی والدہ حضرت فاطمہؑ کے گھر سے نکلے لیکن وہ کوئی حطہ پہنے ہوئے نہ تھے۔ انہیں دیکھتے ہی حضرت عمرؓ بے قرار ہو گئے۔ آپ نے لوگوں سے فرمایا: "مجھے تم لوگوں کو حطے دینے سے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔"

لوگوں نے وجہ دریافت کی تو آپ نے فرمایا: "ان دونوں بچوں کی وجہ سے لوگ حطے پہنے ہوئے ہیں لیکن ان کے جسم حلوں سے خالی ہیں۔"

یہ کہہ کر اسی وقت یمن کے عامل کو فرمان لکھا کہ حسن اور حسینؑ کے لیے فی الفور دو عمدہ حطے بھیج دو۔ اس نے حکم کی تعمیل کی۔ جب حطے آگئے تو حضرت عمرؓ نے انہیں حسن اور حسینؑ کو پہنایا اور فرمایا: "اب مجھے سچی خوشی حاصل ہوئی۔"

ابن خلدون اور بعض دوسرے مورخ لکھتے ہیں کہ حضرت حسن اور حضرت حسینؑ اس لشکر میں موجود تھے جس نے فتح مصر کے بعد افریقا کے دوسرے علاقوں پر چڑھائی کی تھی۔ اسلامی لشکر کے ساتھ جس میں متعدد صحابہ شامل تھے۔ یہ دونوں بھی مغرب اقصیٰ تک پہنچ گئے۔

طبری نے اپنی کتاب تاریخ الامم والملوک میں لکھا ہے کہ ان دونوں نے حضرت عثمانؓ کے عہد میں طبرستان کے خلاف جہاد میں حصہ لیا۔ یہ جہاد ۳۰ھ بمطابق ۶۵۰ء میں ہوا۔

ان واقعات سے پتا چلتا ہے کہ حضرت حسن اور حسینؑ دونوں بھائی ہر وقت اسلام کی حمایت میں دشمنوں کے سامنے سینہ سپر رہتے اور ہر شہید و قصبہ پر اسلامی علم گارڈنے میں پیش پیش تھے۔

حضرت عثمانؓ کے عہد میں جب اسلام کے اندر پہلی بار فتنہ برپا ہوا اور باغیوں نے آپ کے گھر کا محاصرہ کر لیا تو حضرت حسینؑ بھی ان معدودے چند نوجوانوں میں سے تھے جنہوں نے جان کی پروا نہ کرتے ہوئے ان کا مقابلہ کیا۔ اس واقعے کی تفصیل یوں ہے کہ جب باغیوں نے حضرت عثمانؓ کے گھر کا محاصرہ کر کے پانی بند کر دیا اور آپ کے قتل کا ارادہ کیا تو حضرت علیؓ نے پانی کی تین

مٹکیں آپ کے گھر بھیجیں اور اپنے دونوں بیٹوں، حسن اور حسینؑ کو بھی ہتھیار دے کر آپ کے گھر بھیج دیا۔ انہیں حکم دیا کہ تم تلواریں لے کر عثمانؓ کے دروازے پر کھڑے رہو اور کسی شخص کو جو بری نیت سے گھر میں داخل ہوتا

چاہے، وہاں قدم نہ رکھنے دو۔

حضرت علیؓ کی طرح زبیر بن العوام، حضرت طلحہ اور چند دیگر صحابہؓ نے بھی اپنے لڑکوں کو حضرت عثمانؓ کی حفاظت کے لیے ان کے گھر بھیجا تھا۔

ایک روز حضرت عثمانؓ نے اپنے گھر کی چھت پر چڑھ کر تقریر فرمائی۔ لیکن باغیوں نے آپ سے نامناسب سلوک کیا اور آپ پر پتھر اور تیر پھینکنے شروع کیے۔ اس دوران آپ کی حفاظت کرتے ہوئے حضرت حسنؓ ڈھکی ہوئے۔

اسی دوران موقع پا کر باغی گھر کے اندر داخل ہوئے اور خلیفہ سوم کو شہید کر دیا۔ شور سن کر دروازے پر کھڑے محافظ اندر بھاگے۔ دیکھا کہ حضرت عثمانؓ خاک و خون میں غلط ہیں۔ اب سوائے اسوس کے کوئی چارہ نہ تھا۔

اخلاقیات

سوباتوں کی ایک بات

یہی ہے نیکی کا زمانہ

ایک معمولی سی اچھائی بھی رب کائنات کی بارگاہ میں صلہ پاتی اور رائیگاں نہیں جاتی

ڈاکٹر اویب عبدالحق عقیل

”پھر آج کل تو نیکی کا زمانہ ہی نہیں، کہنے والے لوگ نیکی اس لیے کرتے ہیں کہ وہ لوگوں سے اس کا بدلہ چاہتے ہیں۔ حالانکہ نیکی کرنے کا مقصد تو رضائے الہی کا حصول ہونا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر زمانہ نیکی کا ہوتا ہے۔ کیونکہ نیکی سدا رہنے والی ہے جبکہ بدی کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ اسی لیے کوئی بھی دور نیکی کرنے والوں سے خالی نہیں رہا۔“

بزرگ نے جو باتیں بیان کیں وہ بالکل سچی تھیں اس لیے سب نے ان سے اتفاق کیا۔ چند لمحوں بعد کھانا شروع ہو گیا۔ میں نے تسلی سے کھانا کھایا اور گھر واپس جانے کے لیے وگین اسٹاپ پر آ گیا۔

معلوم ہوا کہ کسی وجہ سے ہسپتال ہو گئی ہے۔ چنانچہ اکا ڈاکا گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ میں وگین کے انتظار میں کھڑا تھا کہ ایک خاتون نے درخواست کی ”مجھے اور میری بیٹی کو سڑک پار کرا دیں۔“

میں جب انھیں سڑک پار کرا رہا تھا تو ملتان



تبارک و تعالیٰ مجھے معاف کرنے میں بھی

اللہ کئی ہم وطنوں کی طرح کہا کرتا تھا:

”آج کل تو نیکی کا زمانہ ہی نہیں رہا۔“

پچھلے دنوں مجھے شادی کی ایک تقریب میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں کھانے سے قبل حسب معمول لوگ گپ شپ میں مشغول تھے۔ کسی بات کے جواب میں میرے منہ سے نکل گیا: ”آج کل تو نیکی کا زمانہ ہی نہیں رہا۔“

حاضرین میں سے اکثر نے میری ہاں میں ہاں ملائی لیکن ایک نورانی صورت بزرگ کہنے لگے ”معاف کرنا بیٹا میں آپ کی رائے سے اتفاق نہیں کرتا۔ اس کی وجہ ہے۔ اول تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے زمانے پہ ایک پوری سورت سورہ عصر نازل فرمائی یعنی اس کا نام ہی ”زمانہ“ ہے۔ قرآن و سنت میں زمانے کو برا کہنے سے منع کیا گیا ہے۔

اردو ڈائجسٹ 79

WWW.PAKSOCIETY.COM

۱۔ عباس بن علیؑ، ۲۔ جعفر بن علیؑ، ۳۔ عبداللہ بن علیؑ
۴۔ عثمان بن علیؑ، ۵۔ محمد بن علیؑ، ۶۔ ابو بکر بن علیؑ، ۷۔ علی بن حسینؑ بن علیؑ، ۸۔ عبداللہ بن حسینؑ، ۹۔ ابو بکر بن حسنؑ
۱۰۔ عبداللہ بن حسنؑ، ۱۱۔ قاسم بن حسنؑ، ۱۲۔ عون بن عبداللہ بن جعفرؑ، ۱۳۔ محمد عبداللہ بن جعفرؑ، ۱۴۔ جعفر بن عقیلؑ،
۱۵۔ عبدالرحمان بن عقیلؑ، ۱۶۔ عبداللہ بن عقیلؑ، ۱۷۔ عبداللہ بن مسلم بن عقیلؑ، ۱۸۔ محمد بن ابوسعید بن عقیلؑ۔

عمر بن سعد کی فوج کے اٹھاسی آدمی مارے گئے۔ زخمیوں کی تعداد ان کے علاوہ تھی۔ عمرو نے تمام شہداء کے سر کاٹنے کا حکم دیا۔ پھر شمر ذی الجوشن، قیس بن اشعث، عمرو بن العجاج اور عمرو بن قیس کے ہاتھ یہ سراہن زیاد کے پاس بھجوا دیے۔ یہ لوگ ان سروں کو نیزوں پر این زیاد کے پاس لے گئے۔

شہادت کے دو روز بعد عمرو بن سعد حضرت حسینؑ کی بیٹیوں، بہنوں، شیرخوار بچوں اور زین العابدینؑ کو ہمراہ لے کر بلا سے کوفہ روانہ ہوا۔ جب یہ تباہ شدہ قافلہ اس جگہ سے گزرنے لگا جہاں حضرت حسینؑ اور دیگر شہداء کی لاشیں بے گور و کفن چھیل میدان میں پڑی تھیں تو قافلے میں ماتم برپا ہو گیا۔ آپ کی بہن، زینب رو رو کر کہتی تھی: ”اے رسول اللہ، جن پر ملائک آسمان سے درود بھیجتے ہیں، دیکھیے، یہ حسینؑ خاک و خون میں غلٹاں، نکلے نکلے ہو کر چھیل میدان میں پڑا ہے۔ آپ کی بیٹیاں قیدی ہیں۔ آپ کی اولاد مقتول ہے اور ہوا میں ان کی خاک اڑ رہی ہے۔“

یہ دردناک مرثیہ سن کر دوست دشمن کوئی نہ تھا جو رونے نہ لگا ہو۔ اس وقت ان لوگوں کو احساس ہوا کہ وہ کس قدر شدید گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں لیکن اب کیا ہو سکتا تھا؟

جب حضرت علیؑ، حضرت طلحہؑ اور حضرت زبیرؑ کو آپ کی شہادت کی خبر ملی تو وہ بھاگے بھاگے آئے۔ حضرت علیؑ نے اپنے بیٹوں سے پوچھا کہ جب تم دروازے پر موجود تھے تو لوگوں کو گھر میں داخل ہو کر حضرت عثمانؑ کو شہید کرنے کی جرأت کس طرح ہوئی؟ آپ نے انھیں تھپتھپ مارے اور محمد بن طلحہؑ اور عبداللہ بن زبیرؑ کو بھی برا بھلا کہا۔ حضرت علیؑ کی خلافت کے ایام میں جو جنگیں ہوئیں، ان سب میں حضرت حسینؑ اپنے والد کے ساتھ رہے۔ جنگ جمل، جنگ صفین اور جنگ نہروان کے موقع پر آپ نے انتہائی جوانمردی، استقلال، شجاعت اور بہادری کا ثبوت دیا۔

ایک جنگ میں آپ نے آگے بڑھ کر بل من مبارز (کوئی ہے جو میرے مقابلے پر آئے) کا نعرو لگایا۔ زبرقان نامی ایک شخص جس کی بہادری کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، آگے آیا اور پوچھا ”تم کون ہو؟“

آپ نے جواب دیا ”میں حسین بن علیؑ۔“ یہ سن کر زبرقان نے کہا ”اے میرے بیٹے! تم لوٹ جاؤ۔ ایک دن میں نے رسول اللہؐ کو دیکھا تھا۔ آپ اونٹنی پر سوار تھا کی جانب سے تشریف لا رہے تھے اور تم رسول اللہؐ کے آگے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نہیں چاہتا رسول اللہؐ سے اس حال میں ملوں کہ میرے ہاتھ تمہارے خون میں آلودہ ہوں۔“

حضرت حسینؑ کی شہادت کا واقعہ ہم عاشورہ یعنی ۱۰ محرم ۶۱ھ مطابق ۱۰ اکتوبر ۶۸۰ء کو بعد نماز ظہر پیش آیا۔ حضرت حسینؑ کی عمر اس وقت پچپن برس تھی۔ آپ کے ساتھ بہتر آدمی شہید ہوئے۔ ان میں اٹھارہ کتب تاریخ میں درج ہے کہ آپ کے رشتہ دار اور خاندان بنو ہاشم کے فرد تھے جن کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

اردو ڈائجسٹ 78

2014 Pa

2014 Pa

سائنس و ٹیکنالوجی

چالیس سالہ جیک لمین امریکی ریاست، کیلی فورنیا کے شہر، سکارامنٹو کا رہائشی ہے۔ پچھلے تین برس سے وہ اپنے گھر کا اجاز اور ویران صحن دیکھ دیکھ کر تنگ آ چکا۔ وہاں گھاس، پودوں اور پھولوں کا نام و نشان نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ پچھلے تین برس سے ریاست کیلی فورنیا زبردست قحط (Mega Drought) کا نشانہ بنی ہوئی ہے۔ جیک لمین نے برآمدے کی ویرانی دور کرنے کا طریقہ یہ نکالا کہ وہاں کیاریوں اور دیواروں پر ہزرنگ کرا لیا۔ سوچتا ہے کہ گھاس اور پودے نہ سکی، ہزرنگ ہی آنکھوں کو طراوت بخش دے۔

پہلے وہ برآمدے میں مصنوعی گھاس (Turf) بچھانا چاہتا تھا۔ پھر اسے یاد آیا کہ گھاس کو خراب ہونے سے بچانے کی خاطر اسے روزانہ پانی دینا ضروری ہے۔ جب کہ کیلی فورنیا حکومت نے لان میں پانی دینے پر پابندی لگا رکھی تھی۔ آج ریاست کا جو شہری لان میں پانی دے یا گاڑی دھوئے، اس پر بھاری جرمانہ عائد ہوتا ہے۔

دراصل قحط کے باعث ریاست کیلی فورنیا پانی کی شدید کمی سے دوچار ہے۔ کسان زمین کے نیچے سے پانی نکال کر زرعی ضروریات پوری کر رہے ہیں۔ یاد رہے، کیلی فورنیا میں زراعت ہی اہم ذریعہ روزگار ہے۔ اس شعبے کی مالیت ۱۳۵ ارب ڈالر (۴۵ کھرب روپے) بتائی جاتی ہے۔ اس عدد کی وسعت کا اندازہ یوں لگائیے کہ پاکستان کا حالیہ قومی بجٹ چار کھرب روپے سے بھی کم مالیت رکھتا ہے۔

ارہوں انسانوں کی جان و مال خطرے میں

موسم جب ظالم بن جائیں

عالمی سطح پر جنم لینے والی آب و ہوائی تبدیلیاں محض اس صدی میں کرہ ارض کے کئی علاقوں کی حیات زیر و زبر کر سکتی ہیں..... ایک چشم کشا رپورٹ

عام محمود



کامیابی

☆ کامیاب وہ ہیں جن کے پاس ایمان کی دولت ہے۔ (القرآن)

☆ تجربے کو یاد رکھنا اور اسے موقع پر کام میں لانا کامیابی کی دلیل ہے۔ (حضرت علیؓ)

☆ زندگی میں کامیابی عزم اور ارادے کی بدولت حاصل ہوتی ہے نہ کہ فقط خیالات سے۔ (علامہ اقبالؒ)

☆ میری کامیابی کا راز یہ ہے کہ کسی کام کو کرتے وقت اس کام کے سوا دنیا کی کوئی بات میرے سامنے نہیں رہتی۔ (چارلس کنگ)

☆ میری کامیابی صرف اس بات میں مضمر ہے کہ میں ہر ایک کام کے لیے پندرہ منٹ پہلے ہی تیار ہو جاتا ہوں۔ (نیلسن)

☆ میں تمہیں کامیابی کا ٹکڑا نہیں بتا سکتا لیکن ناکامی کا فارمولا یہ ہے کہ ہر ایک کو خوش کرنے کی کوشش کیجیے۔ (ہربرٹ سوپ)

☆ تم جہاں چاہو زمین کھودو، خزانہ تمہیں ضرور ملے گا، شرط صرف یہ ہے کہ زمین کامیابی کے یقین کے ساتھ کھودو۔ (فیلپ جبران)

☆ کامیابی انہی لوگوں کے قدم چومتی ہے جو سب سے زیادہ مستقل مزاج ہوں۔ (نیولین)

☆ کامیابی بے شمار خطرناک غلطیوں میں گھری ہوئی ہے۔ (برنارڈشا)

☆ اپنے شر سے بچنا عظیم کامیابی ہے۔ (حضرت علیؓ)

(مراسلہ: اصدق امین، واہ کینٹ)

جانے والی دین آگنی۔ کنڈکٹر کے نعرے سے پتا چلا کہ اس میں ایک ہی نشست خالی ہے۔ اچانک ایک صاحب آئے اور لپک کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ میں جتنی دیر میں خاتون اور بچی کو سڑک پار کر کے واپس پلنا دیکھتا ہوں چھوڑتی مٹان کی طرف رواں دواں ہو چکی تھی۔

مجھے دیکھ کر چھوٹ جانے کا ملال تو ہوا لیکن ایک چھوٹی سی نیکی انجام دینے پر دلی خوشی بھی ہوئی۔ بہر حال پندرہ منٹ بعد دوسری دین آگنی۔ میں اس میں سوار ہو کر مٹان روانہ ہوا۔ دس بارہ میل سفر کے بعد ڈرائیور نے اچانک گاڑی روک دی۔

دیکھا کہ ہم سے پہلے جانے والی دین حادثے کا شکار ہو چکی۔ سامنے والا حصہ بری طرح متاثر ہوا تھا اور جو صاحب میرے بجائے اس دین میں سوار ہوئے تھے زخموں سے چور بری طرح کرا رہے تھے۔ ہم نے فوراً ۱۱۲۲ پر اور ہائی وے موٹر پٹرولنگ پولیس کو اطلاع دی۔ انہوں نے جلد پہنچ کر زخموں کو اسپتال منتقل کیا۔ پھر گاڑی کو سڑک کنارے لگایا۔

میں اللہ تبارک تعالیٰ کے حضور سر بسجود ہو گیا کہ اس نے سڑک پار کرانے کی میری معمولی نیکی کو بھی ضائع نہیں ہونے دیا اور اس کا فوری صلہ مجھے مل گیا۔ مجھے اللہ تبارک تعالیٰ کے اس فرمان کی صداقت پر پختہ یقین ہو گیا کہ قیامت کے روز ہر چھوٹے سے چھوٹے اچھے اور برے عمل کو پیش کیا جائے گا۔ تب جس نے اچھا عمل کیا ہوگا وہ اس کی جزا پائے گا۔ جس نے برا عمل کیا ہوگا، وہ سزا پائے گا۔ نیز مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ..... ہر زمانہ نیکی کا زمانہ ہے، اسے ہرگز برا نہیں کہنا چاہیے۔

ہوا اور موسموں (Weathers) میں وسیع پیمانے پہ تبدیلیاں لارہا ہے۔

اس وقت پوری دنیا میں کونکے سے بجلی بن رہی ہے۔ تیل اور گیس سے کروڑوں گاڑیاں چلتی ہیں۔ کارخانوں میں بھی وسیع پیمانے پر رکازی ایندھن استعمال ہوتے ہیں۔ چنانچہ تازہ رپورٹ کی رو سے دنیا والے "۴۰ ارب ٹن" سی اونٹو گیس ہر سال فضا میں جمونک رہے ہیں۔ چینی، امریکی، بھارتی، روسی، جاپانی، جرمن، شمالی کورین، کینیڈین، برطانوی اور میکسیکن ۱۱ دس بڑی اقوام ہیں جو سب سے زیادہ

درج بالا گیس پیدا کرتی ہیں۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ ۱۹۸۸ء میں فضا میں سی اونٹو ۳۵۰ پی پی ایم سے زیادہ ہو چکی۔ تب سے فضا میں اس گیس کی مقدار مسلسل



تباہ کن سیلاب بھی عالمی گرماء کا ایک مظہر ہیں۔

بڑھ رہی ہے۔ سال رواں میں وہ ۴۰۰ پی پی ایم کا بندہ چھو چکی۔ چونکہ فضا میں مسلسل سبز مکانی گیسوں کی تعداد بڑھ رہی ہے لہذا درجہ حرارت میں بھی اضافہ جاری ہے۔ ایک جدید تحقیق کی رو سے کہ ۲۱۰۰ء میں اقوام عالم "۹۸ ارب ٹن" سی اونٹو گیس خارج کر رہی ہوں گی اور تب تک کرۂ ارض کا عالمی درجہ حرارت ۴.۴ درجے سینٹی گریڈ تک بڑھ جائے گا۔ یاد رہے، عالمی درجہ حرارت میں معمولی سی کمی بیشی بھی بین الاقوامی آب ہوا پر اثر انداز ہوتی ہے۔ یہاں تو وسیع پیمانے پر درجہ حرارت بدل رہا ہے۔

گیا۔ یہ ایندھن ایک اہم سبز مکانی گیس، کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج کرتے ہیں۔ یہ گیس آتش فشاں پہاڑوں کے پھنسنے، درخت کاٹنے اور جانداروں کے عمل تنفس سے بھی خارج ہو کر فضا میں شامل ہوتی ہے۔ اسی لیے ماضی میں فضا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس کی مقدار گھٹتی بڑھتی رہی ہے۔ لیکن زندگی کی نمود سے ۱۷۵۰ء تک فضا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار ۳۵۰ پی پی ایم (PPM) سے کم ہی رہی۔

پی پی ایم سے مراد ہے، فضا میں سبز مکانی گیسوں کے ہر دس لاکھ سالے (Molecules) گویا درج بالا

جملے کا مطلب ہے کہ فضا میں گیسوں کے ہر دس لاکھ سالموں میں سی اونٹو (کاربن ڈائی آکسائیڈ) کے سالے تعداد میں ۳۵۰ سے کم ہی رہے۔ لیکن جوں ہی انسان رکازی

ایندھن بڑی تعداد میں استعمال کرنے لگا، تو فضا میں سی اونٹو گیس کی مقدار بڑھنے لگی۔ یوں فضا میں صدیوں سے چلا آ رہا سبز مکانی گیسوں کا توازن بگڑ گیا۔

فضا کی گیسوں میں آتی قطرے سب سے زیادہ ہیں۔ لیکن سی اونٹو سمیت دیگر گیسوں کی حدت زیادہ مقدار میں جذب کرتی ہیں۔ اسی عمل نے قدرتا زمین کا درجہ حرارت بڑھا دیا جس سے کرۂ ارض میں حدت زیادہ پہنچنے لگی۔ بین الاقوامی سطح پر گرمائش بڑھنے کے انسان ساختہ اُجوبے کو "عالمی گرماء" (Global Warming) کہا گیا۔ یہی عالمی گرماء زمین کی آب و

اور طوفانوں کے باعث دنیا والے "۳۹۸ کھرب ڈالر" کا نقصان برداشت کر چکے۔ ان قدرتی آفتوں نے براہ راست ۶۵ کروڑ انسانوں کو متاثر کیا۔ فصلیں تباہ کر دیں، گھر مسمار کر دیے اور کاروبار ختم کر ڈالے۔ یوں غربت اور بے روزگاری میں اضافہ ہو گیا۔

تبدیلیوں کی سائنس

ہمارے کرۂ ارض کی فضا (Atmosphere) مختلف گیسوں سے بنی ہے۔ سورج کی شعاعیں فضا سے گزرتے ہوئے زمین پر پہنچتی ہیں اور اسے گرم کرتی ہیں۔ تب زمین پر جنم لینے والی حدت اوپر اٹھتی اور خلا (Space) میں جانے کی سعی کرتی ہے۔ ایسے میں فضائی گیسوں کو کچھ حدت جذب کرتی اور واپس زمین کی سمت بھیج دیتی ہیں۔

درج بالا عمل کے باعث ہی ہماری زمین کا درجہ حرارت معمول پر رہتا ہے۔ یہ عمل اصطلاحاً "سبز مکانی اثر" (Green House Effect) کہلاتا ہے۔ جب کہ فضائی گیسوں کو "سبز مکانی گیس" (Green House Gases) کہا جاتا ہے۔ ان گیسوں میں آبی قطرے، کاربن ڈائی آکسائیڈ، میتھین، نائٹرس آکسائیڈ اور اوزون شامل ہیں۔

اسی سبز مکانی اثر نے کرۂ ارض میں ایسی غیر معمولی فضا کو جنم دیا کہ اس میں زندگی پنپ سکے۔ یوں کرۂ ارض میں رنگ برنگ جانوروں کی لاکھوں اقسام اور آخر کار حضرت انسان نے جنم لیا۔ لیکن ۱۷۵۰ء کے بعد جب یورپ میں صنعتی انقلاب شروع ہوا، تو انسان بے سوچے سمجھے اپنی قبر خود کھودنے لگا۔

ہوا یہ کہ انسانی سرگرمیوں کی وجہ سے رفتہ رفتہ رکازی ایندھنوں (کولک، تیل، گیس) کا استعمال بڑھ

قسط سے قبل پاکستانیوں کی طرح امریکی بھی پانی کی قدر و قیمت سے آگاہ نہ تھے۔ گھر، سڑک کنارے یا پارک میں نکال کھلا ہے اور پانی ضائع ہو رہا ہے، تو کسی کو پروا نہ ہوتی۔ اب کیلی فورنیا حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ پانی فروخت کیا جائے، یوں شہریوں کو احساس ہوگا کہ یہ مائع بڑا بیش قیمت ہے۔ چنانچہ وہ گھروں میں "پانی میٹر" نصب کر رہی ہے۔ یہ منصوبہ اگلے چند برس میں مکمل ہو جائے گا۔ پانی خریدنے پر یقیناً امریکی اسے سوچ سمجھ کر استعمال کریں گے۔

دور جدید کا مظہر

کیلی فورنیا کا قسط آب و ہوائی (Climatic) تبدیلیوں سے جنم لینے والا محض ایک مظہر ہے۔ ورنہ عالمی سطح پر انجام پانے والی ان تبدیلیوں نے سیلابوں، قحط اور سمندری و ارضی طوفانوں کے ذریعے دنیا میں تہلکہ مچا رکھا ہے۔ پاکستان میں ۲۰۱۰ء اور ۲۰۱۳ء کے دوران آنے والے تباہ کن سیلاب بھی اسی عالمی اُجوبے سے تعلق رکھتے ہیں۔

طرف تماشایہ ہے کہ دنیا والے اب تک آب و ہوائی تبدیلیوں کو تنبیہ کی سے نہیں لے رہے تھے۔ حتیٰ کہ بعض سائنس دانوں کا دعویٰ تھا کہ درج بالا تبدیلیاں انجام نہیں پارہیں۔ لیکن اسی سال تبدیلیوں سے متعلق جو اعداد و شمار سامنے آئے، انھوں نے کروڑوں انسانوں کی آنکھیں کھول دیں۔ اب دنیا بھر میں یہ احساس پھیل رہا ہے کہ آب و ہوائی تبدیلیوں کا زور نہ ٹوٹا، تو مستقبل قریب میں نہ صرف کرۂ ارض کی صورت شکل بدلے گی، بلکہ کئی علاقوں میں زندگی گزارنا کٹھن مرحلہ بن جائے گا۔

اعداد و شمار کی رو سے ۲۰۰۹ء تا حال سیلابوں، قحط

جنم لیتی خطرناک تبدیلیاں

عالمی درجہ حرارت بڑھنے سے دنیا میں کئی اقسام کی تبدیلیاں آرہی ہیں۔ ان میں آب و ہوائی تبدیلیاں سرفہرست ہیں۔ مثلاً پاکستان سمیت دنیا کے کئی علاقوں میں موسم گرما کی طوالت بڑھ چکی۔ نیز عموماً اس موسم میں شدید گرمی پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر پچھلے سال آسٹریلیا کے کئی شہروں میں اتنی شدید گرمی پڑی کہ کبھی ریکارڈ ٹوٹ گئے۔

اسی طرح موسم سرما میں بھی اب شدید سردی پڑنے لگی ہے۔ مثلاً اس سال امریکا، کینیڈا، برطانیہ اور دیگر مغربی ممالک شدید ٹھنڈ کی لپیٹ میں رہے۔ موسموں کی تبدیلی نے فصلوں کے نظام ہوائی کو بھی متاثر کیا۔ پاکستان میں خریف کی فصلوں کو ماضی کی نسبت ایک ماہ بعد بویا جانے لگا ہے۔ وجہ یہ کہ اب مون سون ستمبر تک چلتا ہے۔

ایک اہم تبدیلی یہ ہے کہ پہاڑوں پر جمی برف پگھلنے لگی ہے۔ چنانچہ موسم گرما میں تیزی سے پگھلتی برف اور بارشیں مل کر سیلاب لے آتی ہیں۔ یہی آج بھو۔ پاکستان میں ۲۰۱۰ء میں پوری طاقت سے جلوہ گر ہوا۔ ہالیوڈ، ہندو کش اور قراقرم میں صدیوں سے بچے گلیشیر بڑھتی گرمی کے باعث پگھل رہے ہیں۔ یہی عمل گرین لینڈ، قطب شمالی اور قطب جنوبی میں بھی کارفرما ہے۔

گلیشیر پگھلنے کی وجہ سے قدرتنا سمندروں کی سطح بڑھ رہی ہے۔ چنانچہ کئی جزائر صلیب ہستی سے مت جائیں گے۔ ان میں مالدیپ اور بحر الکاہل کے بہت سے مشہور جزیرے شامل ہیں۔ نیز ساحلی شہروں مثلاً لاس اینجلس، کراچی، ڈھاکہ، ممبئی وغیرہ کا بیشتر حصہ

بھی سمندر کی نذر ہو جائے گا۔

غذاؤں کی قیمتیں بڑھنا بھی ایک اہم آب و ہوائی تبدیلی ہے۔ قحط، سیلاب اور طوفان وسیع پیمانے پر کھیت، کھلیان اور باغ تباہ کر ڈالتے ہیں۔ چنانچہ لامحالہ قیمتیں بڑھ جاتی ہیں۔ کیونکہ پیداوار کم ہو جاتی، مگر کھانے والے اتنے ہی رہتے بلکہ ہر سال بڑھ جاتے ہیں۔

کرڈوں برس کی تبدیلیوں کے بعد زمین اس قابل ہوئی کہ یہاں زندگی نشوونما پاسکے۔ لیکن انسان بے دریغ رکازی ایندھن استعمال کر کے زمین میں زندگی کا پینا مشکل بنا رہا ہے۔ اسی کی وجہ سے ہمارے پڑوسی حیوانیات اور نباتات کی جانوں کو بھی لالے پڑ چکے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ آب و ہوائی تبدیلیوں کے باعث ہر سال جانوروں اور پودوں کی سیکڑوں اقسام مٹ رہی ہیں۔ جب کہ ہزار ہا قسمیں ناپید ہونے کے خطرے سے دوچار ہیں۔

انسانی صحت کو لاحق خطرات

آب و ہوائی تبدیلیاں انسانی صحت پر بھی اثر انداز ہو رہی ہیں۔ شہروں میں رہنے والے گاڑیوں کے دھوئیں سے دسے اور سانس کی بیماریوں کا نشانہ بنتے ہیں۔ موسم گرما میں شدید تپش اور موسم سرما میں زبردست سردی انسانوں کی جانیں لینے لگی ہے۔

دنیا کے کئی علاقوں میں بارشوں کا دورانیہ بڑھنے کی وجہ سے چھوٹی (Infections) بیماریاں بڑھ رہی ہیں۔ نیز پانی سے متعلق امراض (Water Borne Diseases) بھی روز افزوں ہیں۔

قحط، سیلاب اور سمندری طوفان انسانوں کی ذہنی صحت پر بھی منفی اثرات ڈالتے ہیں۔ ظاہر ہے،

جب قدرتی آفت انسان کی جمع پونجی اور مال و متاع ختم کر ڈالے، تو وہ شدید پریشانی کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ پریشانی منفی رخ اختیار کر لے، تو انسان مجرم بننے میں دیر نہیں لگاتا۔

قاتلوں کے نام و پتے

صدے اور افسوس کی بات یہ ہے کہ آب و ہوائی تبدیلیاں، بڑھتا درجہ حرارت اور فضائی آلودگی روکنے کے لیے ترقی یافتہ ممالک کی حکومتیں خاطر خواہ اقدامات نہیں کر رہیں۔ حالانکہ یہی ممالک سب سے زیادہ سبز مکانی گیس خارج کرتے ہیں۔ جب کہ ان کی ہوس کے باعث چھوٹے اور غریب ملکوں کی بقا کو سنگین خطرات لاحق ہو چکے۔

حالیہ ماہ ستمبر میں اقوام متحدہ میں آب و ہوائی کانفرنس (Climnate Summit) منعقد ہوئی۔

اس موقع پر یہ انکشاف سامنے آیا کہ آب و ہوائی تبدیلیوں کی تباہ کاری سے نمٹنے کے لیے اب عالمی ممالک کو سالانہ ۱۰۰ ارب ڈالر (۱۰۰ کھرب روپے) خرچ کرنا ہوں گے۔ اگر ایسا نہ ہوا، تو پھر ہر سال اخراجات بڑھتے چلے جائیں گے۔

بہر حال میں، آپ، ہم سب انفرادی سطح پر ایسے

اقدامات کر سکتے ہیں کہ آب و ہوائی تبدیلیوں کے منفی اثرات کم ہو جائیں۔ مثال کے طور پر جہاں تک بن پڑے، سڑک کے واسطے بس یا ریل استعمال کیجیے۔ کیونکہ یہ ذرائع کم ایندھن خرچ کر کے زیادہ لوگوں کو منزل تک پہنچاتے ہیں۔

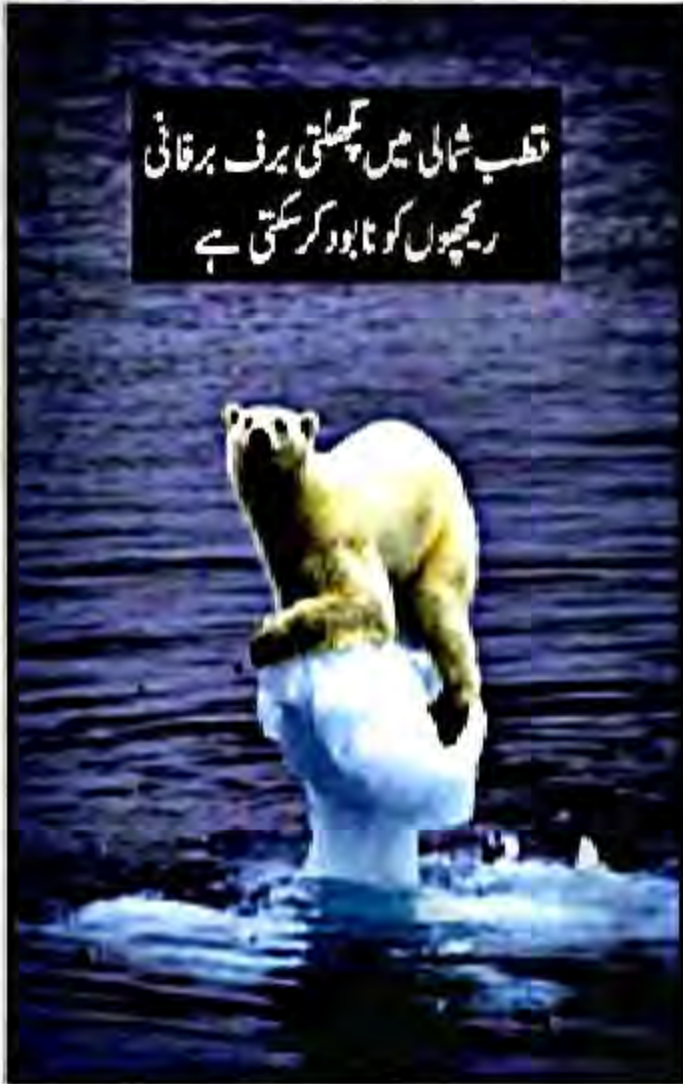
اسی طرح کوشش کیجیے کہ قریبی علاقوں میں آنے جانے کی خاطر سائیکل سے مدد لیں یا پیدل چلیے۔ یہ ذرائع آمد و رفت ظاہر ہے، کوئی سبز مکانی گیس یا آلودگی پیدا نہیں کرتے۔ اگر مجبوراً کار یا موٹر سائیکل استعمال کرنا ہے، تو سعی کیجیے کہ اسے آہستہ چلائیے۔

بجلی کم سے کم استعمال کر کے بھی ہم کرہ ارض پر صاف ستھرا ماحول پیدا کرنے میں اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اسی طرح گھر میں کوزا کم پیدا کیجیے کہ یہ بھی آلودگی بڑھاتا ہے۔

یاد رکھیے، اگر آج کے انسان نے آب و ہوائی تبدیلیوں کو روکنے کے ٹھوس اقدامات نہ کیے، تو ہم آنے والی نسلوں کے مجرم بن جائیں گے۔ شاید مشہور امریکی شاعر، لوک گلوکار اور داستان گو، اتھانٹلس (۱۹۳۵ء۔ ۲۰۰۸ء) کا درجہ ذیل قول آپ کے قلب و ضمیر کو جھنجھوڑ ڈالے۔

”زمین مر نہیں رہی بلکہ اسے قتل کیا جا رہا ہے۔ اور قاتلوں کے نام ہیں اور پتے بھی!“

قطب شمالی میں پگھلتی برف برقانی ریچھوں کو نابود کر سکتی ہے



برآمد ہوتے اور ابا کے پاس آ کر تعزیت کرتے۔
خواتین نے مردوں کو اس میدان میں بھی پیچھے چھوڑ
دیا۔ وہ دھاڑیں مار مار کر روتی ہوئی نظر آئیں۔ چند
لوگ میرے پاس بھی آئے۔ ان کے ہونٹ ہلکتے محسوس
ہوئے مگر حیران کن طور پر کوئی آواز میری سماعت سے
نہیں نکرائی۔ مجھے تو بس ایک ہی آواز آئی: "میت
اٹھاؤ، نماز جنازہ کا وقت ہو گیا۔"

.....☆.....

میرے والد اور والدہ نے سب سے پہلے بیٹے
فیضان کی پیدائش پر بہت خوشیاں منائی تھیں۔ لیکن کچھ
عرصہ بعد انہیں احساس ہوا کہ ان کی خوشیوں کا چاند تو
گرہن لگا ہے۔ فیضان عام بچوں سے مختلف تھا۔

دماغی کمزوری کی وجہ سے وہ نہ صرف ہکاتا بلکہ اس
کی ذہنی نشوونما بھی محدود تھی۔ اسی باعث وہ اپنے ہم
عصروں میں پیچھے رہ گیا۔ بچپن تک تو سکون رہا مگر جیسے
جیسے فیضان پر دان چڑھا، ابو پر زندگی جیسے تنگ ہونے
لگی۔ انہیں اپنی "ناک" بہت عزیز تھی۔ جب بھی معاشرہ
فیضان پر بھتیجی کستا، انہیں اپنی پگڑی اچھلتی محسوس ہوتی۔

میں نے شعور کی آنکھ کھولی، تو فیضان کو ابا جان
کے زیرِ عتاب ہی پایا۔ بالآخر ابو کو راہ فرار سوجھ ہی گئی۔
فیضان کو کسی کے سامنے حتیٰ کہ مہمانوں کے قریب آنے
سے بھی منع کر دیا گیا۔ یوں میرا بچپن اپنے بھائی کے
گرد کھیلنے گزارا۔ ابا اور اماں جب زندگی کی گاڑی دھکیلنے
کے لیے گھر سے دور ہوتے تو فیضان ہی میرا خیال
رکھتا۔ وہ اتنی شفیق روح تھی کہ میں ابا اور اماں سے زیادہ
اس سے مانوس ہو گیا۔ وقت اڑان بھرتا گیا۔ میں نے
جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا۔ میرا بڑا بھائی ذہنی طور پر بچہ
ہی رہا مگر ہم دونوں کا رشتہ مضبوط تر ہوتا گیا۔ پھر وہ ہوا

زندگی آج سے پہلے اتنی بے معنی کبھی
مجھے محسوس نہ ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے
خاموشی نے زندگی کی ہر ہلچل کو جذب کر لیا
ہو۔ جیسے بولتے لب آواز نکالنے سے قاصر ہو گئے ہوں۔
دنیا کی ہر بد صورتی مجھ پہ قہقہے لگا رہی تھی۔ تھکن بڑھتی چلی
گئی۔ اندھیرے ہر چیز کو نکلنے لگے، اور میں نیم بے ہوش
سا ہو کر گرنے لگا۔ تب مجھے احساس ہوا، کوئی چیز میرے
لبوں کا قتل تو ذکر کر نکل گئی..... شاید وہ حیح تھی۔

.....☆.....

"فیضان! تمہیں پیار کی زبان سمجھ نہیں آتی؟
لاتوں کے بھوت کبھی باتوں سے نہیں مانتے۔" ابا
نے جملہ مکمل کرتے ہی اپنے بڑے بیٹے کے منہ پر
زنائے دار تھپڑ جڑ دیا۔

"ابا..... مع مع..... معاف کر..... دو، آئندہ.....
میں..... کبھی..... آپ کے..... دوستوں کے سامنے.....
نہیں آؤں گا۔" فیضان باقاعدہ ابا کے پیروں پر پڑ گیا۔
مگر ان پر تو جیسے جن سوار تھا۔ وہ مارتے گئے اور فیضان
دہائیاں دیتا رہا، یہاں تک کہ بے خود ہو کر صوفے پہ سر
تھامے بیٹھ گئے۔ بیاناں کے قدموں میں پڑا سسکتا رہا۔
میں اور اماں دہلیز پر کھڑے بے آواز رو رہے تھے مگر
ابا کے سامنے کسی کو کچھ بولنے کی ہمت نہ ہوئی۔ فیضان کا
جسم دھنناکی سے بری طرح سوج چکا تھا لیکن نیسیں
ہمارے دل میں اٹھ رہی تھیں۔ ابا کو اپنی بے عزتی کا
احساس بار بار بے چین کر رہا تھا۔

.....☆.....

برادری کے سب لوگ جمع ہونے لگے۔ ایک کے
بعد دوسری گاڑی آ کر رکھی۔ کلف لگے کپڑوں میں ملبوس
حضرات ہاتھ میں موبائل تھامے، گاڑیوں میں سے

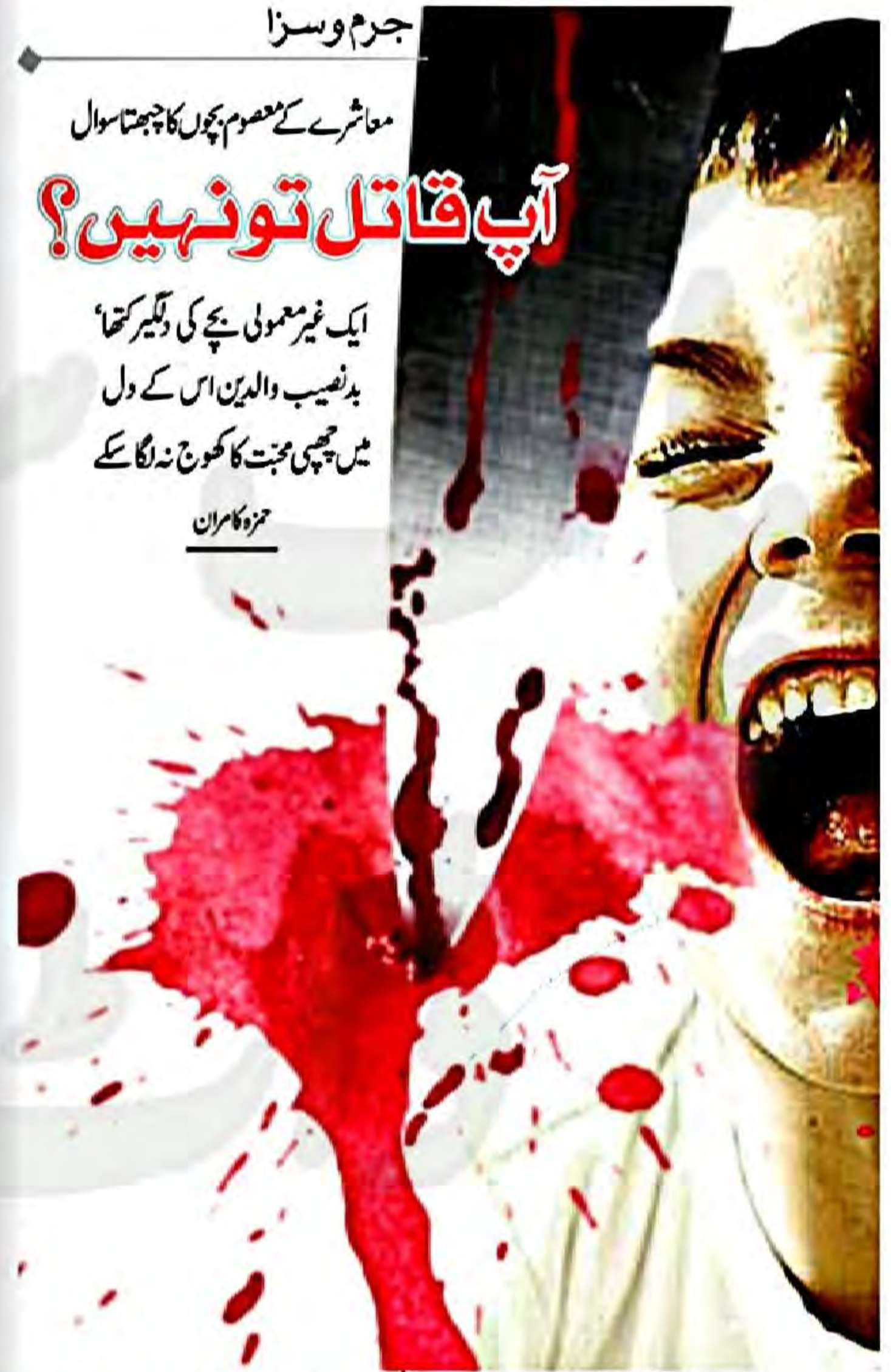
جرم و سزا

معاشرے کے معصوم بچوں کا چبھتا سوال

آپ قاتل تو نہیں؟

ایک غیر معمولی بچے کی دلگیر کہتا
بد نصیب والدین اس کے دل
میں چھپی محبت کا کھوج نہ لگا سکے

حمزہ کامران



نشر شگفتہ

بوریت کا سبب بن گیا۔ ہمیں سیاست سے ایسی ہی دلچسپی ہے جیسے سرکاری ملازمین کو کام کرنے یا پھر آج کی نوجوان نسل کو پڑھائی سے۔ ہم تو ٹی وی دیکھنا ہی چھوڑ چکے کوئی سیاست کی بات بھی کرے تو ہمارے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔ صبح تازہ دم وقت پر دفتر جاتے ہیں۔ وہاں پہلے سے بیٹھے ہمارے ہم دفتر گرما گرم بحث میں مصروف ہوتے ہیں۔ سب کو سلام کرنے کے بعد پیرا اینا مول کی گولی جیب سے نکالتے اور ایک گلاس پانی سے نگل لیتے ہیں۔ پھر بہت کوشش کرتے ہیں کہ بحث کا رخ کسی طرح سیاست سے ہٹ جائے۔ مگر وہ گھوم پھر کے سیاست پہ ہی آجاتی ہے۔

اب آپ کو کیا بتائیں کہ ہمارا دن دفتر میں کتنی مشکل سے گزرتا ہے۔ کام کرنے کو جی چاہتا ہے اور نہ آرام ملتا ہے۔ کام تو خیر ہم پہلے بھی واجبی ہی کرتے تھے، البتہ ایسے اعصاب شکن ماحول میں کوئی آرام کیسے کر سکتا ہے؟ گھر پہنچتے تو شام کو کسی نہ کسی دوست کے ہاں جا دھکتے یا کسی دوست کو اپنے ہاں آن دھکنے کی دعوت دیتے۔ غضب خدا کا، ہر دو صورتوں میں ہمیں سیاسی گفتگو ہی سننے کو ملتی۔ پرسوں ہم

کل ہر طرف سیاست کی ہانپل بلکہ آج ہانکار مچی ہوئی ہے۔ دھرنے، نعرے، وعدے، ناچ گانے، تقریریں، ایک سے بڑھ کر ایک بیان..... ٹی وی ریڈیو اور اخبارات کی تو جیسے لائٹری بلکہ چاندی اور سونا نکل آیا۔ مگر سیاست سے دلچسپی نہ رکھنے والے میری طرح بے حد بوریت محسوس کرتے ہیں۔ آپ سوچیں گے کہ بھلا یہ بھی کوئی بوریت کے دن ہیں؟ حکومت مخالف مظاہرے ہوں یا اپوزیشن کی نازک پوزیشن، حکومت

مجھے سیاسی عاشقوں سے بچاؤ

جہاں تہاں سیاست پہ ہونے والی گفتگو کے ڈسے ایک بیزار پاکستانی کی دہائی

افتخار حسین

کے کھوکھلے دعوے ہوں یا مظاہرین کے جذباتی نعرے، ہر ایک چینل "سب سے پہلے" خبر نشر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تب جیسے یہ کہنے کی سعی ہوتی ہے: "پہلے آئیے اور پہلے پائیے۔" اب ایسے میں بھلا کوئی بور کیوں ہوتا؟ لیکن قارئین! یہی ماحول ہماری

قرآن حکیم اور اسوۃ رسول کریم ﷺ

حضرت علامہ محمد اقبال کے میکوڈ روڈ والی کوٹی میں قیام کے زمانے کی بات ہے۔ ایک ملاقاتی آپ کے ہاں تشریف لائے اور دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔

ملاقاتی: آپ نے مذہب، اقتصادیات، سیاسیات، تاریخ اور فلسفہ وغیرہ علوم پر جو کتابیں ابھی تک پڑھی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ بلند پایہ اور حکیمانہ کتاب آپ کی نظر سے کون سی گزری ہے؟
علامہ: (کرسی سے اٹھ کر اندر جاتے ہوئے) آپ ذرا ٹھہریے میں ابھی بتاتا ہوں۔ (اندر سے ایک کتاب لاتے ہوئے۔)

یہ قرآن کریم۔

(مکالمات اقبال پر پروفیسر راشد (ملک)

انہیں ملنی چاہیے۔ میرے بھائی کو کیوں بیس سال یہ سزا جھیلنا پڑی؟

"اور ابا جان! آپ کیوں اپنے بیٹے کے لیے معاشرے کی اور اپنی بیمار ذہنیت سے نہیں لڑے؟ مولوی صاحب، آپ کیوں لوگوں کو سمجھانا بھول گئے کہ مالک اپنے حقوق سے غفلت پر تو معاف فرما سکتا ہے مگر حقوق العباد کی غفلت پر معافی نہیں دے گا۔ فیضان کو آپ سب نے قتل کیا، میں نے قتل کیا کہ میں بھی اسے ظلم سے نہ بچا سکا۔ آج ذہنی طور پر کمزور انسان مگر بظاہر ایک صحت مند معاشرے کی اصلیت عیاں کر گیا۔"

یہ کہتے کہتے میں بے ہوش ہو گیا، شاید اس بیمار معاشرے سے فرار یا فیضان سے خوابوں کی دنیا میں ملنے کے لیے! اب میں آپ سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کہیں آپ بھی تو کسی فیضان کو قتل نہیں کر رہے؟

جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

ابا کے پاس پہلی دفعہ ہمارے گھر عشاء پر آئے۔ جب فیضان پیاس سے مجبور ہو کر پانی پینے کمرے سے نکل آیا۔ پاس نے جب ایک جوان لڑکے کو فیڈر میں پانی پیتے دیکھا تو ان کی ایسی ہنسی چھوٹی کہ ہنستے ہنستے آنکھوں سے پانی جاری ہو گیا۔ ابا کے تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔ پاس کے جانے کی دیر تھی کہ ابا اسے گریبان سے پکڑ کر پینے لگے۔ میں اور اماں خون کے آنسو رو رہے تھے مگر چپ سا رہے۔ اسی کمرے کی قید میں ڈھی فیضان جہان فانی سے کوچ کر گیا۔

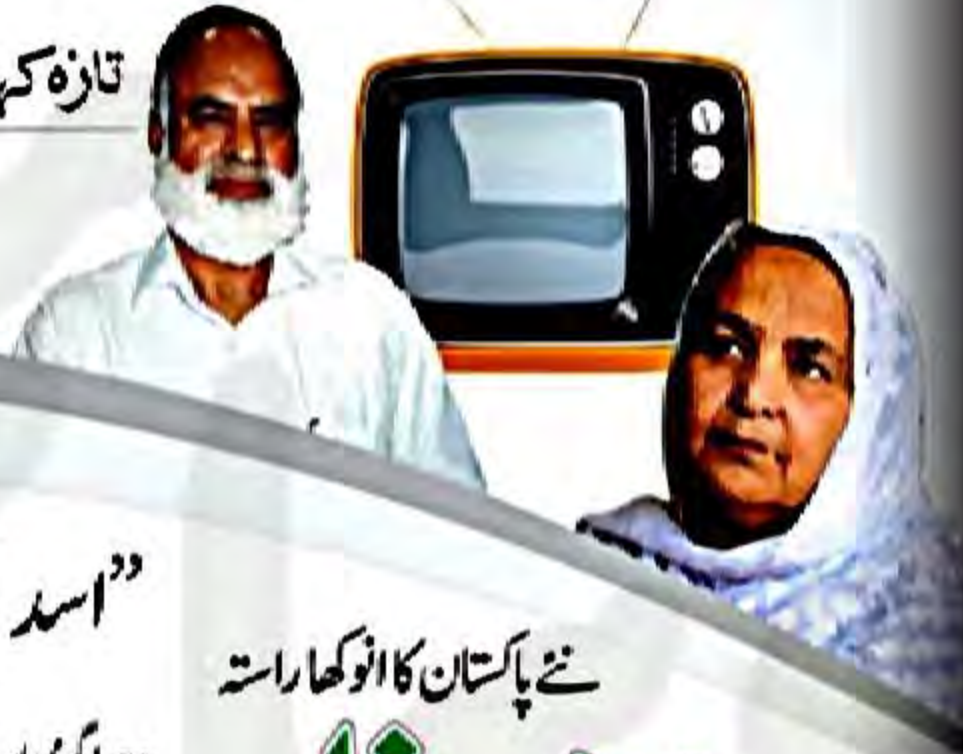
.....☆.....

صغیر بن رہی تھیں۔ فیضان کے زخموں سے داغدار جسم کو بے داغ سفید کفن نے چھپا لیا۔ لیکن میری آنکھوں کے سامنے دنیا گھوم رہی تھی۔ وہ جو مجھے سب سے زیادہ عزیز تھا، اپنا بے جان لاش چھوڑ کر چلا گیا۔

نماز جنازہ پڑھائی جانے والی تھی کہ میرے منہ سے لڑخ خیز چیخ نکل گئی۔ میں جیسے بیدار ہو گیا اور دوڑ کر فیضان کی لاش سے لپٹ کر رونے لگا۔ ابا مجھے سنبھالنے آئے تو میں ہلک گیا۔

"ڈاکٹر جھوٹ بولتا ہے کہ فیضان دماغ کی نس پھننے سے مرا۔ اسے میں نے مارا، اسے آپ نے مارا، اسے ادھر کھڑے ایک ایک شخص نے مارا ہے۔ آخر اس معاشرے کو کس نے اجازت دی کہ وہ فیضان کی زندگی اس پر تنگ کر دے؟ اس کی ذہنی کمزوری کا مذاق اڑانے والے یہ کیوں بھول گئے کہ وہ کسی کو صحت مند ذہن عطا نہیں کر سکتے۔ جب ایک مالک نے ہی سب کو تخلیق کیا تو کوئی اس بنیاد پر کتر یا برتر کیسے ہو سکتا ہے؟ اگر صحت مند ذہن والے بیمار ذہنیت کے مالک ہیں تو سزا تو

تازہ کہانی



بیٹا! سائنس نے اس قدر ترقی کیسے کر لی کہ
”اسلہ“ ایک ہی کمرے میں سونے والے دو
انسانوں میں سے ایک کو سردی لگتی ہے اور
دوسرا گرمی اور پسینے کی شکایت کرتا ہے؟ یہ ترقی سائنس کی
ہے یا دماغ کا فتور؟“ رشید صاحب نے صبح صبح ناشتا
کرتے ہوئے خاصی سنجیدگی سے یہ سوال بیٹے سے کیا۔
یہ سن کر رشید بیگم کا ہاتھ چائے ڈالتے ڈالتے رک سا
گیا۔ وہ اپنے تاثرات ہرگز نہ چھپا سکیں بولیں ”یہ سراسر
دماغ کا فتور ہے۔ غضب خدا کا اس شدید گرمی میں بجلی
کے بل کے خیال سے تمہارے ابا کو سردی لگتی ہے۔ میں

نئے پاکستان کا انوکھا راستہ

دھرنا

ملکی حالات کی طرح دادا دادی کے مسائل کا حل
بھی کسی نادیدہ قوت کے ہاتھوں میں چلا گیا.....
قومی امور کی ایک شوخ و شنگ قلمی تصویر

سالہ محبوب



2014 Pa

اردو ڈائجسٹ

WWW.PAKSOCIETY.COM

2014 Pa

اردو ڈائجسٹ 90

باغی مرید

ہم کو تو میر نہیں مٹی کا دیا بھی
گھر بھر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن
شہری ہو دیہاتی ہو مسلمان ہے سادہ
ماندہ نماں بیچتے ہیں کعبے کے برہمن
نذرانہ نہیں سود ہے جہان حرم کا
ہر فرقہ سالوں کے اندر ہے مہاجن
میراث میں آئی ہے انھیں مسیہ ارشاد
زائون کے تصرف میں عقابوں کے نشین!

بارون کی آخری فصیحت

بارون نے کہا وقت ریل اپنے پیر سے
چائے گا کبھی تو بھی اسی راہ گزر سے
پوشیدہ ہے کافر کی نظر سے ملک الموت
لیکن نہیں پوشیدہ مسلمان کی نظر سے
(کلیات اقبال)

حاضری لگا کر واپس، مبادا سپاہیوں یعنی سیاست
کے عاشقوں سے سیاسی گفتگو سنی پڑ جائے۔ ویسے
بھی ہمارے پاس چار مہینوں کے لیے بیرون ملک
گئے ہوئے ہیں۔ ان کی عدم موجودگی کا کچھ تو فائدہ
اٹھانا چاہیے۔

آخر میں ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ وطن عزیز
میں سب کچھ ٹھیک کر دے۔ مظاہروں، لانگ مارچوں
اور کھوکھلے نعروں سے قوم کی جان چھوٹ جائے جنھوں
نے اس ملک کو اندر سے کھوکھلا کر دیا ہے۔

نے اپنے ایک قریبی دوست کو بلایا کہ آؤ گپ شپ
کرتے ہیں۔ اس نے آتے ہی حکومت مخالف
مظاہروں کی حمایت شروع کر دی۔ ہم نے بھی اسے
چائے پلائے بغیر بھیجا۔

کل تو بہت غصہ آیا۔ ایک دوست سے ملنے
گئے۔ اس نے ہمیں بخمایا اپنے بچے کو چائے لانے
بھیجا اور پھر ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔ ہم
بہت خوش تھے کہ چلو سیاسی باتوں کی نوبت نہیں آئے
گی۔ مگر یہ کیا! ہمارے دوست نے ٹی وی چلایا اور
دیکھنے سے پہلے ہی حکومت کے حق میں دھواں دھار
تقریر کرنے لگا۔

بوریت کے آثار ہمارے چہرے سے عیاں
ہونے لگے۔ ہم اجازت لینے ہی والے تھے کہ چائے
آگئی۔ محض چائے ہوتی تو شاید ہم بھاگ کھڑے
ہوتے۔ مگر گرم گرم پکوزوں کی خوشبو نے جیسے قدم ہی
جھکڑ لیے۔ بہت کہا کہ ہمیں جانے دو، ہم سیاست کی
باتیں نہیں سن سکتے۔ مگر پکوزوں کی خوشبو بھی کہ ہمیں
ایک قدم آگے نہ جانے دیا۔

ہم چائے پینے لگے اور پکوزوں کے ساتھ خوب
انصاف کیا۔ دوست کیا کہہ رہا تھا، کچھ پتا نہ چلا۔
چائے ختم کی، پلیٹ میں سے آخری پکوزا اٹھایا اور
دوست سے یہ کہتے ہوئے اجازت چاہی کہ گھر میں آنا
ختم ہے۔ میں تو وہ لینے جا رہا تھا کہ راستے میں تمہارے
پاس رک گیا۔ (حالانکہ آنا تو ہم گندم کا پھواتے ہیں
بس وہاں سے بھاگنے کا بہانہ چاہیے تھا)

قارئین کرام! اب ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ
کسی ہوٹل کا رخ نہیں کریں گے کیونکہ وہ ان دنوں
سیاسی گفتگو کے اڈے بن چکے۔ دفتر جائیں گے اور

اے سی چلاتی ہوں وہ سردی سردی کہتے اُسے بند کر دیتے ہیں۔ کمرابند کھڑکیاں بند چکھا بند اور اے سی بھی۔ پھر مجھے کہتے ہیں کہ اتنے ٹخنڈے کمرے میں بھی تمہیں گرمی لگ رہی ہے؟ ان کا منصوبہ یہی ہے کہ بڑھیا شاید خود نہ مرے تو میں خود ہی گرمی اور جس سے اسے مار دوں۔“ وہ خاصے غصے میں تھیں۔

ایک ہی کمرہ ایک ہی عمر کے دو افراد اور دونوں کا جسمانی درجہ حرارت اتنا مختلف! بھلا بتاؤ کیسے ممکن ہے؟ دراصل تمہاری امی کے مزاج کی گرمی اب ان کے جسم میں داخل ہو چکی۔ اسی لیے انہیں ساری رات گرمی لگتی ہے۔ ہمیں دیکھو سکون سے ٹخنڈے ٹخنڈے سوتے ہیں۔“ رشید صاحب بیگم کے غصے سے قطعی بے نیاز پھر شروع ہو گئے۔

”ایک تو ساری رات بجلی آتی ہی کم ہے۔ اوپر سے جی آتے ہی تمہارے ابا کو سردی لگنے لگتی ہے۔ آدھا گھنٹا اے سی چلے تو تھر تھر کا پھینے لگتے ہیں۔ میں شرطیہ کہہ سکتی ہوں کہ یہ لگی ٹخنڈے نہیں بجلی کے متوقع بل سے ہوتی ہے۔ اب اس عمر میں نہ بچوں کی فیس ہے نہ شادیوں کی ٹکڑا اپنی پنشن سے صرف بجلی کا بل ہی تو دینا ہے۔ دو ماہ دے لیں مگر میری جان کے دشمن تو نہ بنیں۔“ اماں نے ابا جان کو کھری کھری سناٹیں۔

”اسد! تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔“ رشید صاحب پھر سے بیٹے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”ابا جان! ابا کیسے جیسے سردی لگتی ہے وہ کھیں اوزہ لے۔ کیونکہ سردی کا علاج تو آسان ہے مگر گرمی کا نہیں۔“ بیٹا ماں باپ کی ٹوک جھونک سے بخوبی واقف تھا لہذا سادہ سادہ ساحل پیش کر دیا۔

”نہیں بیٹا! کھیں سے کام نہیں چلے گا اپنے ابا کو تو

اس سردی گرمی میں لحاف نکال دو۔“ رئیس بیگم نے لقمہ دیا۔ ”اچھا ایک تو اے سی کا بل دو اور دوسرے لحاف اوزہ.....“ رشید صاحب بولے۔

”دیکھا دیکھا سردی لگنے کی اصل وجہ سامنے آگئی۔ آپ یوں کریں مچھن میں چکھا کا چارپائی ڈال کر سو جایا کریں۔ نہ دل پر بوجھ ہوگا نہ ٹخنڈے لگے گی۔“ رئیس بیگم نے صل پیش کر دیا۔

”دراصل تم مجھے گھر سے نکالنا چاہتی ہو۔ بڑھا ریٹائرڈ ہر وقت تمہارے سامنے جو پڑا ہوں۔“ رشید صاحب کا لہجہ یہ کہتے وقت خوب سنجیدہ بلکہ رنجیدہ ہو جایا کرتا۔

”ہر بات کا الٹا مطلب نکالیں گے۔ جو سوچنا ہے سوچیں بس اس گرمی میں مجھ پر رحم کریں اور ناشتا کرنے دیں۔“ رئیس بیگم نے بیٹے بہو اور بچوں کے سامنے جھگڑا بڑھانے سے بہتر جانا کہ ناشتے پر توجہ دی جائے۔

”ابا جان! میں نے آپ کے کمرے میں لگانے کے لیے نیائی وی خریدی ہے۔ آج دیوار میں فٹ ہو جائے گا۔ آپ اپنے ٹخنڈے ٹخنڈے کمرے میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھا کیجئے گا۔“ اسد بولا۔

”نہے بیٹا! تمہارے ابا صبح سے شام تک وہی سیاہی ناک شو دیکھیں گے اور جیسے سیاستدان ٹی وی میں بیٹھ کر لڑتے ہیں ویسے ہی مجھ سے لڑیں گے۔ میرے پسندیدہ پروگرام تو خذ ہی ہیں یا ڈرامے۔ اب بیک وقت دو طرح کے پروگرام کیسے چل سکتے ہیں؟ ابھی تو صرف اے سی پر لڑائی ہوتی ہے تم دوسرا جھگڑائی وی کا شروع کرانے لگے ہو۔“

”آپ دونوں کی شادی ہوئے پچاس سال ہو چکے۔ ہم سب بہن بھائی پڑھ لکھ کر اپنے اپنے گھر ہار والے ہو گئے مگر آپ دونوں کی یہ ٹوک جھونک ہنوز جاری ہے۔ کبھی

کبھی ایک دوسرے سے صلح صفائی سے بھی بات کر لیا کریں۔“ اسد بے صدا احترام سے بولا۔

”ساری صلح صفائی کی کوششیں کیا میں کروں؟ جن جن کر میرے پسندیدہ لیڈروں کی برائیاں کرتے ہیں۔ میرا دل جلتا ہے اور یہ خوش ہوتے ہیں۔ ابھی کل تمہاری بیٹی کو اردو شاعری پڑھاتے ہوئے وصال پار کی مثال اپنی اور میری شادی سے دی گئی۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر میری برائیاں تشریح میں لکھوائیں اور تو اور دو تین اشعار بھی میرے خلاف ہی انہیں یاد آئے۔ بتاؤ جھگڑا کون شروع کرتا ہے؟“ رئیس بیگم بولیں۔

”یہ تو چور کی ڈاڑھی میں تنکا ہونا! تشریح میں بھی اپنا ذکر سمجھ رہی تھیں ورنہ حیدر علی آتش نے انہیں نہ کبھی دیکھا نہ سوچا۔“ رشید صاحب نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

”ابا جان! آپ ہی امی کا خیال کر لیا کریں۔ اب بہنے ساس کی حمایت کی۔“

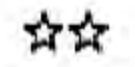
”یہ کیا خیال کریں گے جان بوجھ کر ایسی کہانیاں سناتے ہیں جس میں چڑیل ہانکل ان کی دادی جیسی ہو۔ ہر اخلاقی سبق میرے لیے ہوتا ہے۔“ رئیس بیگم جھٹ بولیں۔

”یوں کرو ابا جان کے لیے ایک موٹا سا کھیس نکلاؤ اور ان کے کمرے میں رکھو دینا۔ ٹی وی والے آئیں تو امی جان اور ابا جان کے مشورے سے لگوا لینا۔“ اسد بیوی کو ہدایات دیتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ رشید صاحب بھی اپنا اخبار لیے باہر چل دیے۔

رشید صاحب ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر تھے۔ متحرک زندگی گزارنے اور بچوں کو اخلاقی تعلیم سے آراستہ کرنے کے بعد اپنی تمام ذمے داریوں سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ اب تمام دن اخبارات پڑھنا اور ٹی وی دیکھنا ہی ان کا مشغلہ تھا۔

رئیس بیگم گھر بیٹو خاتون تھیں۔ اب اپنی تمام ذمہ داریاں بہو کے سپرد کر زیادہ وقت عبادت یا ذکر اذکار میں صرف کرتیں۔ ذیابیطس کی مریضہ ہونے کی وجہ سے اب ان کے لیے زیادہ متحرک ہونا ممکن بھی نہ تھا جس سے رشید صاحب خوب چڑتے۔

اگلے روز ان کے کمرے میں ٹی وی بھی لگ گیا۔ رشید صاحب نے اپنی کرسی مین ٹی وی کے سامنے رکھ لی۔ وہ سارا دن ٹی وی دیکھنا چاہتے تھے۔ چند روز رئیس بیگم نے برداشت کیا۔ آخر کار دونوں میں خوب جنگ ہوئی۔ اسد ہاپ کے لیے ہیڈ فونز لے آیا تاکہ اماں کے آرام میں ٹی وی کی آواز خلل نہ ڈالے مگر رشید صاحب کے ہمہ وقت تہرے بند کرنا کسی کے بس میں نہ تھا۔ رئیس بیگم کی فرمائش پر بڑے بیٹے نے ان کے لیے جدید لیپ ٹاپ بھیج دیا تاکہ وہ اس پر اپنی مرضی کے پروگرام دیکھ لیا کریں۔ یوں سائنس کی ترقی نے دونوں بزرگوں کی زندگیوں میں سکون پیدا کر دیا۔ مگر اب کھٹ پٹ کی جگہ سرد مہری لیتی گئی۔



”اسد سنیے! آج کل اماں ابا کی بول چال بند ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے ناراض ہیں۔ ایک دوسرے کے کام بھی نہیں کرتے۔ ساتھ بیٹھ کر کھانا تک نہیں کھاتے..... ایک دن بہو نے شوہر کی تہہ ساس سر کے ہاتھی سرد روپے کی طرف کروائی۔“

”تمہارا وہ ہم ہوگا..... دونوں اپنے اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ اچھا ہے جھگڑا ختم ہو گیا۔“ اسد نے جواب دیا۔

”نہیں ہا! جھگڑا بہت بڑھ گیا ہے۔ دادا جان اب

دادی کی دو انیس بھی نہیں لاکر دیتے۔ دادی ان کے کپڑے الماری میں نہیں رکھتیں۔" یہ عازرہ تھی دادا دادی کی ناراضی سے خوب واقف۔

"بابا پتا ہے کل کیا ہوا جب ہم پھپھو کے ہاں دعوت پر گئے تھے تو دادا نے کھانا کیوں نہیں کھلایا؟ جبکہ پھپھو نے ان کے پسندیدہ پائے پکائے تھے۔" عازرہ نے جھک کر سرگوشی کے انداز سے بتایا۔

"ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی....." اسد نے وہی وجہ بتائی جو بابا جان نے کہی تھی۔

"نہیں بابا! اصل میں دادی جان ان کے دانت ساتھ نہیں لے کر گئی تھیں۔ دادا جان کو ہمیشہ وہی یاد دلاتی تھیں کہ دعوت میں جاتے وقت دانت لگالیں یا ساتھ رکھ لیتی تھیں۔ مگر ناراضی کی وجہ سے دونوں کام نہ ہو سکے۔ اس لیے دادا جان بھوکے رہے اور کسی کو بتایا بھی نہیں۔"

اسد اپنی بیٹی کی بات سن کر مسکرایا مگر ساتھ ساتھ اسے یہ فکرتانے لگی کہ اگر ناراضی بڑھی تو معاملہ خراب نہ ہو جائے۔ بڑھاپے اور اس سے وابستہ بیماریاں ناراضی کی متحمل نہیں ہو سکتی تھیں۔

"بیٹا! دادا جان اور دادی کی دوستی کیسے کرائی جائے؟" اسد نے بیگم اور بچوں کی رائے لی۔

"بابا! دونوں کو ایک دوسرے کی طرف سے تحفے دے کر۔" بچوں نے تجویز دی۔

"نہیں بیٹا! دونوں سمجھ جائیں گے کہ یہ تحفے آپ لوگوں نے دیے ہیں۔" اسد نے تجویز رد کر دی۔

"دونوں کو اکٹھے گھومنے پھرنے بھیج دیتے ہیں۔" اسد کی بیوی نے رائے دی۔

"دونوں ایک کمرے میں ساتھ رہتے ہوئے اس

قدر "بیٹھی بیٹھی" گفتگو کرتے ہیں گھومنے کیا خاک جائیں گے..... بابا جان تو امی کو کہیں چھوڑ چھوڑ کر آ جائیں گے۔ کہیں گے کہ تم ہو گئی۔" اسد جل کر بولا۔

"یوں کریں دونوں کو سعد بھائی کے پاس اسلام آباد بھیج دیتے ہیں۔ ماحول بدلے گا تو تعلقات بہتر ہو جائیں گے۔"

اسد کو یہ مشورہ کچھ بہتر لگا۔ بولا "اچھا میں سعد بھائی سے بات کرتا ہوں کہ امی لہا کو کچھ دن اسلام آباد بلا کر خوب گھمائیں۔ یوں یقیناً حالات بہتر ہو جائیں گے۔" اسد کچھ پر امید ہوا۔

"بابا! جب دادا دادی اکیلے ہوں تو صرف سیاست پر بات کرتے ہیں۔ دادی کو نواز شریف اچھا لگتا ہے اور دادا جان کو زرداری۔ بلکہ کبھی کبھی دادی کو چڑانے کے لیے وہ عمران خان کی بھی تعریفیں کرتے ہیں۔ پھر دونوں کی ایسی لڑائی ہوتی ہے کہ نہ پوچھیں۔ موجودہ بات چیت کی بندش بھی یقیناً کسی بحث کا نتیجہ ہے۔" عازرہ نے جو دونوں کی لاڈلی پوتی تھی دادا دادی کی خفیہ خبر باپ کو پہنچائی۔

"بہر حال اسلام آباد کا موسم یقیناً دونوں کے تعلقات بہتر کر دے گا۔ میں سعد بھائی سے بات کرتا ہوں۔" اسد فون ملانے لگا۔

امی جان اور بابا جان کو منانا اور پھر اسلام آباد بھیجنا خاصا مشکل کام تھا۔ آخر بڑا بیٹا خود گاڑی لے کر آیا اور ماں باپ کو ساتھ لے گیا۔ سعد کی بیوی ملازمت کرتی تھی۔ صبح صبح وہ بھی دفتر چلی جاتی۔ اسد اور سعد دونوں کا خیال تھا کہ تنہائی پاتے ہی اماں لہا اپنے جھگڑے بھول جائیں گے۔

☆☆

"اسد آئیے یہ دیکھیے!"

اسد بیوی کی تیز چیخ پر گھبرا کر دوڑتا ہوا لاؤنج میں آیا۔ "کیا ہوا؟ کیا دھرنے والوں نے ریڈ زون پر قبضہ کر لیا؟"

موجودہ حالات میں سب کی نگاہیں دھرنے پر لگی تھیں۔ ٹی وی کے سامنے بیٹھی بیوی کی چیخ سن کر پہلا خیال یہی آ سکتا تھا۔

"یہ دیکھیں۔" بیگم کی انگلی ٹی وی اسکرین پر تھی جہاں دھرنے کے مناظر دکھائے جا رہے تھے۔

"کیا ہوا؟ کیا ہم پھٹ گیا؟" اسد کو قصہ آنے لگا۔ ٹی وی پر معمول کی خبریں جاری تھیں۔

"غور سے دیکھیں! سامنے دھرنے کے شرکا میں ایا جان کھڑے جموم رہے ہیں۔ ہاتھ میں جھنڈا بھی ہے۔" اسد نے غور کیا مناظر خاصے واضح تھے۔ رشید صاحب پر جوش انداز میں جھومتے دکھائی دے رہے تھے۔ "لماں کہاں ہیں؟ سعد بھائی کو فون کریں اور پوچھیں دونوں کہاں گئے ہیں؟" اسد کی بیوی حیران ہو کر بول رہی تھی۔

اسی لمحے ٹی وی پر دوسرے دھرنے کے مناظر دکھائے جانے لگے۔ میوزیکل کنسرٹ کے برعکس دوسری طرف محفل سماع منعقد ہو رہی تھی۔ قوال حضرات نے سماں باندھ رکھا تھا۔ وہیں ایک کرسی پر جمومتی رئیسہ بیگم بھی نظر آ گئیں۔ وہ بقیہ خواتین کے ساتھ زمین پر نہیں بیٹھ سکتی تھیں سو انھوں نے اپنے لیے کرسی رکھی ہوئی تھی۔

اسد کو بھائی سے پوچھے بنا ہی جواب مل گیا..... دونوں اپنے اپنے لیڈروں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے الہام و تقسیم سے دور ہو چکے تھے۔ اسد ٹی وی دیکھتے ہوئے آئندہ حالات کی پیشین گوئی سے قاصر رہا۔ کیونکہ ملکی

مشاقی رُحہ علم دین

راج پال نامی ایک ہندو نے ایک دل آزار کتاب لکھی جس میں رسول کریم ﷺ کی شان میں گستاخی کی گئی تھی۔ اس حرکت سے مسلمان آزرہ اور مشتعل ہو گئے۔ لاہور کے ایک نوجوان علم دین نے اسے قتل کر کے اس کی وریدہ دینی کی سزا دی۔ جب یہ خبر حضرت علامہ محمد اقبال کو پہنچی تو علامہ نے کہا:

"اسیں گلاں کر دے رہے تے ترکمانا دا منڈا ہاڑی لے گیا۔"

(ہم ہاتھ ہی کرتے رہے اور بڑھئی کا بیٹا ہاڑی لے گیا۔) علم دین نے کھلم کھلا اقرار کیا کہ قتل میں نے ہی کیا ہے لیکن اس کے رشتے دار چاہتے تھے کہ کسی طرح جان بچ جائے اور وہ اقبالی بیان سے منحرف ہو جائے۔ وہ لوگ علامہ کے پاس آئے اور کہا: آپ بڑے نامی گرامی وکیل ہیں۔ آپ علم دین کو بچانے میں ہماری مدد کریں۔

علامہ نے فرمایا: اس نے بڑا نیک کام کیا ہے اس سے جھوٹ بھلا کر کیوں اس کی نیکی برباد کرتے ہو۔ اگر وہ شہید بھی ہو گیا تو بھی کوئی ہات نہیں۔

(نقوش اقبال)

حالات کی طرح ان بزرگوں کے معاملات کا حل بھی کسی ناویدہ قوت کے پاس تھا۔

"بابا! کیا ہو گا؟" عازرہ نے دادا کو اسکرین پر دیکھ کر سوال کیا۔

"دادی سے صلح ہو جائے گی؟"

"پتا نہیں۔" اسد بڑبڑایا..... ملکی حالات کا اثر ان کے خانگی معاملات پہ پڑ چکا تھا۔ معلوم نہیں یہ اثرات کہاں تک جانے تھے۔ ادھر سب سے بے نیاز بہت سے لوگ جموم اور گارہے تھے۔ گانے کی تال پر نیا پاکستان بن رہا تھا۔

سوم مغربی علاقہ جہاں دیچوک سیکٹر تنازع ہے۔ یہ لداخ کے ضلع لیہہ کا حصہ اور تبت کے ساتھ واقع ہے۔

چوتھے تنازع علاقے، آکسائی چن پر ۱۹۶۲ء کی چین بھارت جنگ کے دوران چینی فوج نے قبضہ کر لیا تھا۔ جموں و کشمیر کے ساتھ ملا ہوا یہ علاقہ ۳۷ ہزار مربع کلومیٹر رقبہ رکھتا ہے۔

چین اور بھارت پچھلے ۶۳ برس میں کوشش کے باوجود درج بالا سرحدی تنازع حل نہیں کر سکے۔ اس دوران قدامت پسند ہندو راہنماؤں نے کانگریسی لیڈروں کی نسبت چین کے خلاف زیادہ سخت رویہ اپنایا۔ مثال کے طور پر اپنی انتخابی مہم میں نریندر مودی نے چین کی پالیسیوں کو "توسیع پسندانہ" قرار دیا تھا۔

بھارتی وزیر اعظم کو سخت پیغام

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ تنازعات کے باوجود دونوں ممالک کی باہمی تجارت بڑھتی رہی..... اور آج چین ہی بھارت کا سب سے بڑا تجارتی ساتھی ہے۔ پچھلے نو ماہ میں دونوں کے مابین ۵۰ ارب ڈالر (۵۰ کھرب روپے) کی تجارت ہو چکی۔ گو اس تجارت کا پلڑا چین کے حق میں جھکا ہوا ہے۔

پچھلے نو مہینوں میں چین نے ۳۱ ارب ڈالر کا مال بھارت بھجوا یا برآمد کیا۔ جب کہ بھارتی صرف ۹ ارب ڈالر مالیت کا اپنا سامان ہی چین بھجوا سکے۔ یاد رہے چین کے بعد متحدہ عرب امارات امریکا اور سعودی عرب بھارت کے نمایاں تجارتی ساتھی ہیں۔

صدر شی جینپنگ کے دورے سے قبل بھارت میں چینی سفیر نے بیان دیا تھا کہ چین ملک میں "۱۰۰ ارب

وسیع علاقہ بھارتی فوجیوں کی نظر میں آ گیا۔ چینی فوج کو بھارتی فوجی چوکی سے خطرہ محسوس ہوا۔ چنانچہ اگلے ہی دن ۵۰۰ چینی فوجی علاقہ ہمارے میں پہنچ گئے۔ انہوں نے کرینوں اور بلند وزروں کے ذریعے راتوں رات دو کلو میٹر طویل سڑک تعمیر کر ڈالی۔

اگلی رات بھارتی فوجیوں نے وہ سڑک کھود دی۔ چینیوں نے اس اقدام پر کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا تاہم کچھ ہی دور چینی فوج نے ڈیرے ڈال دیے۔ یہ دیکھ کر بھارتی فوج نے بھی کمک منگوائی۔ یوں لداخ کے پہاڑی علاقے میں چین اور بھارت کے ایک ایک ہزار فوجی آمنے سامنے آ گئے۔ یہ خطرہ محسوس ہونے لگا کہ دونوں طاقتور پڑوسیوں کی جھڑپ ہو سکتی ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اسی تنازع کے دوران چینی صدر، شی جینپنگ نے ۱۷ ستمبر کو بھارت کا دورہ کیا۔ جب وہ ۱۹ ستمبر کو واپس وطن گئے، تو ہمارے میں بھارتی چین محاذ جاری تھا۔ یہ حقیقت عیاں کرتی ہے کہ دونوں ممالک کے مابین بڑھتی باہمی تجارت بھی برسوں پرانی دشمنی کی آگ سرد نہ کر سکی۔

چار تنازع علاقے

چین اور بھارت کے مابین سرحد پر تین علاقوں پر تنازع چل رہا ہے۔ اول مشرقی علاقہ جہاں چینیوں کا دعویٰ ہے کہ بھارتی ریاست، اروناچل پردیش چین کا حصہ ہے۔ اس علاقے میں "۹۹ ہزار مربع کلومیٹر" علاقہ تنازع ہے۔

دوم وسطی علاقہ جہاں چین اور بھارت کی سرحد پر ہالیہ پہاڑ واقع ہیں۔ اس علاقے میں "۳ ہزار مربع کلومیٹر" رقبے پر تنازع چل رہا ہے۔

عسکریات

اعتراض کیا۔ وجہ یہ کہ چین علاقہ دیچوک کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔ یہ تنازع جاری تھا کہ ۱۸ ستمبر کو بھارتی فوج نے قریب ہی واقع ایک اور گاؤں، ہمارے کے پہاڑوں پر فوجی چوکی قائم کر لی۔ چونکہ یہ چوکی اونچائی پر واقع ہے لہذا لائن آف ایکچوئل کنٹرول سے پرے چین کا

۱۸ اگست کی بات ہے، بھارتی فوجی دیچوک (Demchok) میں ایک نہر کی کھدائی کرنے لگے۔ یہ گاؤں لداخ میں چین اور بھارت کی سرحد (لائن آف ایکچوئل کنٹرول) کے بالکل قریب واقع ہے۔ دیچوک سے صرف ایک کلو میٹر دور دریائے سندھ بہتا ہے۔ دیچوک کے پار چینی فوج موجود تھی۔ اس نے نہر کی تعمیر پر



بلند و بالا پہاڑوں پر مسلح فوجی

چین اور بھارت کی سرحدی جھڑپیں

ارہوں ڈالر کی سالانہ تجارت کے باوجود دونوں بڑی طاقتیں

اپنے تنازعات دور نہ کر سکیں تو وہ جنگ کو جنم دے سکتے ہیں

ذیشان حسن



ڈالر کی سرمایہ کاری کرے گا۔ مگر دونوں ممالک کے مابین صرف ۲۰ ارب ڈالر مالیت کے معاہدے ہی ہو سکے۔ اس پر بھارتی ماہرین معاشیات کو خاصی مایوسی ہوئی جو چینی صدر سے بہت توقعات لگائے بیٹھے تھے۔ یہ ناکامی کئی وجوہ کی بنا پر انجام پائی۔

ایک خیال یہ ہے کہ چینی بعض شرائط منوا کر کسی ملک میں سرمایہ کاری کرتے ہیں۔ بھارتی وزیراعظم، نریندر مودی نے یہ شرائط ماننے سے انکار کر دیا۔ لہذا ۱۰۰ ارب ڈالر مالیت کے معاہدے منسوخ کر دیے گئے۔ یاد رہے، بھارتی وزیراعظم بیرونکار بھارتیوں کو ملازمتیں دینا چاہتے ہیں۔ جب کہ چین غیر ممالک میں جو منصوبے شروع کرے، وہاں عموماً چینی افسر و کارکن ہی کام کرتے ہیں۔

بھارتی ماہرین عسکریات کو امید تھی کہ صدر شی جنپنگ بھارت سے دفاعی معاہدہ بھی کریں گے۔ ۲۰۰۳ء میں چین اپنی شمالی سرحد کے ضمن میں ایسا ہی معاہدہ روس کے ساتھ کر چکا۔ لیکن لداخ میں سنگین عسکری ٹکراؤ کی وجہ سے چینی صدر اس محاذ سے بھی دور ہٹ گئے۔

حقیقتاً چینی و بھارتی راہنما، دونوں سرحدی تنازعات کے سلسلے میں کوئی متفقہ بیان ہی نہ دے سکے۔ یہ حقیقت عیاں کرتی ہے کہ دونوں ممالک سرحدی تنازعات پر اپنے موقف سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں۔ اگرچہ ان کے درمیان تھارت بہت بڑھ چکی۔

بعض ذرائع کا دعویٰ ہے کہ چینی فوج کے جرنیل نریندر مودی کے سخت رویے سے برگشتہ تھے۔ ان

کے ساتھ چینی حکومت کے ایسے اعلیٰ عہدے دار بھی مل گئے جو صدر جنپنگ کی چلائی اپنی کرپشن مہم کے مخالف ہیں۔ لہذا چینی جرنیل لداخ میں بھارتیوں سے ٹکراؤ کو بڑھاتے چلے گئے تاکہ بھارتی وزیراعظم کو سخت پیغام دے سکیں۔

مودی کی خفیہ خواہش

یاد رہے، نریندر مودی نے انتخابی مہم میں بھارتی عوام سے وعدہ کیا تھا کہ وہ سخت سکیورٹی پالیسیاں تشکیل دیں گے۔ یہی وجہ ہے، جب لداخ میں مجادلہ شروع ہوا، تو وزیراعظم مودی نے وہاں ۱۵۰۰ بھارتی فوجی بھجوانے کا حکم دیا تاکہ علاقے میں بھارت کو عددی برتری حاصل ہو جائے۔

بھارتی حکمران طبقے میں موجود ”عقابوں“ نے مودی کی اس روش کو سراہا جو ماضی کے برعکس تھی۔ ماضی میں پنڈت نہرو سے لے کر منموہن سنگھ تک، کانگریسی حکومتوں کا یہی دتیرہ رہا کہ وہ چینیوں کے ساتھ ”پنکا“ لینے سے گریز کرتے تھے۔

بھارتی ماہرین عسکریات کا دعویٰ ہے کہ کانگریسی حکومتوں کی بزدلی کے باعث چینی شیر ہو گئے۔ رفتہ رفتہ وہ بھارتی علاقوں میں کئی کلومیٹر اندر گھس آئے۔ مگر اب مودی سرکاری چینیوں کو منہ توڑ جواب دینا چاہتی ہے۔ یہی بات بھارتی وزیراعظم کے اقدامات سے عیاں ہے۔

نریندر مودی نے حکومت سنبھالنے کے پہلے ہی ہفتے حکم دیا کہ لائن آف کنٹرول پر ”۷۲“ تیزویرانی (Strategi) سڑکیں فوری طور پر تعمیر کی جائیں۔ مدعا یہ ہے کہ علاقے میں آمدورفت کا

نظام مضبوط بنایا جاسکے۔ یاد رہے، آکسائی جن سے لے کر ارونا چل پردیش تک چینی اپنے علاقے میں چھوٹی بڑی سڑکوں حتیٰ کہ ریل کی پنٹریوں کا مربوط جال بچھا چکے۔

قرائن بتا رہے ہیں کہ نریندر مودی کے دور میں بھارت چین خاصیت میں اضافہ ہوگا۔ وجہ یہ کہ مودی فطرتاً لڑاکا اور جنگجو آدمی ہے۔ ایسے لوگ کمزوروں پر دھونس جمانا اپنا حق سمجھتے اور چاہتے ہیں کہ وہ سر جھکا کے زندگی گزاریں۔ مودی یہی رویہ پاکستان، بنگلہ دیش اور سری لنکا کے ساتھ اختیار کر سکتا ہے۔ لیکن وہ چین کو اپنے اشاروں پر نچانے کی قدرت نہیں رکھتا۔

چینی حکومت کا دعویٰ ہے کہ سال رواں میں بھارتی فوج نے ”۳۱۰ ہزار“ کنٹرول لائن کی خلاف ورزی کی۔ جب کہ بھارتی حکومت الزام لگاتی ہے کہ چینی فوجی ”۳۳۳ ہزار“ اس کی سرزمین پر گھس آئے۔ اگر دونوں قوتوں کے مابین گرما گرمی بڑھی، تو بین الاقوامی سرحد پر خلاف ورزیاں بڑھ سکتی ہیں۔ اور یہ امر ان کے مابین اختلافات میں اضافہ کرے گا۔

یاد رہے، شعبہ عسکریات میں چین، بھارت سے کہیں آگے ہے۔ لڑاکا طیاروں کی تعداد ہو یا ٹینک، ہر عسکری شعبے میں چینی بھارتیوں پہ فیصلہ کن برتری رکھتے ہیں۔ مگر اب مودی سرکار اگلے سات آنٹھ برس میں جدید ترین اسلحہ خریدنے پر کھربوں روپے خرچ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ مقصد یہی ہے کہ خود کو بطور عالمی طاقت پیش کیا جاسکے۔ مگر کبھی کبھی اسی قسم کی خواہشیں زوال کا سبب بھی بن جاتی ہیں۔

مرد مومن

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان!

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

ہمائیہ جبریل امیں بندۂ خاکی ہے اس کا نشین نہ بخارا نہ بدخشان

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن!

قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

فطرت کا سرود ازلی اس کے شب و روز آہنگ میں یکتا صلح سورۂ رحمن

بنتے ہیں مری کارمہ فکر میں انجم لے اپنے مقدر کے ستارے کو تو پہچان!

(کلیات اقبال)

دیا جائے گا۔ پولیس نے مزید کارروائی کی خاطر اسے میرے شہر برشلہ بھجوا دیا۔

مجھے نومبر کی دسویں شام فون کال وصول ہوئی کہ وکیل کے دفتر میں اردو ترجمان کی ضرورت ہے۔ دفتر پہنچی تو وہاں چھوٹے قد کی عام شکل و صورت والی لڑکی بیچے کے ساتھ بیٹھی نظر آئی۔ سخت سردی میں اس نے لان کا سوٹ ہلکا سا سویٹر اور چپل پہن رکھی تھی۔ یہ کپڑے تو برطانیہ کی گرمی میں بھی ناکافی ہیں سردی کیا روکتے چناں چہ وہ کانپ رہی تھی۔ بچے کو دیکھا تو یقین نہ آیا کہ وہ اس کا ہو سکتا ہے۔ کسی انگریز کا لگتا تھا: گورا چٹا نیلی آنکھیں! میں نے اس سے پوچھا ”کیا اس کا باپ ایسا ہی خوبصورت ہے؟“

ایک غریب ماں کی بیٹی تھی۔ وہ اپنی ماں اور سہمی بھائی کے ساتھ ایک معمولی کوارٹر میں مقیم تھی۔ اس کا بھائی کسی کے ہاں گھریلو ملازم تھا۔ غربت سے تنگ آ کر کسی نے ایف اے کیا تو اپنے شہر میرپور کے ایک اسٹور میں ملازمت کر لی۔ کسی نے مجھے اپنی کہانی وکیل کے دفتر میں سنائی۔ اس کا خاندان اسے مانچسٹر کے ایک پولیس اسٹیشن چھوڑ گیا تھا۔ اس کا ویزا ختم ہو چکا تھا اور وہ غیر قانونی تارکین وطن کے زمرے میں آتی تھی۔ ساتھ چھ ماہ کا بیٹا بھی تھا۔ پولیس اسے پاکستان واپس بھجوا دیتی لیکن کسی نے انسانی حقوق کے تحت درخواست جمع کروادی اور استدعا کی کہ اسے پاکستان نہ بھجوا دیا جائے کیونکہ وہاں اسے مار

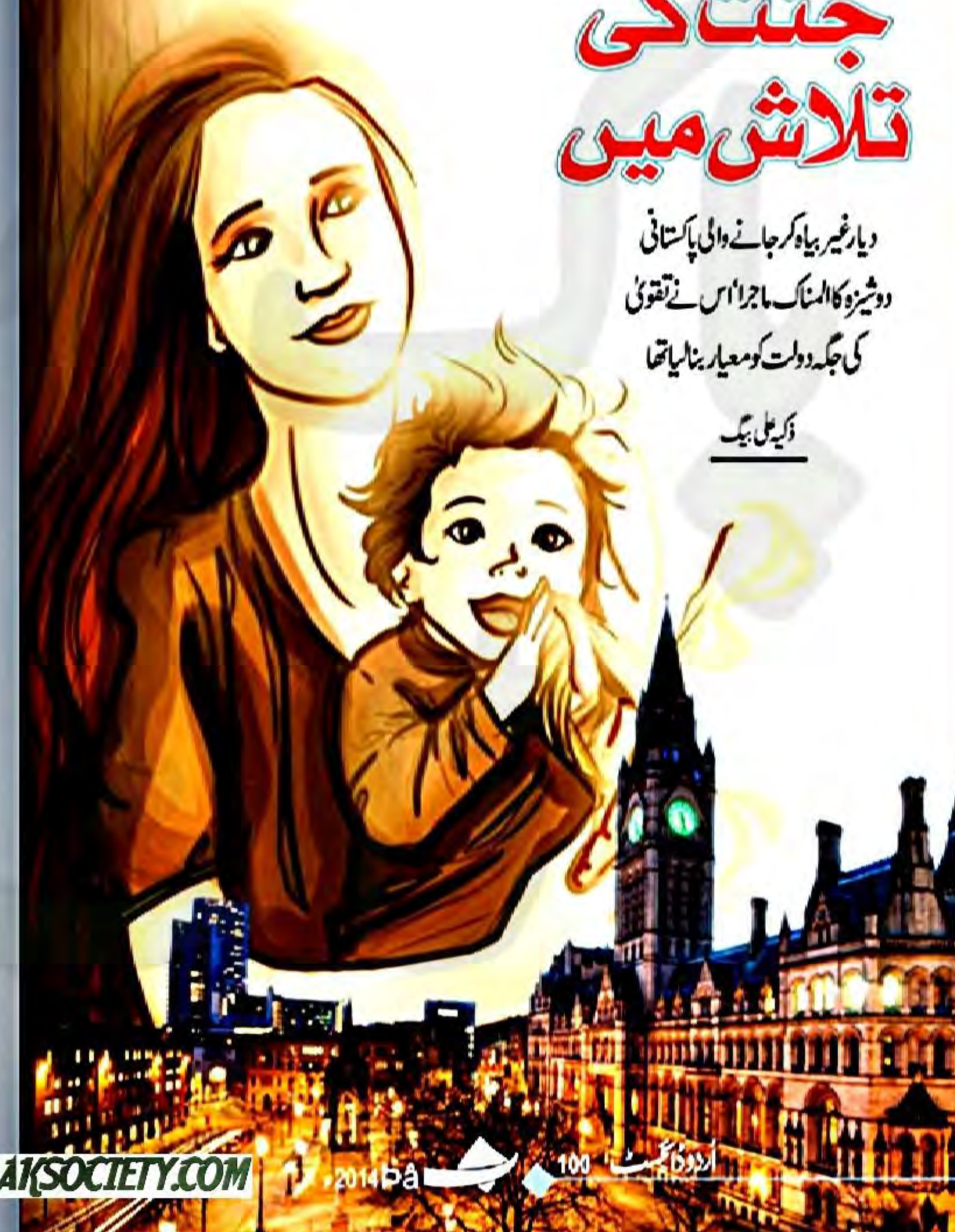
جگ بیٹی

خواہشوں کی ماری ایک لڑکی

جنت کی تلاش میں

دیباغیر بیاہ کر جانے والی پاکستانی
دو شیزہ کا المناک ماجرا اس نے تقویٰ
کی جگہ دولت کو معیار بنا لیا تھا

ذکیہ بیگ



میں نے مشاہدہ کیا ہے کہ ایک قوم کی ترقی میں سب سے اہم کردار سوچ کا ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ تعمیر سوچ ہی ایک عمدہ معاشرے کو جنم دیتی ہے۔ ہمارے سوچنے کا ذہنگ تقدیر کو بھی بدل سکتا ہے۔ مثلاً پاکستان کے زلزلہ ۲۰۰۵ء میں ہزاروں لوگ مارے گئے۔ لیکن یہی زلزلہ جب جاپان میں آیا تو اموات کی شرح بہت کم تھی۔ کیا آپ نے کبھی اس حقیقت پر غور کیا کہ خدا ایک غیر مسلم قوم پر کیوں مہربان ہے؟ وجہ ہے کہ انھوں نے صرف تقدیر پر بھروسہ نہیں کیا بلکہ مسلسل کوشش سے ایسی ایجادات تخلیق کیں جن کے بل پر انھیں معلوم ہو جاتا ہے کہ کب زلزلہ آئے گا۔ چناں چہ وہ اس سے نمٹنے کا بندوبست کر لیتے ہیں۔ وہ ایسے آلات ایجاد کر چکے جو زیر زمین پوشیدہ آفات کا پتہ لگاتے ہیں۔

یہ سب کرشمہ نہیں بلکہ تعمیر سوچ کا نتیجہ ہے۔ ہم بد قسمتی سے صدیوں کی جہالت میں دھنسے ہوئے ہیں اور اس سے نجات بھی نہیں چاہتے۔ مثلاً یورپ میں لڑکا لڑکی اگر متوسط طبقے سے تعلق رکھیں تو تب بھی یونیورسٹی کی فیس کے لیے قرض لے سکتے ہیں۔ وہ تعلیم مکمل ہونے پر ادا کیا جا سکتا ہے۔ اس میں کوئی شرم کی بات نہیں سمجھی جاتی۔ اسی طرح لڑکے لڑکی کو پسند سے شادی کرنے کا پورا اختیار ہے۔ وہ شادی کا خرچہ کما کر پورا کرتے اور خود گھر بناتے ہیں۔ اس طرح انھوں نے اپنے والدین کی کئی مشکلات آسان کر دیں۔

ہمارے ہاں تو لڑکی پیدا ہوتے ہی بوجھ بن جاتی ہے۔ اس کی تعلیم پر یہ سوچ کر لڑکے سے کم خرچ کیا جاتا ہے کہ جہیز بھی تو بننا ہے۔ لڑکی خوبصورت نہ ہو تو قدم قدم پر مشکلات سے سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔ اور لڑکے والے بھی رشتہ دے کر جیسے لڑکی والوں پر احسان کرتے ہیں۔

(ذکیہ بیگ)

اس نے اقرار کیا۔ میں نے ہنس کر کہا ”گویا تم نے گورارنگ اور نیلی آنکھیں دیکھیں تو پھسل گئیں۔“

وہ حسرت سے بولی ”ہاجی! آپ کو میرے حالات کیا معلوم!“

مجھے احساس ہوا کہ مجھے ایسی بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔

وکیل پھر اس سے روایتی سوالات کرنے لگا۔ سی پانچ سال کی تھی جب اس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ ماں نے لوگوں کے کام کاج کر کے انھیں پالا۔ وہ میر پور آزاد کشمیر کے رہنے والے تھے۔ اس شہر کے کئی باسی برطانیہ میں آئے ہیں۔ انگلینڈ کے بڑے شہروں میں ان کے محلے آباد ہیں۔ ان کے رہن سہن میں کوئی تبدیلی نہیں آئی وہ گھر میں میر پوری زبان بولتے ہیں۔ میر پوری کھانے پکاتے اور اپنی روایات پر سختی سے عمل کرتے ہیں۔ آپ ان کی اولاد کو دیکھ کر یقین نہیں کر سکتے کہ وہ انگلینڈ جیسے جدید ملک کی پیداوار ہیں۔ ان کی چوتھی نسل برطانیہ میں پیدا ہو چکی لیکن اب بھی تعلیم و تربیت کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتا۔ تجارت ہی سب سے مقبول ذریعہ آمدن ہے۔

برطانیہ میں مقیم بعض دولت مندوں نے میر پور میں برطانوی طرز پر سپر مارکیٹیں بنا رکھی ہیں۔ سی بھی ایسی ہی ایک سپر مارکیٹ کے چیئرمین ڈیپارٹمنٹ میں کام کرنے لگی۔ وہیں اس کی ملاقات برطانیہ سے آنے والے علی سے ہوئی۔ وہ ایک خوبصورت مرد تھا۔ اسے اپنی مردانہ وجاہت کا اندازہ بھی تھا۔

سی کو اندازہ ہو گیا کہ وہ انگلینڈ پلٹ ہے کیونکہ عموماً ایسے لوگ ہی وہاں آتے تھے۔ علی نے کچھ جیولری پسند کی اور مل ادا کیا۔ رات بھر سی اس کے متعلق سوچتی رہی۔ یہ

کتنے خوش نصیب لوگ ہیں! سی کے لیے ان کی دنیا الف لیلا تھی وہ اسے دیکھ تو سکتی تھی لیکن چھوٹے پانی۔

علی جہاں دیدہ و مرد تھا۔ وہ کسی میں پوشیدہ حسرتوں کے طوفان بھانپ گیا۔ وہ روزانہ بہانے بہانے سے سی کے شعبے میں آنے لگا۔ جلد ہی اس نے اپنی لچھے دار باتوں سے سی کو اپنا اسیر کر لیا۔ اب وہ اور سی ساتھ گھومنے پھرنے لگے۔ وہ اسے تحفے دیتا۔ لڑکی کی ماں کو اعتراض ہوا تو علی نے سی سے شادی کا وعدہ کر لیا۔ اس نے سی کی والدہ کو خود ساختہ درد بھری کہانی سنائی۔ یہ کہ اس کی شادی مرضی کے خلاف خالہ کی بیٹی سے انگلینڈ میں کر دی گئی۔ وہ آزاد خیال لڑکی ہے جس نے علی کی زندگی کو جہنم بنا رکھا ہے۔ علی کی دو بیٹیاں ہیں اور اس کی بیوی لڑکا پیدا نہیں کر سکتی۔ مگر وہ لڑکے کی شدید خواہش رکھتا ہے۔

ماں بیٹی میں شاید شعور کی کمی تھی یا وہ اس معاشرے کی پیداوار تھیں جہاں مجبوری انسان سے سوچنے سمجھنے کی طاقت چھین لیتی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سی کی حسرتوں نے حرص کی شکل اختیار کر لی۔ چنانچہ ہونی ہو کر رہی اور وہ دونوں علی کے جال میں پھنس گئیں۔ علی نے ایک ریستوران میں اس سے منگتی کی اور طلاقی زبورات دیے۔ سی اور اس کی ماں نے صرف باہر سے ایسے ریستوران کی شکل دیکھی تھی۔ ماں اپنی بیٹی کی قسمت پر بہت نازاں ہوئی۔

برطانوی قانون کی رو سے دوسری شادی کرنے کے لیے ضروری ہے کہ شوہر پہلی بیوی کو طلاق دے۔ علی اس قانون سے خوب واقف تھا کہ دوست اسی راہ سے گزر چکے تھے۔ بہر حال اس نے سی کا وزٹ دینا لگوا دیا۔ اسے کئی جھوٹ بولنے پڑے۔ اس نے سی کو بھی ہار

کر لیا کہ اسے سفارت خانے کیا کہنا ہے۔

سپنوں کے جھولے جھولتی سی نے ایک دفعہ بھی نہ سوچا کہ جس رشتے کی بنیاد جھوٹ پر رکھی جا رہی ہے اس کا انجام کتنا بھیانک ہو گا۔ بھوک اور لالچ کی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ ویسے بھی سی جس بد قسمت معاشرے میں رہتی تھی وہاں ایک غریب اور یتیم لڑکی کو شاید کوئی قبول نہ کرتا۔ ہم ذات پات کے پھندوں میں الجھے زندگیاں مشکل سے مشکل تر خود بناتے اور اپنی زبوں حالی کا الزام غیر ملکیوں کو دیتے ہیں۔ حالانکہ آسان زندگی اپنانے میں مغربی ہم سے کہیں آگے نکل چکے۔ آپ ملکہ برطانیہ ہی کو دیکھ لیجیے۔ اس نے اپنے پوتے کی شادی عام گھرانے میں کر دی کیونکہ شہزادہ ولیم کو کیٹ ملٹن پسند تھی۔

بہر حال سی کو ان مسائل سے کیا لینا تھا وہ تو غربت اور حسرتوں کی بھٹی میں جل رہی تھی۔ بالآخر سی کو جنت کی کنبلی مل گئی جب اس کا وزٹ ویزا لگ کر آیا۔ سی کو گویا خوابوں کا محل مل گیا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ انگلینڈ میں شادی شدہ مرد کو دوسری شادی کی اجازت نہیں۔ وہ ماچسٹر پہنچی تو علی نے چند روز اسے ایک گھر میں رکھا۔ پھر دوستوں کو بلا کر اس سے نکاح کر لیا۔

برطانوی قانون کی نظر میں اس نکاح کی کوئی وقعت نہ تھی لیکن سی نے خود کو بیابا بیوی کا درجہ دے دیا۔ وہ علی کو نخرے دکھاتی۔ ویسے ہی مطالبے کرنے لگی جیسے ایک بیابا بیوی کرتی ہے۔ گھر دیر سے آنے پر جھگڑا پہلی بیوی کے گھر جانے پر جھگڑا۔ سی فرمائشوں پر جھگڑا۔ سی واقعی سمجھدار نہ تھی، علی کا دل رفتہ رفتہ اس سے بھرنے لگا۔ آخر وہ اسے مجبور بنانا چاہتا تھا اور نہ بیوی تو اس کے پاس تھی ہی۔ چنانچہ وہ گھر کے کم چکر لگانے لگا۔

ایک دن انکشاف ہوا کہ سی ماں بننے والی ہے۔ اب علی گھبرا گیا۔ سی کا وزٹ ویزا ختم ہو چکا تھا۔ بہر حال وہ اسے اسپتال لے گیا۔ علی چونکہ برطانوی شہری تھا لہذا کسی سے شناخت نہ ہو چکی گئی۔ اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔

چند روز بعد وہ اپنے گھر چلی آئی۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ کچھ ہفتوں بعد علی کی بیوی نے دونوں کو ہزار میں اکٹھے دیکھ لیا۔ وہ سمجھ گئی کہ اس کا شوہر دوسری شادی کر چکا۔ مگر وہ سمجھدار عورت تھی۔ اس نے مجبوراً سی کو قبول کر لیا۔ ویسے بھی وہ ویسی نہ تھی جیسا علی نے بیان کیا۔ اس کا گھر اسی طرح بچ سکتا تھا۔ اب وہ دوسرے تیسرے دن سی کے گھر آئی، اس کے بیٹے سے کھیلتی اور اکثر اسے اپنے ساتھ لے جاتی۔

ایک روز سی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا جب وہ رات گئے تک بچے کو وہاں نہ لائی۔ سی نے فون کر کے اپنی سوکن کو خوب سنائیں۔ جلد ہی دونوں مہاں بیوی آدھمکے۔

”تم نے میری بیوی سے فون پر بدتمیزی کیوں کی؟“ علی نے غصے سے پوچھا۔

”میں بھی تمہاری بیوی ہوں۔“ سی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

علی کی بیوی طنز سے ہنس پڑی۔ سی کو اور غصہ آ گیا۔

”تم کیوں نہیں؟“ وہ بولی۔

”تم علی کی بیوی نہیں، برطانوی قانون کی نظر میں اس کی رکھیل ہو۔“

یہ سن کر سی کے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا۔ ”اچھا بیٹا تو اس کا ہے نا۔“ اس نے دلی جذبات چھپاتے ہوئے ناز سے کہا۔

”یہ تو ف عورت! یہاں بچے کے پیدائشی سرٹیفکیٹ پر

باپ کا نام صرف اسی صورت آتا ہے جب تم اس کی قانونی بیوی ہو جاؤ۔“

مکی کو دیوار کا سہارا لیتا پڑا۔ ”میں پولیس کو سب کچھ بتا دوں گی۔“ اس نے دھمکی دی۔

”میں تمہیں خود پولیس اسٹیشن لے جاتا ہوں۔“ علی غصے سے بولا۔ اس نے پھر مکی کو کار میں بٹھایا اور پولیس اسٹیشن لے جا کے چھوڑ دیا۔

پولیس والوں نے مکی کو بتایا کہ ناکانی ٹیوٹوں کی وجہ سے وہ اس کی مدد نہیں کر سکتے۔ آخر اس نے جھوٹ بول کر دیزالیا تھا۔ چنانچہ مکی غیر قانونی تارکین وطن کے زمرے میں شامل ہو گئی۔ پولیس والوں نے اسے سیاسی پناہ لینے کو کہا اور سرکاری وکیل کے پاس بھیج دیا۔ اسے ماچسٹر سے برشلہ لاکر ایک گھر میں کرا دیا گیا۔ اس سے میری پہلی ملاقات وکیل کے دفتر میں ہوئی۔

☆☆

اسے سردی سے ٹھنڈے دیکھ کر مجھے بہت ترس آیا۔ میری پیشہ دارانہ ذمہ داری پر انسانیت غالب آگئی۔ میں نے وکیل سے کہا کہ اسے کچھ گرم کپڑے لے دیتی ہوں۔ وکیل بولا ”Zakia, you are very kind lady“ (ذکیہ! آپ بہت رحم دل خاتون ہیں) میں نے بچے کو بھی گرم کپڑے دلوائے۔ کھانے پینے کا سامان لے کر دیا۔ میرے گھر میں بہت سارا سامان رکھا تھا مثلاً فالٹو دیگیجیاں برتن تھیلے اور جوتے وغیرہ وہ بھی اسے دے ڈالے۔

لیکن پھر انسانی فطرت کا عجیب نظارہ دیکھا۔ مکی نے غربت اور افلاس کی شدت دیکھی تھی اسی لیے اس کے رویے میں ہوس سی تھی۔ وہ سب چیزوں کو ہاتھ بھر کر لیتی اور احسان مند بھی نہ ہوتی۔ میں اسے اپنا

قناعت

☆ قناعت اختیار کرو، کیونکہ قناعت ایک ایسا مال ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔ (الحدیث)

☆ جتنی روزی اللہ نے تمہارے لیے مقرر فرمادی ہے اس پر راضی اور مطمئن رہو تو تم سب سے زیادہ غنی ہو جاؤ گے۔ (الحدیث)

☆ مومنوں میں سب سے اچھا قانع ہے اور سب سے برا طامع۔ (الحدیث)

☆ طمع فقر محتاجی پیدا کرتی ہے اور قناعت فنی کر دیتی ہے۔ (حضرت عمرؓ)

(آمد رمضان، مارل والا)

احسان مند بنانا بھی نہیں چاہتی تھی لیکن اس کے لالچی رویے نے مجھے بد دل کر دیا۔ اسے یہ فکر نہ تھی کہ وہ اپنا پاسپورٹ سنبھالے یا اس کے ویزے کا کیا بنتا ہے۔ اسے بس یہ فکر تھی کہ میں اس کا گھرنٹ نئی ایشیا سے بھر دوں۔ میں نے اسے ضرورت کی سبھی چیزیں لاکر دیں مگر وہ عیاشی کا سامان چاہتی تھی۔

وہ عجیب و غریب فرمائش کرنے لگی۔ کبھی کہتی کہ اسے الیکٹریک بوتل چاہیے جو چالیس پونڈ کی آتی تھی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ اکثر انگریز بھی بچوں کی بوتل اہلتے پانی میں جراثیم سے پاک کر لیتے ہیں۔ جبکہ چالیس پونڈ میں اس کا ہفتہ وار خرچہ چل سکتا ہے۔ وہ غصے سے بولی ”نہ لاکر دیں، آپ کو میری خواہش کی کیا پروا۔“ میں اسے کیسے سمجھاتی کہ میں خود کماتی اور بچت بنا کر خرچ کرتی ہوں۔ اسے پھر برقی کیتلی چاہیے تھی کیونکہ باورچی خانے میں رکھی کیتلی اسے پسند نہ تھی۔ میں اس کی فرمائشوں سے تنگ آنے لگی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ علی کو کیسے

پریشان کرتی ہوگی۔

دفتر ہوتی تو اس کے فرمائشوں بھرے ایس ایم ایس آنے لگتے۔ اسے قلعی پروا نہ تھی کہ اس کے مستقبل کا کیا بنے گا۔ وہ بس اپنی حسرتیں پوری کرنے کی چاہ میں گم تھی۔ اسے برشلہ پسند نہ تھا۔ چنانچہ حکومت پر زور دینے لگی کہ اسے ماچسٹر میں بڑا گھر دیا جائے۔ میں نے سمجھانے کی کوشش کی کہ اسے سرکار کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس کو اتنی سہولیات دی گئی ہیں مگر وہ مجھ سے ناراض ہو گئی۔ آخر سرکار اسے ماہانہ خرچہ الاؤنس دینے لگی تو میں نے سکھ کا سانس لیا۔ میری خود ساختہ ذمہ داری ختم ہوئی۔ میں نے پھر اس سے رابطہ کم کر دیا۔

ایک دن اس نے فون کیا۔ پتا لگا حکومت نے گاڑی بھیجی ہے تاکہ اسے واپس ماچسٹر لایا جاسکے۔ وہ شکایتوں کا انہار لگائے ہوئے تھی۔ ”مجھے جھوٹی گاڑی کیوں دی گئی؟ انہیں معلوم ہونا چاہیے تھا کہ میرے پاس بہت سارا سامان ہے اور مجھے پک اپ کی ضرورت ہے۔“

میں نے حیرت سے پوچھا ”کون سا سامان؟“ اس نے کہا ”باجی فوڈ اور کیا۔“ معلوم ہوا اس نے گھر کھانے پینے کے سامان سے بھر رکھا ہے۔ آنے اور چاول کے بڑے بڑے تھیلے اور دیگر ایشیا ہمسایوں سے مانگ کر مختلف چیزیں بھی جمع کر رکھی تھیں۔ اسے سامان نہ لے جانے کا دکھ شادی ناکام ہونے سے بھی زیادہ تھا۔ اس کے اندر دہنی حسرتوں نے حرص کا خوفناک رنگ اختیار کر لیا تھا۔ وہ مادی خواہشات کے علاوہ کچھ اور دیکھنے سے قاصر تھی۔

ماچسٹر پہنچ کر فون آیا کہ اسے ایک ہوسٹل میں ٹھہرایا گیا ہے اور کھانے کو کچھ میسر نہیں۔ میں نے اپنے جاننے

والوں کو فون کیا۔ انہوں نے اس کے کھانے کا انتظام کر دیا۔ وکیل اس سے بہت ناراض ہوا کیونکہ وہ آخری لمحات میں بھی ایشیا سمیٹ رہی تھی۔ اور اپنے اہم کاغذات جن میں پاسپورٹ شامل تھا برشلہ ہی چھوڑ آئی۔

یہ سچی کہانی افسانے سے زیادہ دلچسپ ہے۔ یہ انسانی نفسیات کا انوکھا پہلو سامنے لاتا ہے کہ نت نئی ایشیا پانے کی بھوک انسان کو کس قدر مادہ پرست بنا دیتی ہے۔ پھر ہمارے نظام تعلیم نے بھی اسے شعور دینے میں کوئی کردار ادا نہیں کیا۔ مکی کو شعور ہی نہیں کہ زندگی میں اور بہت کچھ اہم ہے۔

ماچسٹر میں آخر اسے بڑا گھر مل گیا۔ میں اس سے ملنے گئی تو حسب دستور گھر مختلف سامان اور کھانے پینے کی چیزوں سے بھرا پڑا تھا۔ اس کے معاملے کو انسانی تجارت کا کیس قرار دیا گیا۔ چنانچہ حکومت برطانیہ نے اسے پانچ سال کا ویزہ دے ڈالا۔ اس کو خرچہ بھی حکومت دیتی ہے۔ بچے کی تعلیم اور طبی سہولیات مفت ہیں۔ پانچ سال بعد کیا ہوگا؟ وہ اس سے بے نیاز ہے۔ وہ دوسری شادی نہیں کرنا چاہتی اور اپنے حالات میں خوش ہے۔

ہات پھر وہیں پہنچتی ہے کہ وہ ایسے معاشرے کی پیداوار ہے جہاں مادہ پرستی انسانی روح کو چکل چکل ہم نے دولت کو تقویٰ کی جگہ معیار بنا کر اپنی زندگی خود ہی مشکل بنالی۔ اگر ہم بھی معاشرے میں عورت کی عزت کو فروغ دیں تو کئی عورتیں علی جیسے خود غرض اور ہوس پرست مردوں کی سمیٹ چڑھنے سے بچ جائیں گی۔ کئی بیوائیں سکون سے جی سکیں گی اور ان پر کوئی آواز نہ کسے گا۔ ذرا سوچئے جب ہم جینز دینے لینے کی غیر اسلامی رسم ہی ختم کر دیں تو ہم سب کے والدین اور آنے والی نسلیں بھی سکون سے جی سکیں گی۔

ورک اخبار اور رسالے ہیں جن کے ذریعے وہ امریکی و یورپی عوام میں اپنے خیالات و نظریات کی ترویج کرتی ہیں۔ حادثہ نائن الیون کے بعد تو ان کی سرگرمی میں شدت آگئی اور وہ اسلام و مسلمانوں کے خلاف زہرا لگنے لگیں۔

حیرت انگیز امر یہ ہے کہ مغربی میڈیا ان کے متعلق بہت کم خبریں اور مضامین شائع کرتا ہے۔ بس کبھی کبھی کوئی کیونست رسالہ یا اخبار انتہا پسند تنظیموں اور ان کے راہنماؤں کی سرگرمیوں پر جہی چشم کشا رپورٹ چھاپ دیتا ہے۔

مغربی میڈیا میں نمایاں نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ امریکی معاشرے میں یہ تنظیمیں بہت اثر و رسوخ رکھتی ہیں۔ قریباً ہر امریکی میڈیا کمپنی کا مالک یا اعلیٰ افسر کسی نہ کسی انتہا پسند تنظیم کا رکن ہے۔ حتیٰ کہ یہ تنظیمیں امریکی حکومت کی پالیسیاں بنانے میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ اسی لیے امریکی و مغربی میڈیا میں ان کے خلاف کوئی تحریر سامنے نہیں آتی۔ مزید برآں مغربی میڈیا ویسے بھی یورپ اور امریکا میں جنم لینے والے انتہا پسندانہ رجحانات کو نمایاں نہیں کرتا تاکہ دنیا والوں کی توجہ اسلام و مسلمانوں ہی پر مرکوز رہے۔

انتہا پسندوں کا سالانہ اکٹھ

پچھلے دنوں مغربی میڈیا میں نجانے کیسے امریکی انتہا پسندوں پہ ایک چشم کشا مضمون شائع ہو گیا۔ یہ ”دی گید رنگ“ (The Gathering) نامی تنظیم سے متعلق تھا۔ مضمون میں انکشاف کیا گیا کہ یہ ان امریکی کمپنیوں، تنظیموں اور سماجی اداروں کے سالانہ اکٹھ یا تقریب کا نام ہے جو دنیا بھر میں انتہا پسندانہ مسیحی

پادری ہیں جو عیسائیت کو دنیا بھر میں پھیلا نا چاہتے تھے۔ ان میں جرمن فلپ سوسائٹی (۱۶۳۵ء-۱۷۰۵ء) اور آگسٹ ہرمان فرانگے (۱۶۳۳ء-۱۷۲۷ء) نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

درج بالا جرمن پادریوں کی تعلیمات سے مغرب میں اناجیلی تحریک (Evangelicalism) نے جنم لیا۔ اس تحریک کے پیروکار دنیا میں عیسائیت پھیلانے کی خاطر سرگرم ہو گئے۔ انہوں نے ہی مشنری سوسائٹیاں قائم کیں اور انیسویں و بیسویں صدی میں ہندوستان، انڈونیشیا، مسلم افریقی ممالک وغیرہ آتے جاتے رہے۔

رفتہ رفتہ اناجیلی تحریک کے کطن سے خصوصاً کٹر مذہبی نظریات رکھنے والی عیسائی تنظیمیں پیدا ہوئیں۔ ان تنظیموں کا ایک اہم نظریہ یہ ہے کہ جب بیت المقدس میں مسجد اقصیٰ کی جگہ بیکل سلیمانی تعمیر ہوگا تبھی حضرت مسیحی کرہ ارض پر نزول فرمائیں گے۔ چنانچہ یہ امریکی مذہبی تنظیمیں اسرائیلی حکومت کی ہر ممکن مدد کرتی ہیں تاکہ (خدا نخواستہ) مسجد اقصیٰ کو شہید کرنے کی راہ ہموار ہو سکے۔

۲۰۰۶ء میں مشہور امریکی دانشور اور صحافی، تہتر سالہ کیون فلپس کی کتاب ”امریکن تھیوکریسی“ (American Theocracy) شائع ہوئی۔ اس میں کیون نے تفصیل سے بتایا ہے کہ امریکی مذہبی انتہا پسندوں نے ”آئل لابی“ کے ساتھ مل کر کیسے ۲۰۰۳ء میں عراق پر حملہ کرایا۔ امریکا میں انتہا پسند ڈسپینشنلسٹ (Dispensationalists)، عیسائی صیہونی، پینٹیکوسٹل (Pentecostals) وغیرہ کہلاتے ہیں۔

ان انتہا پسند تنظیموں کے اپنے سیکڑوں ٹی وی نیٹ

انکشافات

ہرسال منعقد ہونے والا

امریکی انتہا پسندوں کا خفیہ اکٹھ

”دی گید رنگ“ نامی تقریب کے ذریعے انتہا پسند عیسائی سالانہ ایک کھرب روپے جمع کر لیتے ہیں

سید عاصم محمود



(۱۸۷۲ء-۱۹۷۰ء)

برٹریٹڈرسل

دنیا کے مغرب کا ممتاز فلسفی گزرا ہے۔ اس کا قول ہے: ”انتہا پسندی کسی بھی شکل میں ہو وہ معاشرے کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔“ یہ معقول بات روئے زمین پہ پائے جانے والے سبھی انسانی معاشروں پر فٹ بیٹھتی ہے۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ حادثہ نائن الیون کے بعد مغربی میڈیا نے انتہا پسندی کو صرف اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ تھی کر دیا۔ حتیٰ کہ مقبوضہ کشمیر، فلسطین، ڈیپنیا، برما اور فلپائن وغیرہ میں چلنے والی آزادی کی تحریکیں دہشت گردی کے مترادف قرار پائیں۔

اب یہ واویلا کیا جا رہا ہے کہ اسلامی ریاست عراق و شام، افغان طالبان، القاعدہ، بوکو حرام وغیرہ انتہا پسندی کی علامتیں ہیں۔ مغربی میڈیا میں انڈونیشیا سے لے کر موریتانیہ اور تاجیکستان تک مختلف مسلم ممالک میں پھیلی اسلامی انتہا پسندی کے متعلق آئے دن مضامین شائع ہوتے ہیں اور اسے سب کے سامنے ہوا بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ مذہبی انتہا پسندی نے یورپی ملکوں و امریکا میں جنم لیا جو آج عالم اسلام کی شکست و ریخت میں مصروف ہیں۔ اس مغربی انتہا پسندی کی تاریخ تین سو سال پرانی ہے۔ اس کے معمار وہ عیسائی

خیالات کی ترویج کرتی ہیں۔
 "دی گیدریگ" کے موقع پر دیکھا جاتا ہے کہ نظریات کی ترویج کے منصوبے کس حال میں ہیں اور ان سے کتنا فائدہ ہوا۔ نیز اسی اکتھ میں مزید منصوبے شروع کرنے کی خاطر چندہ بھی جمع کیا جاتا ہے۔ عام طور پر اس چندے کی مالیت ایک ارب ڈالر (ایک کھرب روپے) تک پہنچ جاتی ہے۔

ایک ارب ڈالر چھوٹی رقم نہیں اسی بھاری بھرکم رقم کی بدولت امریکا میں انتہا پسند گروہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف وقتاً فوقتاً مختلف تحریکیں چلاتے اور انہیں ہتام کرنے کی سر توڑ سعی کرتے ہیں۔

دی گیدریگ کی بنیاد ۱۹۸۵ء میں امریکی انتہا پسندوں کی ایک خفیہ تنظیم "دی فیملی" (The Family) کے رہنماؤں نے رکھی تھی جو "دی فیلوپ" بھی کہلاتی ہے۔ ۲۰۰۸ء تک یہ امریکی حکومت میں سب سے زیادہ اثر و رسوخ رکھنے والی عیسائی تنظیم تھی۔ اس کی بنیاد ۱۹۳۵ء میں رکھی گئی۔

۱۹۵۳ء سے اسی تنظیم کے زیر اہتمام ایک خاص تقریب "قومی دعائیہ ناشتا" (National Prayer breakfast) منعقد ہو رہی ہے۔ یہ تقریب دراصل میٹنگوں، عشاءوں اور عصرانوں کا مجموعہ ہے جن میں چوٹی کے امریکی سیاست دان، صنعت کار، کاروباری اور عالمی مہمان شریک ہوتے ہیں۔ کسی ایک عصرانے یا عشاءے میں امریکی صدر بھی شرکت کرتا ہے۔

"دی فیملی" تشہیر سے گریز کرتی ہے۔ نیز اس کے ارکان بھی پراسرار حیثیت رکھتے ہیں۔ تاہم ۲۰۰۸ء میں ایک کتاب "دی فیملی: دی سیکرٹ فنڈ منٹلوم ایٹ دی

مشہور قول ہے: جموت کو بار بار دہرایا جائے تو وہ

ہارٹ آف امریکن پاور" نے تنظیم کی اصلیت اور کارروائیوں کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ یہ کتاب امریکی صحافی جیف شارلت کی تصنیف ہے۔

دی فیملی..... ایک پراسرار تنظیم
 درج بالا کتاب سے پہلی بار افشا ہوا کہ کئی امریکی کارپوریٹوں و ملٹی نیشنل کمپنیوں کے مالک اور ارکان پارلیمنٹ (سینٹ و ایوان نمائندگان) "دی فیملی" کے رکن ہیں۔ ان کا منشا یہ ہے کہ امریکی حکومت عیسائیت کی علم بردار بن جائے اور دنیا بھر میں اس مذہب کی ترویج و اشاعت کرے۔ کتاب کی اشاعت کے بعد یہ مذہبی تنظیم مزید خفیہ ہو چکی۔

دی فیملی کے رسوخ کی وجہ سے انتہا پسند تنظیموں کو امریکی حکومت کے مختلف سماجی پروگراموں مثلاً PEPFA USAID اور دیگر کروڑوں ڈالر کا بجٹ رکھنے والے پروگراموں سے بھاری رقم بھی ملتی ہے۔ یہ بھی انہیں مستحکم بنانے اور پروپیگنڈا پھیلانے میں کام دیتی ہے۔

یاد رہے انہی انتہا پسند تنظیموں کے پروپیگنڈے کی وجہ سے امریکا میں اسلام و مسلمانوں کے خلاف تعصب بڑھ رہا ہے۔ کثیر سرمایہ رکھنے کے باعث یہ اسلام کی تضحیک کرنے والی تشہیری مہمات وسیع پیمانے پر انجام دیتی ہیں۔ مگر امریکی میڈیا ان کی نفرت انگیز اور خطرناک مہمات کبھی نمایاں نہیں کرتا۔ اسی لیے عام امریکی دانش اور القاعدہ کے متعلق تو بہت کچھ جانتا ہے لیکن اپنے آس پاس پھیلے انتہا پسندی کے ناسور سے وہ واقف نہیں۔

مشہور قول ہے: جموت کو بار بار دہرایا جائے تو وہ

بچ بن جاتا ہے۔ امریکی معاشرے میں بھی یہی ہوا کہ نام نہاد اسلامی انتہا پسندی کا اتنا زیادہ چرچا کیا گیا کہ عام امریکی اُسے سچ سمجھ بیٹھا۔

اسلامی انتہا پسندی دراصل اس ظلم و ستم کا رد عمل ہے جو پچھلے تین سو برس سے مغربی استعمار مسلمانوں پر ڈھا رہا ہے۔ اگرچہ اس کا آغاز صلیبی جنگوں سے شروع ہوا۔ پھر عیسائی حکمران اسپین پر قابض ہوئے تو انہوں نے انڈیسی مسلمانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑے۔ بعد ازاں ولندیزی، ہسپانوی، برطانوی اور اطالوی استعمار نے اسلامی ممالک پر دھاوا بول دیا اور بیسویں صدی تک مسلمانوں کو غلام بنائے رکھا۔

بیسویں صدی میں کئی مسلم ممالک کو آزادی تو مل گئی مگر وہاں کا حکمران طبقہ مغربی استعمار کی کاہ لیس کر رہا۔ اسی لیے عالم اسلام و مسائل اور طاقت رکھنے کے باوجود فلسطین، کشمیر، بوسنیا، چیچنیا، قزاقستان، برما، ترکستان وغیرہ میں غیر مسلموں کو ظلم کرنے سے نہ روک سکا اور وہ مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگتے رہے۔

اسی قتل عام کے خلاف مسلم نسل نے تیس چالیس سال قبل مغربی استعمار کے خلاف جہاد شروع کیا۔ تاہم مختلف وجوہ کی بنا پر کئی اسلامی جہادی تنظیمیں انتہا پسند ہو گئیں حتیٰ کہ وہ مسلم ممالک مثلاً عراق، شام، لیبیا، ناہجیریا، پاکستان، یمن، صومالیہ، ازبکستان وغیرہ میں اپنی ہی حکومتوں سے لڑنے لگیں۔ اس خانہ جنگی سے مسلم دشمن طاقتوں نے فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے اسلامی تنظیموں میں اپنے ایجنٹ داخل کر دیے تاکہ وہ خانہ جنگی کی آگ کبھی سرد نہ ہونے دیں۔ چنانچہ آج لیبیا و ناہجیریا سے لے کر پاکستان و افغانستان تک کئی اسلامی ممالک قتل و فساد کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔

آرٹوڈاکسٹ 109

تبدیلی زندہ باد
 "مجھے اسٹیلس کو نہیں، تبدیلی چاہیے!"
 "ہائلک لٹیک ہوا رحمان ملک کے ساتھ، تمام سیاست دانوں کو اسی طرح ایک ایک کر کے نکال باہر کرنا چاہیے۔"
 "نا یہاں پانی ہے نا بجلی۔"
 "یہاں سب کرپٹ ہیں!"
 "اوب مرنا چاہیے ایسے حکمرانوں کو جو عوام کے پیسے پر پیش کر رہے ہیں۔"
 "عوام سسک سسک کر زندگی گزارتی اور بھوکوں مرتی ہے۔ یہ اپنے عالی شان گھروں میں آرام کی نیند سوتے ہیں۔"
 لوگ سیلاب اور قحط سے مرے جاتے ہیں۔ یہ لیڈر بجلی کا پٹروں پر سوار بس ایک نظر ڈال، تصویریں بنوا، چلتے بٹتے ہیں۔ کیا اسی پاکستان کے لیے ہمارے آہاد اجداد نے قربانیاں دیں؟"
 "کیا یہی وہ اسلامی ریاست ہے جس کا خواب اقبال نے دیکھا تھا؟"
 "اس ملک میں کہیں قانون کی حکمرانی نہیں، ہر جگہ لوٹ مار چلی ہے۔ کسی کو قانون کا پاس نہیں۔"
 "میں احتجاج کروں گا! دھرنا دوں گا! ایک ایک ایم این اے کو گریبان سے پکڑ کر، تھیسٹ کے پارلیمنٹ سے باہر لاؤں گا۔ سول ناہرمانی کروں گا۔ کوئی مل اور نہیں کروں گا، نا ہی ٹیکس نہیں دوں گا۔"
 "بس ایک بار تبدیلی آجائے پھر دیکھنا، نہیں چلے گا یہ دی آئی پی گھرا کہیں خاندانی سیاست نہیں چلے گی!"
 "سب کو جواب دینا ہوگا۔ سب کا احتساب ہوگا۔"
 "کوئی نہیں بچے گا۔ جس جس نے عوام کا حق مارا ہے، قانون شکنی کی ہے سب کا احتساب ہوگا۔"
 (ناہید اسرار)

رنگ بدلتی زندگی

ہریل، ہران، ہرلے

وہ فانی اشیا سے دلی لگاؤ رکھتی تھی
مگر ایک معصوم مطالبے نے اسے
حقیقت ازلی سے روشناس کرا ڈالا

فاطمہ نور صدیقی



چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن
کچھ سے بے تحاشا محبت ہو
جاتی ہے، چاہے وہ بے
جان ہی کیوں نہ ہوں۔

☆ ☆ ☆
اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بابا کو
دیکھا، پھر کان کھجایا اور پھر آنکھیں یوں
دیکھنے لگی جیسے اس نے غلط سنا ہو۔
”بیٹا! اسے ساتھ لے جانا مشکل ہے۔
آپ کی امی اور ہمارا ارادہ ہے کہ اسے یہیں بیچ
دیا جائے۔“

بابا کو یقیناً اس رد عمل کی توقع نہیں تھی۔ وہ
بستر پر دو منٹ تک ساکت بیٹھی بابا کو کھتی رہی۔
آخر کار آہستگی سے کھڑی ہوئی۔
”بابا اسے؟“ اس نے ہاتھ سے اشارہ کرتے
ہوئے بے یقینی سے کہا۔
”جی بیٹا..... آپ کی پڑھائی والی میز کو۔“

”بابا!“ مزاحمتی انداز میں بولتے ہوئے اس کی
گول گول آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔
”ارے..... ارے.....“ بابا گھبرا کر تیزی سے
آگے بڑھے اور اسے گلے سے لگا لیا۔
”اسے وہاں لے جانا مشکل ہو گا بیٹا!.....
ہم وہاں تمہیں ایک نئی میز لے دیں گے۔“
اس جھلے سے بیٹی کی تسلی کیا ہوئی، مزید
آنسوؤں میں روانی آگئی۔

”تمہیں مجھے نی نہیں چاہیے۔ آپ
بس اسے ہی لے چلیے کسی
طرح۔“ عام طور پر جلد ہر

بات ماننے والی بیٹی آج اپنے ابا کے سامنے تعلیت سے
کھڑی تھی۔
لاکھ اماں نے سمجھایا، بھائیوں نے زور دیا، بہنوں
نے گلے سے لگا لیا مگر وہ اپنی عزیز از جان میز کے بغیر شہر
سے کوچ کرنے پر راضی نہ ہوئی۔ آخر کار ابا نے بار مان کر
اسے نئے شہر بھجوانے کا انتظام کر دیا۔

جن سے محبت ہو، ان کے دیے ہوئے تحفے بھی جان
سے پیارے ہوتے ہیں۔ پچھلے سال ہی میزک میں پاس
ہونے پر یہ میز گھر والوں نے مشترکہ طور پر اسے تحفے میں
دی تھی۔ لفٹ کی اور بھروسے رنگ کی یہ ٹیس سی میز اسے
پہلی نظر ہی میں بھاگئی۔ اوپر بنے خانے سے لے کر نیچے
پیر رکھنے والی جگہ تک ہر چیز ابا نے خود ڈیزائن کرائی تھی۔
موٹل نے بھی اسے سجانے سنوارنے میں کوئی کسر
نہیں چھوڑی۔ خانے کے دروازوں پر پڑھائی کا ٹائم ٹیبل
اور چھوٹے چھوٹے احوال زریں بڑی خوبصورتی سے لکھ کر
لگائے۔ درمیان کے خانے میں کینڈر اور گھڑی رکھی گئی۔
پڑھنے والے حصے میں ایک خوبصورت پتالہ لکموں سے بھر
کر رکھا گیا۔ ساتھ ساتھ پورے گھر میں بکھری اپنی بے
شمار کتابیں سمیٹ کر شیلف میں ترتیب دیں۔

ایک سال گزرنے کے باوجود اس کے جوش و خروش
میں فرق نہ آیا۔ وہ خوب زور شور سے اپنی میز کی صفائی
ستھرائی کرتی۔ ذرا کسی بہن بھائی نے ترتیب بگاڑنے کی
کوشش کی، وہیں اس کا رونا دھونا شروع ہو جاتا۔ اکثر وہ
میز کے سامنے رکھی کرسی پر آلتی پالتی مارے بیٹھی نظر آتی۔
اسی لیے جب ابا کا دوسرے شہر تقرر ہوا تو میز بھی انتہائی
ضروری سامان کے ساتھ نئے گھر پہنچ گئی۔

☆ ☆ ☆
نئے گھر میں اسے پہلے کے مقابلے میں چھوٹا کمرہ
ملا۔ لیکن اس کی کھڑکی نے جو چھوٹے سے باغیچے میں کھلتی
تھی، خوشی دوہلا کر دی۔ موٹل نے فوراً میز کو کھڑکی کے

قریب لگوا دیا جہاں سے رنگ برنگ پھولوں اور ہری بھری
گھاس سے سجا پانچپن دکھائی دیتا تھا۔
دن آگے بڑھے، مہینے گزرے، سال کا آخری حصہ
شروع ہو گیا۔ ساری باتیں چھوڑ چھوڑ کر وہ پڑھائی میں
جت گئی۔ اتر کے پرچے دینے کے بعد اسے یونیورسٹی
کے داخلہ امتحان کی تیاری کرنی تھی۔ کتابوں، میز اور اس کا
اب واقعتاً دن رات کا ساتھ تھا۔ کتابیں سامنے پھیلانے
کر ہی پر وہ اپنے مخصوص انداز میں بیٹھی رہتی۔ جیسے ہی وہ
اماں کی محنت سے مزید پھلتے پھولتے باغ پر نظر ڈالتی،
دماغ فنانٹ چالو ہو جاتا۔ جو چیز اسے کسی اور جگہ بیٹھ کر
ایک گھنٹے میں یاد ہوئی، وہ وہاں بیس منٹ میں ازبر ہو
جاتی۔ ابا کے بقول ان کی بیٹی کا دماغ میز کے ہی کسی
کونے میں بند تھا۔

اس کی بے تحاشا محنت رنگ لائی اور انجینئرنگ
یونیورسٹی میں داخلہ آرام سے ہو گیا۔ اب خانوں کے
دروازوں پر کہیں کوئی مشکل سوال دنگا اور کہیں کوئی
فارمولا چمکا ہوتا۔ اس دوران کمرے میں اور بھی
تہذیبیاں آئیں کیونکہ وہ فطرتاً ہی تبدیلی پسند تھی۔ کبھی بستر
کی جگہ تبدیلی کرنا کبھی الماری پر رکھے گل دان کو بدلنا
لیکن جو چیز نہیں بدلی وہ میز کی جگہ تھی۔ اماں جو اس کی
گھر بھر میں کارگزار یوں سے تنگ آئی رہتیں، اکثر اس
بات پر حیرت کا اظہار کرتی تھیں۔

تعلیمی میدان سر کرتے کرتے آخر اس کا آخری سال
آ پہنچا۔ اب وہ کافی سمجھدار ہو گئی تھی۔ اپنے شعبے کی ذہین و
فطین اور اساتذہ کی نور نظر طالبہ..... سہیلیاں جنسی مذاق
میں اس کی ذہانت کا راز پوچھتیں تو وہ سادگی سے ایک ہی
جواب دیتی:

”کوئی بھی کام کرنا ہو تو اپنے ارد گرد کے ماحول
کو خوشگوار بنا لو، جیسے میں پڑھنے کے لیے اپنی پسندیدہ
جگہ کا انتخاب کرتی ہوں۔ یوں دماغ پُر سکون ہو کر

غذائیات



ثابت اثناج میں پایا جانے والا

(Gluten) کہلاتا ہے۔ خود یہ پروٹین دراصل دو پروٹینی مادوں، گلایڈین (Gliadin) اور گلوتنین (Glutenin) سے مل کر بنتا ہے۔

گلوٹین آپ کا دشمن تو نہیں؟

چھوٹی آنت کو گلا سڑا دینے والے ایک پروٹینی مادے کا بیان

رضیہ جنیل

سال پہلے کی بات ہے، سولہ سالہ رضیہ جنیل (ایگزیمیا) کا شکار ہوئی۔ والدین نے علاج

ایک

کرایا مگر مرض دور نہ ہوا۔ ایک دن رضیہ کے ماموں امریکا سے آگئے۔ وہ ماہر امراض جلد تھے۔ انھیں پہلے ہی معلوم تھا کہ بھانجی جنیل کا نشانہ بنی ہوئی ہے۔

ماموں تجربے کار معالج تھے، معائنہ کیا، تو جان گئے کہ جلد کی یہ بیماری رضیہ کو کیسے چھٹی۔ دراصل وہ ایک نایاب مرض، سلیک (Celiac) میں مبتلا تھی۔ یہ مرض گندم، جو اور رئی (Rye) میں پائے جانے والے ایک پروٹین کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس مرض کی خاص نشانی خارش ہونا یا جنیل چٹ جانا ہے۔

گندم کے دانے میں پایا جانے والا پروٹین "گلوٹین

تھوڑی ہی دیر بعد اسے یقین آ گیا کہ اب یہ واقعی کسی اور کا کمر ہے۔ فرنیچر سے لے کر قالین تک ہر چیز بدل چکی تھی سوائے.....

ایک دم اس کا دل خوشی سے بھر گیا۔ اس کی میز اب بھی اپنی جگہ موجود تھی، جتنی کچھ کہہ رہا تھا، لیکن اس کا دھیان پوری طرح اپنی میز کی طرف تھا۔ آگے بڑھ کر مول نے پیار سے اس کی سٹح پر ہاتھ پھیرا تو گرد کی تہ نے استقبال کیا..... جیسے کئی دن سے کسی نے میز کی طرف توجہ نہ دی ہو۔ ماند پڑتے خانوں کے دروازے بھی کسی قسم کی آرائش سے خالی تھے۔ کیلنڈر پر ایک مہینے پہلے کا صلہ کھلا ہوا تھا، پیالے میں اب صرف نوٹے پھونٹے قلم پڑے تھے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کرسی کھینچی، لیکن یہ کیا..... یہ تو کوئی سخت سی کرسی تھی۔ وہ سوالیہ انداز میں اپنے بھتیجے کی جانب مڑی، جو اس کے تاثرات دیکھے بغیر کہہ رہا تھا:

"امی ابو یہ میز یہاں سے ہٹانے کی اجازت ہی نہیں دیتے، خاص طور پر تانا تو ایک انچ بھی ہلانے پر سخت ناراض ہوتے ہیں۔ اب دیکھیں نہ پھپھو جانی! یہ تو زیادتی ہے۔ جب یہ آپ کا کمر تھا تو آپ نے اپنے طریقے سے سیٹ کیا۔ اب تو میرا حق ہے تاکہ یہ میز یہاں سے ہٹا کر اس کی جگہ کچھ اور رکھ لوں۔ پلیز..... پلیز آپ ہاں سے میری سفارش کر دیں گی نا؟"

پھپھو پیار سے بھتیجے کے پُر امید چہرے پر نظر ڈال کر مسکرا دیں، ساتھ ساتھ آنسو چھپانے کے لیے تیزی سے رخ بدل کر سر ہلا دیا۔

"ظاہر ہے! ان فانی چیزوں کی کون کب تک حفاظت کر سکتا ہے چاہے آپ کو ان سے کتنی ہی محبت کیوں نہ ہو۔" مول نے سوچا اور کھڑکی سے باہر نظر ڈالی جہاں اب صرف کیاریاں روٹنی تھیں۔ بقیہ حصے کو پختہ کر کے گیراج بنا دیا گیا تھا۔ برا بھرا ہانسیچہ اب تصد پارینہ بن چکا تھا۔

میری مدد کرتا ہے۔"

سال ختم ہونے پر اس کی انٹرن شپ شروع ہو گئی۔ دفتر اور گھر کے کاموں میں مصروف ہونے کے بعد فارغ وقت اب کم تھا۔ پھر بھی روزانہ پانچ دس منٹ میز کے ساتھ گزارنے لازمی تھے۔ اور یہی لمحے محسوس اتارنے کے لیے کافی ہوتے۔

☆.....

شادی کے بعد پاکستان سے دور پانچ سال اس نے دیار غیر میں گزارے۔ اس عرصے میں مول نے کافی میزوں بدلی لیکن کبھی وہ لطف نہیں آیا جو ابا کی دی گئی اسٹڈی ٹیبل پر ہاتھ رکھ کر، کرسی پر مزے سے آنتی پالتی مارے کھڑکی سے باہر کے نظارے دیکھنے میں آتا تھا۔

پاکستان واپس آنے کے تین دن بعد اسے اپنے میکے آنے کی فرصت ملی۔ رات کو کھانے کے بعد اسے سونے مہمان خانے بھیج دیا گیا۔ "شاید میرا کمر صاف نہیں کیا گیا۔" اس نے خود ہی اندازہ لگا لیا۔ صبح اس نے بچوں کو ناشتا وغیرہ کرا کر تانا کے حوالے کیا اور انھیں بغیر بتائے آہستہ روی سے سیزھیاں چڑھتی اپنے کمرے کی جانب بڑھی۔ دروازے پر وہ ایک انجانے احساس کے تحت ایک دم ہنگامہ کر رک گئی۔ اندر سے آئی آوازوں نے اسے ہار کر دیا کہ یہ اب اس کا نہیں کسی اور کا کمر ہے۔ اس نے دل کو ڈپٹے ہوئے تھوڑے توقف کے بعد دستک دی۔ چند ہی لمحوں بعد دروازہ کھل گیا۔

"ارے پھپھو جانی..... آپ!" اس کا بھتیجا تولیے سے منہ خشک کرتا دروازے میں کھڑا تھا۔

"آئیے نا..... باہر کیوں کھڑی ہیں۔" اسے اگر صبح صبح پھپھو کو اپنے کمرے میں دیکھ کر حیرت ہوئی تھی تو اس نے اظہار نہیں کیا۔

مول نے خواب کی سی کیفیت میں اپنے کمرے میں قدم رکھا..... نظریں ہر شے کو جذب کر رہی تھیں لیکن

جب گندم یا جو کا آنا پانی میں ملایا جائے، تو وہ ہنچا ہوا جاتا ہے۔ ایسا گلوٹین کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جب اس آٹے کی روٹی ہم تناول کریں، تو وہ غذائی نالی سے ہوتی نظام ہضم میں جا پہنچتی ہے۔

آنتوں میں گندم کا ہمارے مامون نظام (Immune System) کے خلیوں سے آنا سامنا ہوتا ہے۔ یہ خلیے ہمارے جسم پر حملہ آور جراثیموں کا مقابلہ کرتے اور ہمیں بیماریوں سے محفوظ رکھتے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ کئی مرد و زن میں یہ مامونی خلیے گلیاڈین پروٹین کو بھی جراثیم یا حملہ آور سمجھتے ہیں۔ چنانچہ وہ گلیاڈین پر دھاوا بول دیتے ہیں۔ یوں انسان جسمانی عارضے کا شکار ہو جاتا ہے۔

طبی اصطلاح میں درج بالا خلل گلوٹین حساسیت (Sensitivity) کہلاتا ہے۔ جب یہ خلل شدت اختیار کر جائے، تو سیلک مرض جنم لیتا ہے۔ اس مرض میں مامونی خلیے گلوٹین کے علاوہ چھوٹی آنت کے خامروں (Enzymes) پر بھی حملہ کر دیتے ہیں۔ گویا وہ انہیں بھی جراثیم سمجھتے ہیں۔

سیلک ایک خطرناک مرض ہے، کیونکہ یہ رفتہ رفتہ چھوٹی آنت کو گلاسزاد بنا دیتا ہے۔ چھوٹی آنت ہمارے نظام ہضم کا اہم حصہ ہے۔ خوراک کی غذائیت (وٹامن، معدنیات اور دیگر اجزا) ہمیں جذب ہو کر ہمارے مختلف جسمانی اعضا کی طرف جاتی اور انہیں قوت فراہم کرتی ہے۔ چھوٹی آنت کے گلنے سڑنے کی وجہ سے جب ہمیں مطلوبہ وٹامن اور معدنیات نہ ملیں، تو ہم متفرق بیماریوں کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ مثلاً تھکاوٹ، دست، قبض، خون کی کمی، جسمانی کمزوری، اچھا، ٹھکن اور سستی طاری رہتا ہے۔ یہ ہے کہ گلوٹین وٹا غذا کھاتے ہی دماغ ٹھکن محسوس کرنے لگتا ہے۔

سیلک مرض کی شناخت صرف خون کے ٹیسٹ اور بائیوپسی (Biopsy) سے ممکن ہے۔ خون کے ٹیسٹ میں غیر معمولی مامونی ردعمل (Abnormal immune response) سے وابستہ ضد جسم مادے (Antibodies) شناخت کیے جاتے ہیں۔ بعد ازاں چھوٹی آنت کی بائیوپسی ہوتی ہے تاکہ معلوم ہو سکے، آیا وہ گل مزوری ہے؟

خون کے ٹیسٹ سے صرف تجربے کار ڈاکٹر ہی جان سکتا ہے کہ کیا مریض سیلک مرض میں مبتلا ہے؟ یہی وجہ ہے، پاکستان میں چنبل، ٹھکن و سستی، قبض اور جسمانی کمزوری وغیرہ کا شکار مریض ڈاکٹر، حکیموں اور پیروں کے در پر چکر لگا لگا کر تھک جاتے ہیں مگر وہ اپنی بیماری سے چھٹکارا حاصل نہیں کر پاتے۔

کئی پاکستانیوں کو اس وقت سیلک مرض کا علم ہوا جب انہوں نے گندم یا جو کھانا چھوڑی۔ چنانچہ گلوٹین کے بغیر والی غذائیں کھانے سے رفتہ رفتہ چھوٹی آنت درست ہو جاتی اور سیلک مرض جاتا رہتا۔ یوں انہیں تندرستی کی بیش بہا نعمت نصیب ہو جاتی۔ درحقیقت گندم، جو اور رکی سے پرہیز ہی اس مرض سے نجات پانے کا بہترین طریقہ ہے۔

نکتے کی بات

مغربی دنیا میں ایک عشرے کے دوران یہ بات مقبول ہوئی کہ گلوٹین (یعنی گلیاڈین) مرد و زن کو سیلک مرض کا نشانہ بناتا ہے۔ چنانچہ وہاں باقاعدہ ”گلوٹین فری“ غذائیں وجود میں آچکیں۔ یہ غذائیں خاصی مہنگی ہیں، اس لیے ہر کس و ناکس انہیں نہیں خرید سکتا۔ دوسرا عجیب یہ سامنے آیا کہ جو لوگ سیلک مرض میں مبتلا نہیں تھے، وہ بھی گندم اور جو سے پرہیز کرنے لگے۔ چنانچہ اب ڈاکٹر خبردار کر رہے ہیں کہ وہ گندم و جو سے

منہ نہ موڑیں۔ وجہ یہ ہے کہ گندم، جو اور دیگر ثابت اناج انسان کو اہم وٹامن اور معدنیات مثلاً وٹامن بی، فولاد اور ریشہ فراہم کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ ثابت اناج ہمیں امراض قلب، ذیابیطس اور سرطان کی چند اقسام سے بچاتا ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر تجویز کرتے ہیں کہ انسان روزانہ ۵۰ فیصد کاربوہائیڈریٹ ثابت اناج سے حاصل کرے۔

درج بالا حقائق سے عیاں ہے کہ سیلک مرض میں مبتلا مرد و زن گندم و جو سے بچ کر اپنی صحت بہتر بنا سکتے ہیں۔ لیکن دیگر لوگوں کو ان غذاؤں سے پرہیز نہیں کرنا چاہیے۔ اگر آپ ٹھکن، جسمانی کمزوری، قبض وغیرہ کا شکار

ہیں تو کم از کم ایک ماہ گندم اور جو سے دور رہیے۔ اگر آپ صحت میں بہتری محسوس کریں، تو یہ اس امر کی نشانی ہے کہ آپ سیلک مرض میں مبتلا ہیں۔ اگر صحت بہتر نہ ہو، تو وجہ کچھ اور ہوں گی۔

امریکا اور برطانیہ میں طبی سائنس دان گلوٹین پر مزید تحقیق کر رہے ہیں۔ کچھ تحقیقات سے افشا ہوا ہے کہ غذا میں گلوٹین کی زیادتی نقصان دہ ہے۔ تب یہ پروٹین مختلف دماغی بیماریاں پیدا کرتا ہے۔ نیز انسان اس کا عادی ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے، جو لوگ بہت زیادہ روٹیاں کھائیں، وہ پھر ان کے بغیر رہ نہیں سکتے۔ روٹی کھا کر ہی ان کا پیٹ بھرتا ہے۔

بوڑھا کرنے والی پانچ وجوہ

یہ دیکھا گیا ہے کہ انسان کتنا ہی نوجوان ہو، بعض کیفیات اسے بوڑھا بنا دیتی ہیں۔ جنی کہ وہ دیکھنے میں بھی اصل عمر سے بڑا نظر آتا ہے۔ ان کیفیات میں سرپرست ذہنی و جسمانی دباؤ (Stress) ہے۔ ماہرین طب نے تحقیق کے بعد دریافت کیا ہے کہ جو مرد و زن دور مدد کی تیز رفتار زندگی سے ہم آہنگ نہ ہو سکیں، وہ دباؤ کا نشانہ بن کر جلد بوڑھے ہونے لگتے ہیں۔ رفتہ رفتہ دباؤ میں مبتلا انسان مختلف بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ یوں موت ذہنی و جسمانی طور پر صحت مند انسانوں کی نسبت اسے جلد دبوچ لیتی ہے۔ لہذا بڑھاپے سے بچنے کی خاطر دباؤ سے بچنے اور معمول کی زندگی گزارنے۔ یوں بدن کا فطریاتی نظام بھی تازہ رہتا ہے۔ جدید تحقیق سے ایک اور حیرت انگیز انکشاف ہوا۔ وہ یہ کہ جو شخص طبی اشیاء زیادہ کھائے، تمباکو نوشی کرے اور دھوپ میں زیادہ رہے، اس کے چہرے پر بہت جلد جھریاں پڑ جاتی ہیں۔ چنانچہ وہ عمر سے زیادہ بڑا نظر آتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ چینی والی غذائیں زیادہ کھائی جائیں، تو جلد تھکیل دینے والے پروٹینی ریٹے..... کو لاجن اور ایلائٹین خراب ہو جاتے ہیں۔ خوش قسمتی سے اگر طبی اشیاء کھاتا کم کیا جائے، تو جلد کو بچنے والا نقصان ختم کرنا ممکن ہے۔ اومیگا قہری (Omega-3) چکنائی (Fats) کے انسان دوست تیزاب ہیں۔ یہ تیزاب مچھلی کے تیل، اخروٹ اور اسی کے بیجوں میں ملتے ہیں۔ ان تیزابوں کی خاصیت یہ ہے کہ ہمیں بڑھاپے سے بچاتے ہیں۔ اسی لیے جو لوگ ہفتے میں دو تین بار مچھلی کھائیں، وہ نہ کھانے والوں کی نسبت جوان نظر آتے ہیں۔ یہ تیزاب دماغ اور دل کے لیے بھی مفید ہیں۔ نوجوانی میں انسان جسمانی تکالیف کی پروا نہیں کرتا۔ لیکن جوں جوں عمر گزرے، عضلات میں لچک ختم ہوتی اور تازہ آ جاتا ہے۔ چنانچہ لچک برقرار رکھنے کے لیے روزانہ ورزش ضرور کیجیے۔ ورزش انسان کو بڑھاپے سے بچاتی اور جوان رکھتی ہے۔ ایک نیا طبی انکشاف یہ ہے کہ دھوپ میں بہت سادھت گزارنا بھی بڑھاپا لے آتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ سورج کی ہلکے بھٹی شعاعیں جلد کی لچک (الائٹین) ختم کر دیتی ہیں۔ اس لیے تیز دھوپ میں رہنے سے بچنے کی ضرورتی کام کرتا ہے، تو دھوپ سے بچنے کا اہتمام کیجیے، مثلاً ایسٹوپی پہنیں جس کا سایہ چہرے کو ڈھک لے۔

سیر و سیاحت



پوچھا۔ وہ صاحب اپنا راستہ بھول کر میرے ساتھ چلنے لگے۔ پہلے مرکزی چوک میں کھڑے ہو کر ریڑھی پر بکنے والا سیاہ

رنگ کا ہدمزہ اور اُبکائیاں لانے والا شربت بصد اصرار پلایا اور پھر خندق الکبیر تک میرا ساتھ دیا۔

عبدالکریم ادھیڑ عمر کا شخص اور البندی ہی تھا۔ مگر مائی کے حوالے کو اس نے چنداں اہمیت نہ دی، بس سر ہلاتا اور ایک جہازی سائز کا حقہ گڑ گڑاتا رہا۔ کاؤنٹر کے پیچھے بھارتی اور پاکستانی اداکاروں کی تصویریں کھینوں کی آلائش سے سیاہ ہو رہی تھیں۔ ان سے ہٹ کر بی بی زینب کے رونے کی ایک تصویر آویزاں تھی جس کے سین اوپر زیر و کا بلب روشن تھا۔ کاؤنٹر کے سامنے بوسیدہ بدبو چھوڑتے قالین پر چار پانچ رعشہ زدہ کرسیاں پڑی تھیں جہاں چند حضرات سر جوڑے کھسر پھسر کر رہے تھے۔ ہو سکتا ہے وہ بلند آواز میں گفتگو کر رہے ہوں مگر ہونٹ کی بوسیدگی میں گونجتی ریٹشماں اور نور جہاں کی آوازوں کے شور میں وہ کھسر پھسر کرتے ہی گئے۔

غسل خانے میں نہا ہو کر جب میں باہر نکلا تو مسجد اُمتیہ دیکھنے کا ارادہ تھا۔ مگر پہلے اپنے آپ کو دمشق کے

تاریخ کے ہزار ہا اسرار سمونے ہوا

دم دمشق اندر

قدیم ترین شہروں میں سے ایک اسلامی الف لیلوی نگر کا ادبی رنگ میں رنگا منظر و سفر نامہ

مستشرقین تارز

میں ایک مائی نے مجھے نہایت شفقت سے مشورہ دیا تھا کہ پتر دمشق میں عبدالکریم البندی کے ہوٹل خندق الکبیر میں قیام کرنے پر گھر کا آرام ملے گا۔ چنانچہ میں نے بس سے اترتے ہی ایک راگبیر سے خندق الکبیر کا راستہ

ہیں تو کم از کم ایک ماہ گندم اور جو سے دور رہیے۔ اگر آپ صحت میں بہتری محسوس کریں، تو یہ اس امر کی نشانی ہے کہ آپ سیلیک مرض میں مبتلا ہیں۔ اگر صحت بہتر نہ ہو، تو وجہ کچھ اور ہوں گی۔

امریکا اور برطانیہ میں طبی سائنس دان گلوٹین پر مزید تحقیق کر رہے ہیں۔ کچھ تحقیقات سے افشا ہوا ہے کہ غذا میں گلوٹین کی زیادتی نقصان دہ ہے۔ تب یہ پروٹین مختلف دماغی بیماریاں پیدا کرتا ہے۔ نیز انسان اس کا عادی ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے، جو لوگ بہت زیادہ روٹیاں کھائیں، وہ پھر ان کے بغیر رہ نہیں سکتے۔ روٹی کھا کر ہی ان کا پیٹ بھرتا ہے۔

منہ موڑیں۔

وہ یہ ہے کہ گندم، جو اور دیگر ثابت اناج انسان کو اہم وٹامن اور معدنیات مثلاً وٹامن بی، فولاد اور ریشہ فراہم کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ ثابت اناج ہمیں امراض قلب، ذیابیطس اور سرطان کی چند اقسام سے بچاتا ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر تجویز کرتے ہیں کہ انسان روزانہ ۵۰ فیصد کاربوہائیڈریٹ ثابت اناج سے حاصل کرے۔ درج بالا حقائق سے عیاں ہے کہ سیلیک مرض میں مبتلا مرد و زن گندم و جو سے بچ کر اپنی صحت بہتر بنا سکتے ہیں۔ لیکن دیگر لوگوں کو ان غذاؤں سے پرہیز نہیں کرنا چاہیے۔ اگر آپ تھکن، جسمانی کمزوری، قبض وغیرہ کا شکار

بوڑھا کرنے والی پانچ وجوہ

یہ دیکھا گیا ہے کہ انسان کتنا ہی نوجوان ہو، بعض کیفیات اسے بوڑھا بنا دیتی ہیں۔ حتیٰ کہ وہ دیکھنے میں بھی اصل عمر سے بڑا نظر آتا ہے۔ ان کیفیات میں سرفہرست ذہنی و جسمانی دباؤ (Stress) ہے۔

ماہرین طب نے تحقیق کے بعد دریافت کیا ہے کہ جو مرد وزن دور جدید کی تیز رفتار زندگی سے ہم آہنگ نہ ہو سکیں، وہ دباؤ کا نشانہ بن کر جلد بوڑھے ہونے لگتے ہیں۔ رفتہ رفتہ دباؤ میں مبتلا انسان مختلف بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ یوں موت ذہنی و جسمانی طور پر صحت مند انسانوں کی نسبت اسے جلد دبوچ لیتی ہے۔

لہذا بڑھاپے سے بچنے کی خاطر دباؤ سے بچنے اور معمول کی زندگی گزارنے۔ یوں بدن کا غلبہ باقی نظام بھی تا دیر چلتا ہے۔ جدید تحقیق سے ایک اور حیرت انگیز انکشاف ہوا۔ وہ یہ کہ جو شخص میٹھی ایشیا زیادہ کھائے، تمباکو نوشی کرے اور دھوپ میں زیادہ رہے، اس کے چہرے پر بہت جلد جھریاں پڑ جاتی ہیں۔ چنانچہ وہ عمر سے زیادہ بڑا نظر آتا ہے۔

وہ یہ ہے کہ چینی والی غذائیں زیادہ کھائی جائیں، تو جلد تشکیل دینے والے پروٹینی ریشہ کو اجاگر اور ایٹا مشین خراب ہو جاتے ہیں۔ خوش قسمتی سے اگر میٹھی ایشیا کھانا کم کیا جائے، تو جلد کو بچانے والا نقصان ختم کرنا ممکن ہے۔

امریکا قمری (Omega-3) چکنائی (Fats) کے انسان دوست تیزاب ہیں۔ یہ تیزاب مچھلی کے تیل، اخروٹ اور اسی کے بیجوں میں ملتے ہیں۔ ان تیزابوں کی خاصیت یہ ہے کہ ہمیں بڑھاپے سے بچاتے ہیں۔ اسی لیے جو لوگ ہفتے میں دو تین بار مچھلی کھائیں، وہ نہ کھانے والوں کی نسبت جوان نظر آتے ہیں۔ یہ تیزاب دماغ اور دل کے لیے بھی مفید ہیں۔

نوجوانی میں انسان جسمانی تکالیف کی پروا نہیں کرتا۔ لیکن جوں جوں عمر گزرے، عضلات میں چمک ختم ہوتی اور تناؤ آ جاتا ہے۔ چنانچہ چمک برقرار رکھنے کے لیے روزانہ ورزش ضرور کیجیے۔ ورزش انسان کو بڑھاپے سے بچاتی اور جوان رکھتی ہے۔

ایک نیا طبی انکشاف یہ ہے کہ دھوپ میں بہت سا وقت گزارنا بھی بڑھاپے آتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ سورج کی بالائے نشئی شعاعیں جلد کی چمک (الائش) ختم کر دیتی ہیں۔ اس لیے تیز دھوپ میں رہنے سے بچنے کی ضرورتی کام کرتا ہے، تو دھوپ سے بچنے کا اہتمام کیجیے، مثلاً ایسی ٹوپی پہنیں جس کا سایہ چہرے کو ڈھک لے۔

ساتھ ہم آہنگ کرنے کے لیے شہر کی آوارہ گردی کرنے لگا۔ اس کی عمارتیں اور ماحول کچھ کچھ خزاں کے تانبے ایسے رنگ کی گھاٹ رکتا تھا۔ اس کے ہاسیوں نے مجھے دوست جانا..... مجھے ایک بھی شامی ایسا نہ ملا جس سے میں نے راستہ پوچھا اور اس نے اپنا کام کاج بھلا کر کھلی مسکراہٹ کے ساتھ میری راہنمائی نہ کی۔

ایک قریباً غلت میں جاتے ہوئے شامی کو روک کر جب میں نے کچھ دریافت کیا تو وہ یکدم شانت ہو کر مجھ سے گفتگو میں محو ہو گیا۔ پھر گھڑی دیکھ کر یک دم ہڑبڑا اٹھا، ”اوہ! مجھے اس وقت صدر کے دفتر ہونا چاہیے تھا۔“ اپنی کار میں بیٹھتے ہوئے اس نے مسکراہٹ برقرار رکھے ہوئے کہا ”میں دمشق کا اسٹنٹ انارنی جنرل ہوں، وہ سامنے میرا دفتر ہے، ضرور آتا۔“

سو یہ شہر اور اس کے ہاسی مجھے اپنوں کی طرح ہی نہ ملے بلکہ میرے اپنے ہو گئے۔ موسم پاکستان کے مقابلے میں گرم تو نہ تھا مگر پیدل چلنے سے پیاس کا احساس ہوا۔ نطی سے وہی سیاہ شربت پینے کو ملا جو بخار کے ٹکچر جیسا تھا مگر جسے شامی برادران نہایت اہتمام سے نوش جان کر رہے تھے۔ پھر کھانے کے طور پر ایک ساندوچ فلافل کھایا جو چنوں کی دال کا ذائقہ لیے ہوا تھا۔ آخر سوق الحمید یہ کا رخ کیا جس کے پہلو میں دنیا کی قدیم ترین مسجدوں میں سے ایک جامع اُمتیہ واقع ہے۔

مسجد اُمتیہ کی سیر

سوق الحمید یہ وہ جگہ ہے جسے اکثرے ہوئے انگریز صاحب بہادر اپنی زبان میں ”دی گرینڈ بزاز“ کا نام دیتے ہیں۔ تہران اور استنبول کے بازاروں کے مانند ایک ایسا وسیع شاپنگ سینٹر جس کی درجنوں

بل کھاتی گلیوں کو مشرقی سورج کی تمازت سے محفوظ رکھنے کے لیے ڈھک دیا گیا ہے۔ بازار کے خاتمے پر ایک رومی معبد کے کنڈر تھے اور آبی ذخیرے کی چند محرابیں اور ستون، درمیان میں ایک گلی تھی۔ سامنے مسجد اُمتیہ کا بلند دروازہ نظر آیا جس کی چوکھٹ پر بیٹھ کر زائرین اپنے جوتے اتار رہے تھے۔

مسجد اُمتیہ میں خون تو بے مگر حسن نہیں۔ آنکھوں کی زبان قدامت کے ذائقے سے آشنا ہوتی مگر خوبصورتی و حلاوت کی خواہش ناقص رہتی ہے۔ تین تفصیل نما دیواروں کے ساتھ بلند برآمدے ہیں۔ درمیان میں محن اور چوٹی جانب مسجد کی عمارت ہے۔ برآمدوں میں قدیم بازنطینی نقاشی کے نمونے تھے جن میں درختوں اور نیل بوٹوں کے درمیان جنگلی جانوروں کی شکلیں بھی شامل ہیں۔ بنو اُمیہ شکار کے دلدادہ تھے اور یہ اشکال اسی شوق کی نمازی کرتی ہیں۔

اس عمارت میں اگر اذان بلند نہ ہو تو اس کی روح کسی رومی معبد یا کلیسا کے قریب آ جاتی ہے۔ حضرت عمر فاروق کے عہد میں جب دمشق فتح ہوا تو وہاں سینٹ جان دی ہیٹ کا کلیسا اُتقم تھا۔ اسے مسلمانوں اور عیسائیوں نے مشترکہ عبادت گاہ کے لیے مخصوص کر لیا۔ مسلمان دائیں جانب سے داخل ہوتے اور عیسائی بائیں طرف سے..... ۷۰۵ء میں ولید اول نے پورا کلیسا خرید کر مسجد کی تعمیر شروع کر دی۔ ایرانی، ہندوستانی، یونانی اور شامی کاریگروں نے پتھروں کے ٹکڑے جوڑ کر مناظر قدرت تخلیق کیے۔ سونے کے میوول بنائے گئے۔ سات برس کے عرصے میں مسجد اُمتیہ تکمیل کو پہنچی۔

مسجد کے محن میں شاید دنیا کا قدیم ترین کنواں

واقع ہے۔ روایت کے مطابق حضرت عیسیٰ کی آمد کا استقبال کرنے کی خاطر عیسائی اسی کنوئیں کے پانی سے پتسا کیا کرتے تھے۔ ہمارے لیے حضرت یحییٰ اور عیسائیوں کے لیے سینٹ جان دی ہیٹ کا مزار بھی مسجد کے عین درمیان واقع ہے۔ میں اس سے دو شتر استنبول کے توپ کاپی میوزیم میں اس پیغمبر خدا کا پنجہ دیکھ چکا تھا جو سونے کی تاروں سے جوڑا گیا ہے۔ مسجد کے اندر خاموشی تھی۔ عبادت گزاروں کے جھکے ہوئے سر، پلٹے ہوئے، حضرت یحییٰ کے مزار کی جالی سے آسودگی حاصل کرتے ہاتھ! کون سا ہاتھ مسلمان ہے اور کون سا عیسائی، یہ معلوم نہ ہوتا۔

مرکزی فالوںس کے نیچے پر وقار سراپے کے مالک ایک ہارٹس بزرگ آس پاس مؤدب بیٹھے لوگوں سے محو گفتگو تھے۔ میں بھی ان کے قریب بیٹھ گیا۔ لوگ مذہب کے علاوہ اپنے ذاتی مسائل کا حل بھی دریافت کر رہے تھے۔ محفل کے خاتمے پر انھوں نے سب کے لیے دعا کی۔ میں نے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا تو انھوں نے پاکستانی ہونے کا سن کر بے حد شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور میرے لیے خصوصی دعا مانگی۔

کر بلا کے اسیر

کچھ دیر ستانے کے بعد میں محن میں آ گیا جہاں دھوپ ڈھل رہی تھی۔ اسی محن میں خلیفہ سلمان بن عبد الملک نے فاتح اندلس، موسیٰ بن نصیر کا شاہانہ استقبال کیا تھا۔ پھر چند ہی روز بعد معزول کر کے مسجد کے باہر ایک ستون سے ہاندھ دیا۔ سامنے وہ منار ہے جس پر ایک روایت کے مطابق حضرت عیسیٰ کا نزول ہوگا۔ محن کے درمیان وہ گنبد ہے جسے خزانہ کہا جاتا ہے۔

رومی طرز کے بلند اور پُر ہیبت برآمدے میں چلتے

ہوئے ایک شامی طالب علم، قیس میرا دوست بن گیا۔ وہ امتحانوں کی تیاری کے سلسلے میں وہاں سکون سے پڑھنے آیا تھا۔ وہ مجھے مسجد کے اس حصے میں لے گیا جس سے متصل اس ملامت کائنات کا محل استادہ تھا جسے مزید کہتے ہیں۔ ایک پرانی وضع کی نیل گاڑی برآمدے میں کھڑی تھی۔ پیسے لکڑی کے تھے۔ زائرین اسے چھو اور کچھ چوم رہے تھے۔

”اس نیل گاڑی پر کر بلا کے اسیروں کو دمشق لایا گیا تھا۔“ قیس نے بتایا۔

”لیکن یہ تیرہ سو برس پرانی تو نہیں لگتی۔“ پیہوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے میں نے حیرت سے کہا۔ وہ ہانکل ہمارے ہاں کے گڈے کی طرح تھی۔

”ہاں مجھے بھی شک ہے مگر ہمارے ہاں روایت ہے۔ اور چھت سے نکلتا یہ پنجرا اسیران کر بلا کو اذیت دینے کے لیے استعمال ہوا تھا۔“

برآمدے کے خاتمے پر دائیں ہاتھ ایک بند کمر تھا جس کی دیواروں میں ایک چکور جالی نصب تھی۔ زائرین اسی جالی کو چھوتے، آنکھوں سے لگاتے اور ایک جانب ہو کر آہ دزاری کرنے لگتے۔ کچھ اس کے سامنے ہاتھ سینے پر ہاندھے تصویریں اترا رہے تھے..... پرچم سیاہ تھے اور لہادے بھی، ماتم کا ماحول بنا ہوا تھا۔ یہاں کچھ ضرور ہوا تھا! چوکور جالی کے اوپر کوئی عمارت رقم تھی۔

میں نے قیس کی طرف دیکھا، اس نے سر جھکا لیا پھر بولا ”یہاں..... یہاں شہید کر بلا حضرت امام حسینؑ کا سر مبارک رکھا گیا تھا۔“

میرے حواس سناٹے میں آ کر سن ہو گئے۔ ہاں، یہاں کچھ ہوا تھا۔

”ان دنوں مسجد کے ساتھ شامی محل کی دیواریں

تھیں، یزید کے محل کی دیواریں۔ یہ جگہ جہاں ہم کھڑے ہیں، قید خانہ تھی جس میں اسیران کر بلا کو رکھا گیا۔ اور اس مقام پر جہاں جالی ہے امام کا سر ایک طشتری میں نمائش کے لیے رکھا گیا۔

”کیا یزید کا محل باقی ہے؟“

”نہیں..... کیسے باقی رہتا..... یزید بھی باقی نہیں رہا۔ اس کی قبر پر اب چوڑے کی ایک تہتی ہوئی بھٹی ہے جو دن رات جلتی رہتی ہے۔“ اور جس مقام پر حسینؑ کے سر نے لٹ بھر کے لیے آرام کیا، وہ جگہ بوسوں سے تر رہتی ہے۔ ہاں یہاں کچھ ہوا تھا۔

سردار نہ داد دست در دست یزید

قرطبہ کی یاد

کچی دیوار تنگ گلی کے آخر تک چلی جا رہی تھی جہاں محراب کے نیچے بلند کواڑوں والا ایک دروازہ تھا۔ میں نے آہستہ سے دستک دی اور انتظار کرنے لگا۔ مسجد امیہ سے نکل کر میں دمشق کے پرانے شہر چلا آیا تھا۔ پچھلے تین گھنٹوں سے ایک ایسے شخص کی طرح جسے کہیں پہنچنے کی جلدی نہیں ہوتی، سستی سے قدم رکھتا، منہ اٹھائے پرانے گھروں اور کچی دیواروں میں نصب منقش کھڑکیوں کا مشاہدہ کرتا، قدیم شہر کے ہادقار ہاسیوں کو نکلتا چل رہا تھا۔ دائیں بائیں جو بھی گلی نکلتی، کسی بھی کونچے کا آغاز ہوتا میں فرمانبرداری سے بلا سوچے سمجھے اپنا رخ اسی طرف موڑ لیتا۔ لیکن اس بے جہت آوارگی نے بے حد تھکا دیا۔ چنانچہ پیاس کی شدت نے مجھے ایک دروازے پر دستک دینے کو اکسایا تھا۔

تھوڑی دیر بعد کسی اپنی گنڈے کی سخت آواز آئی اور کواڑ چرچراتے ہوئے کھل گئے۔ ایک خیمہ نما چوٹے میں کھڑے شامی نے ہمد حیرت میرا معائنہ

کیا۔ میں نے چلو منہ کو لگا کر ”اعطش“ پکارا اور وہ مسکراتا ہوا واپس چلا گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازے کے اندر جھانکا۔

مجھے السوس ہوا کہ آخر اس شامی کو کیا ہو گیا، اس نے مجھے اندر آنے کا کیوں نہیں کہا..... دنیا جہاں سے کٹا ہوا ایک صحن تھا، بلند دیواروں کی تہ میں بے ترتیب جھاڑیاں اور ان کے درمیان خاموشی سے چلتا ایک فوارہ! دیواروں پر رنگین کتلے لٹکے ہوئے تھے جن سے لگتی بلیں درختوں سے جمولتے بندروں کی طرح آہستہ آہستہ مل رہی تھیں۔ نیلی محرابیں اور بند کھڑکیاں۔

یہ صحن مجھے آشنا سا لگا۔ یہ آشنائی مجھے برس پیشتر قرطبہ کی ایک گلی میں ہوئی تھی جس کے ہر مکان کے اندر یہی صحن تھا، صرف اس کا نام وہاں ”پاتجہ“ تھا۔ پرانے قرطبہ اور دمشق کے اس حصے کو اگر پہلو پہ پہلو رکھ دیا جائے تو اس میں چلنے والے کو کسی تبدیلی کا احساس نہ ہو کیونکہ اصل میں دونوں ایک ہیں۔ جنگ عظیم میں تباہ شدہ تاریخی شہروں کو جس طرح پرانے نقشوں کی مدد سے ہو بہو دوبارہ تعمیر کر لیا گیا تھا، کچھ اسی طرح بنو امیہ نے اپنے کھوئے وطن، دمشق کو اندلس کی نئی سر زمین پر قرطبہ کے روپ میں ڈھال دیا۔

مسجد قرطبہ بھی مسجد امیہ کے نقشے پر تعمیر کی گئی اگرچہ یہ نقل خوبصورتی میں اصل کو ماند کر گئی۔ دمشق کے باغ رضافہ کی نقل قرطبہ کے باغ رضافہ کی صورت میں ہوئی۔ حویلیاں، فوارے اور قصر اس طرح نئے شہر میں بلند ہوئے کہ اس کے آسمانی منظر پر دمشق کا دھوکا ہونے لگا۔ کھجور کے پودے دیکھ کر شام کی یاد میں آہیں بھرنے والے بنی امیہ انہی گلی کوچوں سے نکلے تھے۔ قرطبہ کے

بعد اب میں دمشق میں تھا اور یوں ایک آوارہ گرد کو بنو امیہ پر فوقیت حاصل ہوئی کہ وہ ان کے دونوں گھروں کی خوبصورتی کا مشاہدہ بن گیا۔

لبے چوٹے والا شامی برآمدے میں سے نکل رہا تھا۔ اس کے ہمراہ ایک ملازم طشتری اٹھائے چلا آیا۔ یہاں بھی مجھے سادہ پانی کے بجائے وہی سیاہ شربت پینے کو ملا۔ انکار کیسے کرتا، صبر کا گھونٹ بھر کر لی گیا۔ میں نے شکر یہ ادا کرنے کے یہاں ایک مرتبہ پھر صحن میں جھانکا مگر گھر کا کین سنجیدہ مسکراہٹ کے ساتھ کواڑ پر ہاتھ رکھے کھڑا رہا۔ میں پیچھے ہٹا تو اس نے دروازہ بند کر قرطبہ کو میری نظروں سے اوجھل کر دیا۔

قبوہ خانے میں

اسی بے مہار آوارہ گردی کے دوران ایک بازار میں بالکل غیر متوقع طور پر حضرت رقیہ بنت امام حسینؑ کا حزار نظر آیا۔ اندر جا کر زیارت کی۔ حزار کے چاروں طرف مٹی سے ماٹنے والوں نے بچوں کے کھلونے اور پتھروں سے سہار کھے تھے۔ قریب ہی جامع التوبہ واقع ہے مسجد امیہ کی مختصر شکل۔ دروازے کے ساتھ ایک پتھر پر درج ہے کہ یہ مسجد سلطان الملک الاشرف موسیٰ الایوبی نے ۶۳۳ھ میں تعمیر کرائی۔

شام ہو چکی تھی۔ جامع التوبہ سے نکل کر میں قریب ایک قبوہ خانے میں سستانے کی نیت سے داخل ہوا جو اتنا مختصر تھا کہ ہر آنے والے کا وجود اسے بھر دیتا۔ وہاں بیٹھے لوگ قبوے کی پیالیوں پر پڑتے سائے سے جان جاتے کہ کوئی نیا گاہک آیا ہے۔ دکاندار تیل کے ایک منقش فنجان میں سے بھاپ چھوڑتے قبوے کا پیالہ بھر لایا۔ وہ بے ڈول تووند والا عمر رسیدہ شخص تھا جس کی سفید پلکیں اتنی گھٹنی اور لانی تھیں کہ آنکھوں پر لگتی رہتیں۔

قبوہ خانے میں دس پندرہ گاہک بیٹھے تھے اور سب دکاندار کے ہم عمر یا شاید اس سے بھی زیادہ بوڑھے! قبوے میں کسی کو رتی بھر دلچسپی نہ تھی۔ چند ایک تاش کا کوئی عربی کھیل کھیل رہے تھے۔ باقی کرسیوں میں بڑے آرام سے حقے گزگڑاتے۔ دیواروں پر اس قدیم دور کی تصاویر آویزاں تھیں جب کیمرا نیا نیا ایجاد ہوا تھا..... درمیان میں ایک رنگ آلود کوار اور سیاہ ڈھال لٹکی ہوئی تھی۔

میں نے قبوہ ختم کیا تو ایک بوڑھے نے حقے کی نال آگے کر دی۔ کش لگایا تو لطف آ گیا۔ عجیب نشہ آور قسم کا تمباکو پی رہے تھے یہ دھندلائے ہوئے بوڑھے! تھوڑی دیر بعد دکاندار اپنا کام پختا کر ہمارے پاس بیٹھ گیا اور حقہ گزگڑانے لگا۔ چند طویل اور کھانسی آور کش کھینچ کر اس نے دیوار سے ایک تصویر اتاری اور چھانچو ٹھکڑے کر میرے سامنے رکھ دی۔

معدوم ہوتی ہوئی شکل تھی، ایک بھاری بھر کم نوجوان کسی ٹیکر نما لبادے میں لمبوں ایک ہاتھ میں کوار اور دوسرے میں ڈھال تھا شمشیر زنی کا کوئی پینترا دکھار رہا تھا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو اس کے چہرے پر دودھ پیتے بچے کی پوہلی مسکراہٹ تھی۔ تصویر اسی کی تھی۔ یک دم اس نے دیوار سے کوار اور ڈھال اتاری اور تصویر کے انداز میں پینترا ہاندھ کر کھڑا ہو گیا۔ باقی بوڑھے جو شاید روزانہ اس قسم کا تماشا دیکھتے تھے، اس پر فقرے کسنے لگے مگر وہ بت بنا کھڑا رہا۔ اچانک اس نے پھرتی سے پینترا بدلا اور ایڑیوں پر گھومتے ہوئے کوار کو اس زور سے کمرے میں گھمایا کہ وہ گاہکوں کے سروں سے شائیں شائیں کرتی گزرنے لگی۔ جیسے کسی تیز رفتار ٹرکے کا ایک ہی پر ہو اور آپ کے اوپر سنسانا ہوا گزرنے لگے۔

گوشتہ خواتین

کے کام کرتی پھرا کرو۔" قسمت آرا اپنی نئی نویلی اور سب سے چھوٹی بہو کو دیکھتے ہی تقریر کرنے لگی۔

بہو سیدھی سادھی تھی، خاموشی سے ساس کی باتیں سنتی جھاڑو دیتی رہی۔ آخر اشبات میں سر ہلا کر "جی اچھا" کہتی چلتی بنی۔ اچانک رکی اور ساس کے قریب آ کر دھیمے سے کہا "اماں چائے پی آپ نے؟"

قسمت آرا کو تو موقع مل گیا دوبارہ تقریر کرنے کا شروع ہو گئیں "کہاں بہو..... کون ہے جو اس بڑھیا کا خیال کرے؟ سب اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہیں، کسی کو میری کیا پروا؟ اپنے تینوں بیٹوں کو میں اکیلی کھلاتی پلاتی تھی۔ اب وہ پوچھتے ہی نہیں، روز رانا رنایا سلام کرتے اور کہتے ہیں "اچھا اماں دیر ہو رہی ہے، دفتر جا رہا ہوں..... اماں تھکا ہوا ہوں، آرام کروں گا۔"



اے بہو..... یہ کیا حال بنا رکھا ہے تم نے اپنا..... کبھی تھوڑا ستکار بھی کر لیا کرو۔ لگتا ہی نہیں کہ چند دنوں کی دلہن ہو۔ ارے ہمارے زمانے میں تو لڑکی پورے دو ماہ دلہن ہی رہتی تھی۔ کام تو کرتی تھی مگر جتنا سنورنا نہ بھولتی اور ایک تم زراں ہو جو اجزا چمن بنی جھاڑو دے رہی ہو۔ کام سے کب روکا ہے ہم نے؟ بس ہم یہی کہتے ہیں، صبح اٹھتے ہی نماز پڑھ کر تیار ہو جاؤ اور پھر گھر

گھر کا نقشہ بدل دینے والی

بہو ہوتو ایسی

ایک سلیقہ شعار عورت پھوہڑ گھرانے میں آئے تو اپنے حسن تدبیر سے اس کی کایا پلٹ دیتی ہے

قرۃ العین مریم



مسجد امیہ کے سائے تلے میں نے ایک خاموش صحن دریافت کیا جس کا رستہ رومی ستونوں پر آرام کرتی ایک محراب میں سے جاتا تھا۔ محراب پر انگوروں کی نیل گھنٹی اور سیاہ تھی۔ صحن کے درمیان ایک تالاب تھا۔ کنارے پر ایک درویش سر جھکائے کچھ پڑھ رہا تھا۔ محراب کی سیدھ میں، تالاب کے پار ایک دروازہ کھلا تھا اور اندر ایک قبر تھی۔ قبر پر سنگ مرمر سے تراشی ہوئی ایک گجڑی دھری تھی۔ دور سے یوں لگتا تھا جیسے مرنے والے نے اپنی گجڑی احتیاط سے اتار کر لوح پر رکھی اور خود قبر میں اتر گیا۔

میں درویش کے مراقبے میں نخل ہوا اور اشاروں سے دریافت کیا کہ یہ کس بزرگ کا حزار ہے؟ اس نے سر اٹھایا، میری لامٹی کی حیرت چہرے پر ظاہر کی اور پھر مجھے غیر ملکی پہچان کر بولا "سلطان صلاح الدین ایوبی۔" میں ایک دم یوں نڈکا جیسے اس کمرے کے اندر سلطان فلسفیس نفیس موجود ہیں۔ تاریخ کے ہزاروں اوراق میرے ذہن میں پھڑ پھڑائے مگر میں نے انہیں بے توجہگی کے طاق میں رکھا اور اندر چلا گیا۔

داستان، تاریخ، افسانہ، حقیقت، شجاعت، صلیب، ہلال، خاک اندر خاک۔ فاتحہ پڑھ کر باہر نکلا، درویش سر جھکائے بیٹھا تھا۔ تالاب کا پانی تاریکی میں سیاہ رات کے مانند تھا۔ باہر جانے سے پیشتر میں نے مڑ کر دیکھا، تاریک صحن اور سیاہ پانیوں کے پار دروازہ کھلا تھا..... وہاں ناکافی روشنی مگر تھی۔ میں نے انتہائی غور سے قبر کی طرف دیکھا، شاید میرا وہم تھا، گجڑی کے نیچے ایک چہرہ بننے ہوئے دکھائی دیا۔ عجیب و اہم تھا، مگر اس کے نقوش زندہ تھے، خود خال زندہ تھے! داستان، تاریخ، افسانہ، حقیقت، شجاعت، صلیب، ہلال..... خاک اندر خاک۔

میرے بالوں اور شرانٹے بھرتی تلواری کے درمیان واہجی سا فاصلہ تھا چنانچہ سر کندھوں کے بیچ دھنسانے کی کوشش کرنے لگا۔ کب زوہ بوڑھے کا دوسرا ہاتھ ڈھال کو یوں حرکت دے رہا تھا جیسے مد مقابل کے وار روک رہا ہو۔ اس کے عمر رسیدہ دوست بے لگاری سے مسکراتے اور میری پریشانی سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ درجن بھر گھسن گھیریاں کھانے کے بعد وہ ہانپنے لگا اور پسینا پونچھتے ہوئے اپنے ہتھیار پھر دیوار پر سجا دیے۔ میں نے بھی پسینا پونچھا اور حقہ پینے لگا..... اٹھنے سے پیشتر جب قبوے اور تمباکو نوشی کا بل طلب کیا تو بوڑھے دکانداز نے میرا کندھا تھپک کر مسکراتے ہوئے انکار کر دیا۔ میرے اصرار پر اس نے تیوری چیز حالی اور تلواری کی جانب اشارہ کیا۔ میں نے شکر یہ ادا کیا اور چپکے سے باہر آ گیا۔

گجڑی کے نیچے چہرہ

دشمن کی مسجدوں سے نماز عشا کے لیے موذنوں کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ ان صداؤں میں ہلا کی خوش الحانی تھی اور ایسا کیوں نہ ہوتا، اس شہر کی منی میں ہلال جیٹی جو دفن تھے۔ مسجد امیہ کی فصیل نما دیوار کے پہلو میں چلتے ہوئے موذنوں کی صدائیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ میں اس دیوار کے ساتھ یوں چپک رہا تھا جیسے باقی ساری زمین سمندر ہے اور یہ دیوار ساحل! جھار دار منار کے نیچے پہنچ کر میں کھڑا ہو گیا۔ اوپر اذان دینے والوں کا ایک گروہ منوذب کھڑا تھا۔ ان میں سے ایک اللہ اکبر کہتا تو باقی موذن یہی الفاظ قدرے مختلف انداز میں دہراتے۔ جب وہ اہبہ ان لا الہ الا اللہ کی صدا بلند کرتا تو اسی کے سانچی وقفے کے بعد انہی الفاظ کی قرأت کرتے..... میرے لیے اذان دینے کا یہ طریقہ نیا اور پرکشش تھا۔

آ۔ عارف نے ”جی اچھا“ کہا اور ہاورچی خانے میں کھس گئی جو سب بھادجوں کا مشترکہ تھا۔ وہاں پہنچتے ہی اس کا سر چکرا گیا۔ وہاں تو لگتا تھا زلزلہ آیا ہوا ہے۔ کبھی ہی نہ آیا کہ چائے کیسے بنائے۔ ہاورچی خانے کی حالت دیکھ کر اسے چائے بنانے کی ترکیب ہی بھول گئی۔ گھر کا یہ حصہ جو سب سے زیادہ صاف ہونا چاہیے، لگتا تھا کچرا منڈی ہے۔ عارف نے یہ سوچ کر خود کو تسلی دی کہ نہیں، نہیں، اسے بھادجوں نے گندا نہیں کیا۔ شاید بچے آئے ہوں گے کچھ ڈھونڈھنے۔“

وہ پھر چائے بنانے کے لیے کوئی برتن ڈھونڈنے لگی۔ جتنے بھی برتن نظر آئے سب جھوٹے تھے۔ جو صاف تھے، وہ بس نام ہی کے پاک نظر آئے۔ لال بیگ سیاست دانوں کی طرح اس ہاورچی خانے نما وطن کو لوٹنے میں مصروف تھے۔ مرتھان اور ڈبے رکھے تھے جن کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ ان پر کوئی ڈھکن تھا نہ ہی وہ درست جگہ پڑے تھے۔ اسے ایک چھوٹا فرائی پن نظر آیا جو اس نے فوراً اٹھا لیا اور رگڑ رگڑ کر دھو ڈالا۔ پھر اسی میں چائے بنانے لگی۔ ”دودھ فریج میں ہوگا۔“

توڑنے کی سعی کی تھی۔ وہ اسی طرح فریج میں پڑے تھے۔ ان سے سفیدی ٹپک ٹپک کر جا لیاں پار کرتی نچلے خانے میں جمع ہو رہی تھی۔ اس جگہ پہلے ہی پھپھوندی لگی ہوئی تھی۔

ایک تیلی دیکھی، تو اس کے اندر دودھ کم تھا ہاں زیادہ لگا نظر آیا۔ لگتا تھا جیسے کوئی آتش نشاں پہاڑ پھنسا اور لاوا پہاڑ سے باہر آ گیا۔ جیسے ہی اس نے وہ آتش نشاں ہاتھ میں اٹھانے کا گناہ کیا، ہاتھ چھچھا گیا۔ عارف نے ناچار فریج کا دروازہ بند کیا اور دودھ فرائی پن میں ڈال کر سوچنے لگی ”زندگی میں پہلی بار فرائی پن میں چائے بنائی ہے۔ ایسا گندا ہاورچی خانہ اور فریج بھی پہلی بار دیکھا ہے۔“

اس کے سینے میں آسائش کی چیزیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ پھر بھی اس نے اپنے گھر کو صاف ستھرا اور سلیقے سے سجایا ہوا تھا۔ اسے ہمیشہ اس بات کی تعلیم دی گئی تھی کہ صفائی نصف ایمان ہے اور گھر کے کام عورت کے لیے عبادت ہوتے ہیں اگر وہ سمجھے! مگر لگتا تھا شاید اس گھر کی عورتوں کو اس عبادت کا علم نہیں جیسی تو عمل کرنے سے قاصر ہیں۔ گھر میں ہر تذاوا فرمقدار میں میسر تھی مگر اسے سنبھالنا شاید کسی کو نہیں آتا تھا۔

یہ سوچ کر جیسے ہی فریج کھولا اس کا بھی منظر کچھ مختلف نہ تھا۔ حیرت سے اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ہاتھ خود بخود ناک کی طرف بڑھا۔ اس قدر شدید بدبو آ رہی تھی کہ اسے تے آنے لگی۔ بہر حال جی کڑا کر فریج کا جائزہ لیا جہاں بہت سے سالن پڑے تھے۔ اسے لگا جیسے سبھی ہوٹل سے منگوائے گئے ہوں، کچھ تندوری روٹیاں بھی پڑی تھیں۔ سالن گرنے کی وجہ سے سارا فریج روغن اور ہلدی کی پاس سے بسا ہوا تھا۔ فریج کے سامنے کھڑے ہو کر کسی نے انڈے

اب چائے چمانے کی مہم درپیش تھی۔ چھلنی ڈھونڈنا ایسا تھا جیسے آنے سے نمک نکالنا۔ اس نے وہیں پڑا ایک کپڑا اٹھا لیا جو شاید روٹی لینے والا رومال تھا۔ کپڑے کا کونا دھو کر اس سے چائے چمانی اور اماں کے تخت پر آ بیٹھی۔ اماں اسے دیکھتے ہی پوچھنے لگی ”ساری چیزیں تو مل گئیں نہ ہو آسانی سے؟“

اس نے بس ہاں میں گردن جلا دی۔ اب کیا بتاتی کہ کن کنھن مراحل سے گزر کر آئی ہوں۔ چائے لیتے

ہوئے وہ اماں کو دیکھنے لگی۔ سوچا ”اماں شکل سے تو بڑی ہادقار لگتی ہیں۔“ پھر ان کے کپڑوں کا جائزہ لیا: سفید رنگ کا گڑبہ شلوار اور شال نما دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا۔ یعنی صفائی پسند خاتون ہیں مگر گھر کی حالت سے تو نہیں لگتا! اماں نے جو دیکھا تو پوچھنے لگیں ”کیا دیکھ رہی ہو بہو؟“

عارف چونک گئی ”جی کچھ نہیں۔“ پھر بہت کر کے پوچھ لیا ”اماں کھانا کون بناتا ہے؟“

اماں جیسے سب سمجھ گئی ہوں، بولیں ”جب سے بہوئیں آئی ہیں، ہاورچی خانے جانے کو تو دل ہی نہیں چاہتا۔ اس قدر گندار بتا ہے کہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا اور رہی کھانا بنانے کی بات تو برسوں ہوئے گھر کا کھانا کھائے ہوئے! دونوں بہوئیں ہوٹل سے منگوا لیتی ہیں جو کھانے کے لائق نہیں ہوتا۔ بے حساب روغن اور روٹی جیسے پلاسٹک کی ہو۔ پتھاری اور عاصم کی شادی کے باعث نوکرانیاں لگائی تھیں جنھوں نے دو ہفتوں تک ہاورچی خانہ سنبھالا اور گھر کے کام بھی کرتی رہیں۔ مگر نوکرانی کے کام میں وہ بات کہاں جو گھر کی عورت انہماں دیتی ہے۔ میری تو کوئی سنتا ہی نہیں اور اب میں خود تم سب کی محتاج ہوں۔ بیمار یوں نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ دو وقت کا کھانا مل جائے تو خدا کا شکر کر کے کھا لیتی ہوں۔ بس دن پورے کر رہی ہوں بیٹی۔ دل تو جلتا ہے مگر کیا کروں، کچھ کر نہیں سکتی۔“

اماں کی ہاتھیں سن کر عارف سوچنے لگی ”اماں ایسی بہوئیں لائی ہی کیوں؟ مجھے پسند کرتے وقت تو انھوں نے ہمارے گھر کے ہاورچی خانے اور غسل خانے کا بغور جائزہ لیا تھا۔ انھیں میرے پڑھے لکھے ہونے سے کوئی سروکار نہیں تھا، بس گھریلو کاموں کے متعلق پوچھتی رہیں۔ ہاتی بہوئیں بھی ایسی ہی لائی جا رہے

تھیں نا..... اب بھتتیں۔“

چائے ختم ہو چکی تو عارف اٹھ کھڑی ہوئی۔ سبھی اماں نے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور کہا ”بہو! تم یقیناً سوچ رہی ہو گی کہ مجھے پسند کرتے وقت تو اماں نے گھریلو کاموں کے متعلق کئی سوال کیے تھے۔ مگر دوسری بہوئیں تو نکلی لگتی ہیں۔ ہے؟“

عارف کو کچھ نہیں آیا کہ اماں کو کیسے پتا چلا؟ شرمندہ ہی ہو کر اماں کے قریب بیٹھ گئی۔ وہ دور آسمان کی دستوں میں کھو گئیں جیسے لفظ تلاش کر رہی ہوں۔ پھر گویا ہوئیں ”جب میں اس گھر میں بیاہ کر آئی تو یہاں ہر چیز میسر تھی۔ میری ساس اور سرورفات پا چکے تھے اور میری ایک ہی نند تھی جس نے میرا رشتہ اپنے اکلوتے بھائی سے کر لیا۔“

”جب وہ مجھے دیکھنے میرے گھر آئی تو اس نے مجھے سر سے پاؤں تک بغور دیکھا۔ پھر گھر کی ہر چیز کا جائزہ لینے لگی۔ میں سمجھ گئی کہ صفائی ستھرائی کا عالم دیکھ رہی ہے۔ میں گھریلو کام باقاعدگی سے کرتی تھی، اسی لیے انھیں پسند آ گئی۔ نند شادی شدہ تھی، لہذا گھر پر میرا راج ہو گیا۔ میں گھر کو ہمیشہ صاف ستھرا رکھتی۔ عاصم کے اہا کپڑے کی دکان کرتے تھے۔ ہمارا ہاتھ ہمیشہ کھلا رہا۔ اللہ نے مجھے تین بیٹوں سے نوازا۔ میں نے انھیں عمدہ تعلیم دی۔ اچھے سے اچھا کھلایا اور لباس پہنایا۔ صاف ستھرا اور مذہبی ماحول دیا۔ قرآن، نماز اور روزے کی عبادت گھر میں عام تھیں۔ عاصم کے اہا بھی مذہبی معاملات میں سخت تھے۔“

ایک دن وہ دکان سے گھر آ رہے تھے۔ ان کے پاس اچھی خاصی رقم تھی کہ ڈاکوؤں نے راستے میں لوٹ لیا۔ انھوں نے تکرار کی تو ڈاکوؤں کے ہاتھوں اپنی جان گنوا دی۔“

البتہ امبر اس کے ساتھ ناشتا بناتے ہوئے کہنے لگی
"تم رہنے دو نا ماسی برکتے کر لے گی۔"

عارفہ نے ماسی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "نہیں
بھائی، آپ کو نہیں پتا یہ بہت باتونی ہے اور کام تو بس
نام کا کرنی ہے۔" ماسی برکتے نظر چرائی۔

اس دن وہ دیر تک ہاورچی خانہ صاف کرنے میں
جتی رہی۔ دوپہر تین بجے کے لگ بھگ اسے خوب چمکا
دیا اور ماسی کو ہدایت دی "کل صبح آٹھ بجے آجانا۔"

اسی دوران وہ سالن پکا چکی تھی۔ فریج میں رکھے
سارے سالن ماسی کو دے دیے گئے۔ فریج بھی
لشکار سے مار رہا تھا۔ اس نے وہ روٹیاں پکائیں اور

اماں کے پاس لے آئی جو ابھی نماز سے فارغ ہوئی
تھیں۔ گھر کی بنی روٹی دیکھ کر وہ بچوں کی طرح خوش
ہوئیں اور مزے لے لے کر کھانا کھایا۔ عارفہ نے بھی

کھانا کھا کر برتن سینے۔ اتنی دیر میں بچے دوڑتے
ہوئے آگئے۔ وہ اسکول سے کچھ دیر پہلے آئے تھے۔
اس نے بچوں کو پیار کیا تو انہوں نے کہا "چچی بہت
بھوک لگی ہے، کھانا ہے؟"

وہ بچوں کو بٹھا کر ہاورچی خانے گئی اور روٹیاں
پکانے لگی۔ سمیرا کا بیٹا عمران، عارفہ کے پاس آیا اور
بولتا "شکر ہے، آج مجھے کسی نے روٹی لانے نہیں
بھیجا۔" بچوں کو کھانا کھلا کر اس نے اپنے اور اماں کے

کمرے کی صفائی کی اور پھر کچھ دیر آرام کیا۔ شام کو
جب تینوں بھائیوں نے کھانا کھایا تو انہیں بھی بہت
مزا آیا۔ اظہر اور محمود نے کن اکھیوں سے اپنی بیویوں

کو دیکھا جو سر جھکائے کھانا کھا رہی تھیں۔ البتہ عاصم
نخر سے چوڑا ہو گیا۔

دوسرے دن بھی عارفہ نے سارا دن گھر کے کام

تہ بہوئیں مجھ سے الجھ پڑیں۔

"عبرت پکڑ کر میں عاصم کی نوکری لگنے سے پہلے
ہی لڑکیاں دیکھنے لگی۔ جب تک نوکری لگتی، میں نے تم
سے رشتہ کر دیا تاکہ اس کا دماغ ہواؤں میں نہ اڑ
سکے۔ مجھے تم سے بہت امیدیں ہیں بیٹا! میں چاہتی

ہوں تم اس گھر اور اپنی جینھانیوں کو سدھار دو۔ بس
اب یہ مہم تمہارے ذمے ہے۔" اچانک ہاورچی
خانے سے کالج گرنے کی آواز آئی۔ اماں اور عارفہ

چونک گئیں۔
اماں نے کہا "دیکھو بہو، کیا ہوا ہے؟ اللہ خیر کرے۔"
عارفہ بھاگی بھاگی ہاورچی خانے گئی۔ بلی نے

گلاس گرا دیا تھا۔ اب جھونے برتنوں میں منہ مار رہی
تھی۔ اس نے جلدی سے بلی کو بھگایا۔ اتنی دیر میں
اماں کی تین آوازیں آگئیں "کیا ہوا، کیا گرا، کون

ہے وہاں؟"
عارفہ نے واپس جا کر اماں کو تسلی دی۔ پھر چائے
کے پیالی اٹھائی جس پر کھیاں جھنسن رہی تھیں اور

ہاورچی خانے آگئی۔ صبح کے دس بجتے والے تھے مگر گھر
میں سب بے سدھ سوئے پڑے تھے۔

اب وہ ہاورچی خانے کی صفائی کا سوچنے لگی۔
زاہن میں کاموں کو ترتیب دیا اور بسم اللہ پڑھ کر
شروع ہو گئی۔ کچھ دیر میں نوکرانی بھی چلی آئی۔ اس

نے اپنی نگرانی میں سارا کام کرایا۔ ابھی کام جاری
تھے کہ جینھانیاں ایک ایک کر کے جمائیاں لیتی نمودار
ہوئیں۔ ہاورچی خانے میں صفائی دیکھ کر حیران

ہوئیں اور تھوڑی شرمندہ بھی! اس نے جینھانیوں کو
سلام کیا اور چائے چڑھا دی۔ پھر فریج میں رکھی
تندوری روٹیاں تلنے لگی۔ سمیرا نے تو کوئی نوٹس نہ لیا

سلطان ٹیچر کی وصیت

تو رہ لورہ شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلا بھی ہم نشیں ہو تو عمل نہ کر قبول

اے جوئے آب یزد کے ہو دریاے تند و تیز
سائل تجھے عطا ہو تو سائل نہ کر قبول

کھویا نہ جا صنم کدہ کائنات میں
مغفل گداز! گرمی مغفل نہ کر قبول

صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

باطل دوئی پسند ہے لاشریک ہے
شرکت میانہ حق و باطل نہ کر قبول!

بیداری

جس بندہ حق میں کی خودی ہو گئی بیدار
شمشیر کی مانند ہے بزمندہ و بذاق

اس کی نگہ شوخ پہ ہوتی ہے نمودار
ہر ذرے میں پوشیدہ ہے جو قوت اشراق

اس مرد خدا سے کوئی نسبت نہیں تجھ کو
تو بندہ آفاق ہے وہ صاحب آفاق

تجھ میں ابھی پیدا نہیں سائل کی طلب بھی
وہ پاکی فطرت سے ہوا محروم اہفاق
(علامہ اقبال)

کچھ دیر کو اماں خاموش ہو گئیں۔ چہرے پر غم و
کرب کے آثار نمایاں تھے۔ ضبط کرنے کے باوجود دو

آنسو آنکھوں سے نکل کر گالوں تک لڑھک آئے۔
انہیں دوپٹے کے پلو میں جذب کیا اور دوبارہ وہیں

سے تسلسل جوڑا "اس اچانک صدے نے ہمیں دم
بخود کر دیا۔ ہمیں کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔ ایسے حالات

میں عاصم نے بہت دکھائی اور پھونکا ہونے کے باوجود
سب کو دلا سا دیا۔

"انہی دنوں اظہر کو اچھی جگہ نوکری مل گئی۔ وہ
کپڑے کی دکان تو مشپ ہو گئی تھی، اب اظہر کی تنخواہ

سے گھر چلنے لگا۔ وقت بہت بڑا مرہم ہے جس نے
زخموں کو بھرنا شروع ہی کیا تھا کہ اظہر پر شادی کا بہوت

سوار ہو گیا۔ لڑکیاں تو میری نظر میں بہت تھیں مگر ایک
دن اچانک اظہر سمیرا کو بیاہ لایا اور ہم سب کو حیران و

ششدر کر دیا۔ خاندان والوں کی باتوں سے بچنے کے
لپے میں نے اظہر اور سمیرا کی رسمیں ادا کرا دیں۔

"سمیرا اظہر کے دفتر میں کام کرتی تھی۔ شکل و
صورت کی تو اچھی ہے مگر سلیقہ و گھرداری نام کو نہیں۔
خیر خاموشی اختیار کرنا پڑی۔ جب محمود کی ہاری آئی تو

اس نے بھی اپنی پسند بتا دی البتہ رشتہ میں لینے گئی۔
محمود کو لاکھ سمجھایا، ناراض بھی ہوئی مگر اس نے یہ کہہ
کر چپ کر دیا کہ اگر آپ شادی نہیں کرائیں گی تو
میں بھی اظہر بھائی کی طرح امبر کو بیاہ لاؤں گا۔ لہذا
مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی یہ کڑوی گولی نگلنی پڑی۔
شروع میں امبر نے گھر کے کاموں میں دلچسپی لی
پھر بڑی بیہوشی دیکھا دیکھی اس نے بھی ہاتھ کھینچ لیا۔
دونوں نے نوکرانی لگائی جو انتہائی گندا کام کرتی تھی مجھے وہ
پسند نہ تھی۔ ایک دن نوکرانی سے میری لڑائی بھی ہوئی۔

یاد رفتگان

ان گنت داستاں میں سموئے ہوئے ہے۔
اسی برگد کے سائے تلے، کیفے نیر یا والی جانب
چھوٹی میز سہائے ایک قدرے پستہ قد، درویش منش اور کم
گو وکیل سالہا سال سے ڈیرہ جمائے نظر آتا۔ وہ اکثر
دائیں بائیں بیٹھے دیہاتی وضع قطع والے سادہ لوح لوگوں
کے مسائل سننے میں لگن ہوتا یا اخبار نویس دوستوں کی
چائے پانی سے تواضع میں مصروف پایا جاتا۔ مگر اب یہ میز
خالی ہو چکی کہ اس پر مفضل سجانے والا وہاں جا چکا جہاں
سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔ ایم ڈی طاہر نے یہیں اپنی
زندگی کے پینتیس چھتیس سال ایک ہی ڈھب پر گزارے
اور آخر ۲۱ اپریل ۲۰۰۸ء کو دارفانی سے کوچ کر گئے۔

عدالتوں میں آمدورفت رکھنے یا اخبار پڑھنے والا
شاید ہی کوئی ایسا قاری ہو گا جس نے ایم ڈی طاہر کا
نام پڑھا یا سنا نہ ہو۔ ان کی وجہ شہرت وہ ہزاروں کیس
تھے جو انھوں نے کسی فیس کی لالچ یا معاوضہ کی خاطر
نہیں بلکہ خالصتاً معاشرتی فلاح، مفاد عامہ اور عوامی
مسائل حل کرنے کے لیے اپنے طور پر دائر کیے۔ ان
میں سے اکثر تو ابتدا ہی ناقابل سماعت قرار دے دیے
گئے یا بعد از سماعت مسترد ہوئے۔ لیکن سیکڑوں
مقدمات ایسے ہیں جن میں ان کی دائر کردہ درخواست
سے عام آدمی کو فائدہ پہنچا۔

وہ جہاں کہیں مفاد عامہ کا کوئی معاملہ دیکھتے، ستائش
کی تمنا اور صلے کی پروا کیے بغیر درخواست تیار کرتے اور
عدالت میں دائر کر دیتے۔ ایسی کتنی درخواستیں انھوں نے
دائر کیں، صحیح تعداد تو شاید انھیں خود بھی یاد نہیں تھی لیکن ان
کے بقول دس ہزار سے زائد تھیں۔ یہ تعداد عالمی ریکارڈ



صلے کی تمنا نہ ستائش کی پروا

لاہور ہائیکورٹ کا عوامی راہنما

عدالتوں میں بے جگری سے بے بس
عوام کی آواز بلند کرنے والے ایک
بہادر وکیل کے اوراق زریست

حامد ریاض ڈوگر

عبدالست
عالیہ لاہور کے احاطے میں یوں تو کئی
برگد استادہ ہیں۔ یہ درخت اپنی عمر اور
گھنے سائے کے لحاظ سے ایک سے
بڑھ کر ایک ہیں۔ مگر کراچی شہدا ہال، ہائیکورٹ بار
ایسوسی ایشن کی لائبریری و دفاتر اور کیفے نیر یا کی عمارتوں
کے درمیان گھرا ہوا برگد سب سے نرالی شان کا مالک اور
اپنے دامن میں ہماری آئینی، قانونی اور سیاسی تاریخ کی

تمھارے پاس کھانے کے لیے بھی پیسے نہیں ہوں
گے۔ پھر کیا کرو گے؟“ یہ سن کر بچے پریشان ہو گئے۔
انھیں گھبرایا ہوا دیکھ کر عارفہ نے کہا ”آج سے
شام کو میں تم سب کو پڑھاؤں گی مگر میری باتیں ماننا
ہوں گی۔“

بچے خوش ہو گئے اور انھوں نے دل لگا کر پڑھنے کا
عہد کیا۔ دن پڑھا کر اڑنے لگے۔ اگلی بار جب بچوں کا
نتیجہ آیا تو یہ دیکھ کر سب کی خوشی کی انتہا نہ رہی کہ انھوں
نے بہت اچھے نمبر لیے تھے۔ تب اظہر اور محمود نے اپنی
بیویوں کو خوب ڈانٹا کہ انہی کی غیر ذمے داری کے
باعث گھر اور بچے، سب کچھ بگڑ گیا تھا۔ بلکہ ماں بھی یہ
حسرت دل میں لیے اللہ کو پیار ہو گئیں۔ سمیرا اور امبر کو
سمجھ آگئی تھی اور وہ شرمندہ بھی تھیں۔ عورتوں نے گھر کو
بگاڑا تھا اور ایک عورت نے ہی اسے سنوار دیا۔ اب
سمیرا اور امبر عارفہ کے ساتھ گھر کے کام کرانے لگیں جو
بڑی خوشگوار تبدیلی تھی۔

ایک شام عارفہ نماز عصر پڑھ کر بچوں کو
پڑھانے کی غرض سے باہر آئی تو یہ دیکھ کر دل باغ
باغ ہو گیا کہ سمیرا بچوں کو پڑھا رہی تھی۔ امبر پودوں
کو پانی دینے میں مگھی۔ پھولوں کی خوشبو پورے صحن
کو مہکا رہی تھی۔ اس نے چائے بنائی اور صحن میں
جینھانیوں کے پاس آ بیٹھی۔ اب امبر بھی بچوں کو
ہوم ورک کر داری تھی۔ یہ بات عیاں تھی کہ انھیں
اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہو گیا تھا۔ عارفہ چائے
پیتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھنے لگی اور تخت پر
ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑبڑائی ”کاش آج یہاں ماں
بیٹھی مسکرا رہی ہوتیں.....“

کرتے گزار دیا۔ اس طرح ایک نشتے میں اس نے گھر
کا نقشہ ہی بدل ڈالا۔ دونوں جینھانیوں نے محسوس کیا
کہ گھر پہلے کی طرح صاف ستھرا ہو گیا ہے جیسے اماں
رکھتی تھیں۔ اماں تو بہت خوش تھیں۔ البتہ انھیں یہ فکر
ستاتی کہ بڑی بہنیں بھی کسی طرح اپنی ذمہ داری کا
احساس کر لیں۔ سمیرا کے تین بچے تھے اور امبر کے دو۔
وہ داری سے کہانیاں سن کر خوش ہوتے تھے۔

اماں انھیں نبیوں کے قصے سناتیں مگر بہوؤں کو
ناگوار گزرتا۔ ان کا خیال تھا کہ اماں کی صحبت میں بچے
دقیقہ نوی ہو رہے ہیں۔ اس لیے ایک دن انھوں نے
انگ ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر شوہروں کے پاس اتنی رقم
نہ تھی کہ ان کی مرضی کے نئے گھر خریدتے۔ اماں نے
یہ سنا تو انھیں شدید صدمہ ہوا۔ اسی غم میں وہ بیمار پڑ
گئیں۔ عارفہ نے ان کی بہت تیمارداری کی مگر بیماری
بڑھتی گئی۔ ایک رات وہ اپنے دل میں یہ حسرت لیے
کہ گھر جیسا وہ چاہتی تھیں ویسا ہو جائے، دنیا سے فانی
سے کوچ کر گئیں۔

کچھ دن گھر کا ماحول سوگوار رہا۔ پھر سب اپنے
کاموں میں مصروف ہو گئے۔ عارفہ کو اماں کی باتیں
بہت یاد آتیں۔ عاصم بھی چپ رہنے لگے۔ عارفہ سے
بچے بہت کھل مل گئے تھے، اس لیے وہ فارغ وقت
بچوں کے ساتھ گزارتی۔ ایک دن عارفہ اپنے کمرے
میں نماز ظہر ادا کر رہی تھی کہ بچوں کے رونے کی آواز
آئی۔ سلام پھیر کر باہر آئی تو پتا چلا، سارے بچے لیل ہو
گئے ہیں۔ جینھانیوں نے بچوں کو بہت مارا۔

عارفہ نے انھیں بہلایا، کھانا کھلا کر اپنے کمرے
میں لے آئی اور سمجھایا ”پڑھو گے نہیں تو اچھی جگہ
ملازمت بھی نہیں ملے گی۔ پھر تم غریب رہو گے“

کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کا اندراج گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں کیا جانا چاہیے۔

وہ نہایت معمولی مسائل سے اہم ترین آئینی و قومی معاملات میں عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹاتے رہے۔ بظاہر ایک معمولی نظر آنے والا معاملہ یہ تھا: ۱۹۹۳ء میں انھوں نے عدالت عالیہ میں درخواست دائر کی کہ مختلف سرکاری محکمے سڑکوں پر کھدائی کرتے ہیں تو دھول اڑنے سے آلودگی پھیلتی ہے۔ ان کی اس درخواست پر عدالت عالیہ نے باقاعدہ حکم جاری کیا کہ سڑکوں کی کھدائی کرنے والے محکمے دھول اڑنے اور آلودگی پھیلنے سے روکنے کے لیے کھدی جگہ پر پانی کا چھڑکاؤ اس وقت تک کرتے رہیں جب تک سڑک اصل حالت میں بحال نہیں ہو جاتی۔

اسی طرح قومی زندگی کے اہم ترین سانحہ ”سقوط مشرقی پاکستان“ کے اصل حقائق منظر عام پر لانے کے لیے انھوں نے عدالت عالیہ میں درخواست دائر کی۔ اس میں صدر مملکت جنرل یحییٰ خان کا بیان قلم بند کیے جانے کی استدعا شامل تھی۔ اس پر چیف جسٹس مولوی مشتاق کی سربراہی میں قائم عدالت عالیہ کے فیصلے نے انھیں یہ ذمہ داری سونپی کہ اگر جنرل یحییٰ خان انھیں اپنا وکیل مقرر کر دیں تو وہ ان کا بیان حاصل کر کے عدالت میں پیش کریں۔

چنانچہ انھوں نے یحییٰ خان اور ان کے اہل خانہ سے رابطہ کر کے اس حالت میں جنرل سے ملاقات کی جب وہ بستر علالت پر دراز اور بہ سبب لقوہ و فالج بولنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکے تھے۔ ایم ڈی طاہر نے ان کے بیٹے علی یحییٰ خان کا تحریری بیان حاصل کیا۔ اس طویل تحریری بیان میں شیخ مجیب

ہندی کتب

اقبال! یہاں نام نہ لے علم خودی کا موزوں نہیں کتب کے لیے ایسے مقالات بہتر ہے کہ بچارے مولوں کی نظر سے پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات آزاد کی اک آن ہے محکوم کا اک سال کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات! آزاد کا ہر لحظہ پیامِ ابدیت محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منور محکوم کو اندیشہ حقیقت گرفتار خرافات محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی موسیقی و صورت گری و دلم نباتات!

دین و تعلیم

مجھ کو معلوم ہیں پیرانِ حرام کے انداز ہونہ اخلاص تو دعوائے نظر لاف و گزاف اور یہ اہل کلیسا کا نظامِ تعلیم ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف اُس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے قوم جو کہ نہ سکی اپنی خودی سے انصاف فطرتِ افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

(علامہ اقبال)

الرحمن، ذوالفقار علی بھٹو، عبدالحمید بھاشانی، ایئر مارشل رحیم اور جنرل گل حسن وغیرہ جیسی نامی گرامی شخصیات کے متعلق اہم انکشافات موجود ہیں۔ یہ بیان ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے جسے بعد ازاں حمود الرحمن کمیشن رپورٹ کا حصہ بھی بنایا گیا۔ یوں ایم ڈی طاہر مرحوم نے ملک و قوم کی اہم خدمت انجام دی۔

انھوں نے چھوٹی بڑی نوعیت کے بے شمار معاملات کی جانب عدالتوں اور ذرائع ابلانغ کے ذریعے پوری قوم کو متوجہ کیا۔ ان میں موٹر سائیکل پر ڈبل سواری کی پابندی، موٹر سائیکل سواروں کے لیے ہیلمٹ لازمی قرار دیا جانا، کھلے مین ہولز میں گر کر معصوم بچوں کی ہلاکت، ماحولیاتی آلودگی کا مسئلہ، مہنگائی، بے روزگاری، بجلی اور گیس وغیرہ کے نرخوں میں اضافہ، قومی دولت لوٹنے اور بینکوں سے اربوں روپے کے قرضے معاف کرانے والوں کا احتساب، جیلوں میں قیدیوں کی مشکلات اور جرمانہ ادا نہ کر سکنے والے غریب قیدیوں کی دادی جیسے بے شمار مسائل شامل ہیں۔

فوجی افسروں کو چولستان میں برائے نام قیمت پر زمینوں کی الاٹمنٹ کے خلاف درخواست بھی اسی مرد درویش نے دائر کی تھی۔ وہ عدالت سے رجوع کرنے کے لیے کسی سائل کا انتظار نہ کرتے بلکہ اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں اور ملک بھر سے آئے خطوط کو

بنیاد بنا کر درخواست لکھتے اور عدالت میں خود سائل کی حیثیت سے پیش ہو جاتے۔ ان کے اس طرز عمل سے بعض جج حضرات بہت نالاں تھے اور انھیں سخت سست بھی کہتے۔ مگر ”وہ اپنی خون نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں بدلیں“ کے مصداق اپنی ہی دھن میں گمن ایم ڈی طاہر نے ہر طرح کے حالات میں اپنا کام جاری رکھا اور ہر قسم کی مشکلات، عدلیہ کے حوصلہ شکن رویے اور ساتھی وکلاء کے طعن تشنیع کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔

میاں نواز شریف اور چیف جسٹس پاکستان سجاد علی شاہ کے مابین تنازع کے دنوں میں انھوں نے عدالت عالیہ لاہور میں جسٹس صاحب کی حمایت میں درخواست دائر کر دی۔ عدالت عالیہ نے نہ صرف ان کی درخواست کو مسترد کیا بلکہ انھیں پچاس ہزار روپے جرمانہ بھی کر ڈالا۔ اسی طرح ایک درخواست کی سماعت کے دوران عدالت عالیہ لاہور کے چیف جسٹس، افتخار محمد حسین چودھری سے ان کی تلخ کلامی ہو گئی۔ چیف جسٹس نے انھیں توہین عدالت کے جرم میں سزا سن کر جیل بھجوا دیا۔ بعد ازاں عدالت عظمیٰ نے ان کی سزا معطل کر کے انھیں رہا کر دیا۔ اس طرح کے ناگوار واقعات مرحوم کی عدالتی زندگی میں روزمرہ کا معمول بن چکے تھے مگر انھوں نے گھبرانے یا خوفزدہ ہونے کے بجائے جرأت سے ان کا سامنا کیا۔



ایک نیک روح جسے خدا نے جلد اپنے پاس بلا لیا

میاں نواز شریف اور چیف جسٹس پاکستان سجاد علی شاہ کے مابین تنازع کے دنوں میں انھوں نے عدالت عالیہ لاہور میں جسٹس صاحب کی حمایت میں درخواست دائر کر دی۔ عدالت عالیہ نے نہ صرف ان کی درخواست کو مسترد کیا بلکہ انھیں پچاس ہزار روپے جرمانہ بھی کر ڈالا۔ اسی طرح ایک درخواست کی سماعت کے دوران عدالت عالیہ لاہور کے چیف جسٹس، افتخار محمد حسین چودھری سے ان کی تلخ کلامی ہو گئی۔ چیف جسٹس نے انھیں توہین عدالت کے جرم میں سزا سن کر جیل بھجوا دیا۔ بعد ازاں عدالت عظمیٰ نے ان کی سزا معطل کر کے انھیں رہا کر دیا۔ اس طرح کے ناگوار واقعات مرحوم کی عدالتی زندگی میں روزمرہ کا معمول بن چکے تھے مگر انھوں نے گھبرانے یا خوفزدہ ہونے کے بجائے جرأت سے ان کا سامنا کیا۔

ایم ڈی طاہر کا اصل نام محمد دین طاہر تھا۔ ۱۹۳۲ء

آپ بیتی

بولیاں بولتے نایق گانا ہوتا۔ ہر سال میلے پر چند قوال تشریف لاتے۔ قبرستان کے منگ نے قوالوں کے لیے دو تین دیسی مرنے پال رکھے ہوتے جو ذبح کیے جاتے۔ قوال خود ہی وہ مرنے پکاتے اور خوب سیر ہو کر کھاتے۔ اس کے بعد قوالی شروع ہو جاتی اور خوب سماں بندھتا۔

شام کو بزرگ اور جوان چوپال یا تیلھکوں میں جمع ہوتے۔ کوئی خوش گلو جوان بیروارث شاہ یا میاں محمد بخش کا کلام پڑھتا اور حاضرین کو محفوظ کرتا۔ ایک دفعہ نمبر دار کی شادی پر لاہور سے عالم لوہار کو بلوایا گیا۔ مرحوم نے اونچے سُرور میں جگنی گا کر سماں باندھا کہ لوگ اش اش کر اٹھے۔ برسوں بعد جب گاؤں میں ایک تمنا دار کی شادی میں عارف لوہار کو سنا گیا تو نوجوان طبقہ خاصا لطف اندوز ہوا۔ مگر بزرگوں نے کہا، وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ بزرگوں کو عالم لوہار کی گائیکی میں مزہ زیادہ آتا تھا۔

دیہی زندگی کے ایک سوسال

ہیر وارث شاہ سے موبائل تک

انسانی زندگی میں مشینی تفریح کا

بڑھتا عمل دخل ہماری کچھ اقدار بھی

تلف کر چکا..... تصویر کا دوسرا رخ

احسان اللہ گھڑیل

بزرگ بتایا کرتے تھے کہ برسوں پہلے گاؤں میں بجلی نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ان کی تفریح صرف یہ تھی کہ موسم گرما میں گاؤں کے قریب ایک دو میلے منعقد ہوا کرتے۔ ان میں کھانے پینے کی چند دکانیں ہوتیں۔ تفریح کے نام پہ بھانڈا اپنی



کبھی بات کرنے کا کہہ کر معاملہ نال دیا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ یہ ان کی اولیائے کرام سے بے پناہ عقیدت کا کمال تھا۔ وہ بری پاک قلندری (گجرات) کے مرید تھے۔ اظہار عقیدت کے لیے ہی انہوں نے بری پاک قلندری (گجرات) بابا حسین بادشاہ شکر گزھی اور حضرت گلزار (پنڈدادن خان) کے مزارات تعمیر کرائے۔ جی ٹی روڈ شاہدہ کے قریب رہنا ناؤن میں جامع مسجد طاہر المسلمین اور دینی مدرسے کی تعمیر بھی شروع کر رکھی تھی کہ بلاوا آ گیا۔ چنانچہ انہیں وصیت کے مطابق اسی مسجد سے ملحق احاطہ میں دفن کیا گیا۔

ایم ڈی طاہر معروف قانون دان تھے مگر اپنی پیشہ وارانہ مصروفیات کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری اور تصنیف و تالیف کے لیے بھی وقت نکال لیتے۔ ان کی صوفیانہ پنجابی شاعری کے دو مجموعے ”جناں گھنڈاٹھا“ اور ”ماں دی ٹھنڈی چھاں“ شائع ہو چکے۔ ان کی شاعری مرشد سے اظہار محبت کا ذریعہ ہے۔ اس کے علاوہ ”وکالت اور عدالت، ایڈووکیٹ اینڈ کورٹس“ اور ”کردار سازی کے لیے پانچ اصول موتی“ کے نام سے ان کی کتب بھی چھپ چکی۔ مفاد عامہ کی رٹ درخواستوں کا مجموعہ دو جلدوں میں شائع ہوا۔ اس کی تقریب رونمائی میں وہ ایک حرف انکار پر شہرت کی بلند یوں کو چھونے والے سابق چیف جسٹس افتخار محمد حسین چودھری کو بلانا چاہتے تھے مگر موت نے مہلت نہ دی۔ تقریب سے قبل ہی وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

میں بھارت کے شہر انبالہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں آزادی کے بعد نہایت کمسنی میں اپنے خاندان کے ہمراہ پاکستان چلے آئے۔ ہجرت کے بعد پیش آنے والے دلہوز حادثات میں ایک بہن کے علاوہ ان کے تمام عزیز واقارب کام آئے۔ انتہائی مشکل حالات میں بڑی بہن نے ان کی پرورش کی۔

وہ اپنے رشتہ داروں کے پاس منڈی بہاؤ الدین میں مقیم ہوئے۔ ایم ڈی طاہر اپنا اور بہن کا پیٹ پالنے کے لیے برف بیچتے رہے، بکریاں چرائیں اور گلہری بھی کی۔ نامساعد حالت میں بھی ہمت نہیں ہاری اور انہی ہنگفتہ بہ حالات میں زمیندار کالج گجرات سے گریجویشن اور پنجاب یونیورسٹی کالج سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ۱۹۷۲ء میں وکالت کرنے لگے۔

انہوں نے محنت و لگن سے خوب نام کمایا، مگر کبھی عجز و انکسار کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اچھے دنوں میں بھی انہوں نے اپنے مشکل وقت کو یوں یاد رکھا کہ ہر مصیبت زدہ، غریب اور مفلوک الحال سائل کا کیس فیس اور معاوضے کی پروا کیے بغیر قبول کرتے اور پھر اس کی دادری کے لیے جان تک لڑا دیتے۔

ایم ڈی طاہر اولیائے کرام سے بہت زیادہ عقیدت رکھتے تھے۔ کم و بیش پچیس سال قبل راقم الحروف مفاد عامہ کے کیسوں سے متعلق گفتگو کرنے ان کے چیمبر میں حاضر ہوا۔ یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ اس اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص کے چیمبر میں قانون کی کتابوں سے بھری الماریوں کے اوپر بہت سے روایتی بزرگوں کی تصاویر آویزاں ہیں۔ راقم سے رہا نہ گیا اور ان کی بابت استفسار کیا مگر وہ بات گول کر گئے اور اس موضوع پر پھر

اور نہ ہی کھیلنے دیں گے۔

اس زمانے میں اکثر نوجوانوں کے ہاتھوں میں درسی کتب کی جگہ ویڈیو کیسٹ نظر آتے اور جوانوں اور بوزھوں کی محفلوں میں فلمیں ہی زیر بحث رہتیں۔ ہر طرح کی پاکستانی و بھارتی فلمیں دیکھی جاتیں۔ بزرگ حضرات ہنہانی فلموں کی فرمائش کرتے جب کہ نوجوان طبقہ مارکٹائی والی فلموں کو زیادہ پسند کرتا۔ لوگوں نے ڈائریاں بنا رکھی تھیں جن میں دیکھی گئی فلموں کے نام اداکاروں سمیت درج ہوتے۔

گاؤں کے ایک بزرگ جب دوسروں کے گھر جاتے تو آتے ہی فلم 'دھی رانی' لگانے کی فرمائش کرتے۔ مرحوم کو فلم میں مشہور اداکارہ انجمن کا کردار 'بلو' بڑا پسند تھا۔ آتے ہی کہتے کہ بلو والی فلم لگاؤ۔ رفتہ رفتہ گاؤں کے منچوں نے باباجی کا نام ہی 'بابا بلو' رکھ دیا۔ یہ نام باقاعدہ ان کی چیئر بن گیا۔ لڑکے ہالے جہاں بھی باباجی کو دیکھتے، آوازے کستے اور بھاگ جاتے۔ مرحوم لاٹھی لے کر پیچھے بھاگتے۔

جلد ہی قریبی شہروں میں سیکڑوں کے حساب سے منی سینما گھر بن گئے۔ ان میں ہر طرح کی اخلاق سوز فلمیں دکھائی جاتیں اور کوئی پوچھنے والا اس وقت تھا نہ اب ہے۔ وی سی آر کے بعد سی ڈی اور ڈی وی ڈی کا چلن عام ہوا اور اسٹیج ڈراموں کی بہتات ہو گئی۔ اب ہر بندہ، کیا بوزھا کیا جوان، جکتیں کرنے لگا۔ ہر نوجوان اپنی جگہ ایک بھانڈا بن بیٹھا۔ ڈرامے بھی آپ نے کوئی سنجیدہ بات کی، اس نے جکتوں میں ازادی۔ پھر کیبل کا دور آ گیا۔

شہر سے کرائے پر وی سی آر لے آتے۔

چار پانچ نوجوانوں کا گروہ ہوتا۔ ایک نوجوان نے سر پہ نیلی ویشن، دوسرے نے وی سی آر اور تیسرے نے ویڈیو کیسٹوں کا شاہراہ اٹھایا ہوتا۔ وہ گاؤں میں داخل ہوتے، کبھی پیدل، کبھی تانگے پر اور کبھی چارہ ڈھونڈنے والے گدھے پر! جب یہ تالہ گاؤں میں داخل ہوتا تو بچے نعروں سے ان کا استقبال کرتے۔ مخبر سارے گاؤں میں خبر پھیلا دیتا کہ آج لٹاں محلے میں فلم دیکھنے کا پروگرام ہے۔ شام کو پورا گاؤں وہاں جمع ہو جاتا۔ چوک میں رکھ کے ٹی وی اور وی سی آر چلا دیا جاتا۔ چھوٹے بچے آگے زمین پر بیٹھ جاتے۔ بوزھے اور نوجوان چار پائیوں اور خواتین چھتوں پر بیٹھ جاتیں۔ رات دو تین بجے تک یہ مشغل جاری رہتا۔

موسم گرما خیریت سے گزر جاتا کیوں کہ فلم کا پروگرام چوک میں ہوتا اور کافی دنیا سا جاتی۔ سردیوں میں البتہ مشکل پیش آتی۔ وی سی آر کا پروگرام کسی بیٹھک میں ہوتا۔ اس کمرے میں صرف مخصوص افراد ہی کے بیٹھنے کی جگہ ہوتی جو آپس میں کرائے کے لیے رقم اکٹھی کرتے تھے۔ وہ آرام سے بیٹھک میں بیٹھ کر فلم دیکھتے۔ منت خورے بچوں اور لڑکوں کا ہجوم بازار میں کھڑا رہتا اور اندر بیٹھے لوگوں کو طرح طرح سے تنگ کرتا۔ کبھی دروازہ بجایا جاتا۔ کبھی دروازوں اور کھڑکیوں پر پتھر برسائے جاتے۔ شرارت کر کے نوجوان بھاگ جاتے۔ جب کسی طرح سے دال نہ گلتی تو منچلے نوجوان گاؤں کے ٹرانسپارمر سے چیئر خانی کرتے۔ گویا خود کھیلنے کے

بیٹریوں پر نیلی ویشن چلاتے اور ڈراما ضرور دیکھتے۔ عرفان کھوسٹ بطور "ڈائریکٹ حوالدار" بہت پسند کیا گیا۔

پھر رنگین نیلی ویشن آیا اور ٹی وی کا مزہ دوہالا ہو گیا۔ ٹی وی دیکھنے والے بچوں سے چھوٹے موٹے کام بھی لیے جاتے۔ مثلاً اینٹوں کا ڈھیر ایک سے دوسری جگہ منتقل کرنا ہوتا تو بچے منوں میں یہ کام خوشی خوشی کر دیتے۔ بعض عورتیں لنڈے سے آونی جریاں منگوا لیتیں۔ ٹی وی دیکھنے کے ساتھ ساتھ بچے جریاں بھی اُدھرتے رہتے۔ قریبی شہر میں سینما گھر بھی موجود تھا۔ اتوار کے روز گاؤں کے نوجوان اکٹھے ہو کر فلم کا پارہ بچے والا شو دیکھنے جاتے۔ صادق ماٹھی کو لوگ آج بھی فلم مولا جٹ کے حوالے سے چھیڑتے ہیں۔

فلم چل رہی تھی۔ مولا جٹ گنڈا سا لیے سامنے آیا تو بھولے بھالے صادق کے ساتھ بیٹھے شرارتی نوجوان نے کان میں کہا "سادو! بھاگ مولا جٹ تیری طرف آ رہا ہے۔" سادو لوح صادق نے گھبرا کر سینما ہال میں ہی دوڑ لگا دی۔ یہ دیکھ کر پورا سینما ہال تہقہوں سے گونج اٹھا۔

پھر وی سی آر نام کی ایک مشین ایجاد ہوئی۔ یہ وہ ایجاد ہے جس نے پوری نسل کو برباد کر ڈالا۔ نوجوان، بچے، بوزھے اور خواتین سبھی وی سی آر کے شوقین نکلے۔ گاؤں کے دو تین گھروں میں وی سی آر تھا۔ وہ ہفتے میں ایک دو دن وی سی آر پر لوگوں کو فلم دکھاتے۔ پھر گاؤں کے نوجوان محلے میں مختلف گھروں سے دس دس روپے اکٹھے کرنے لگے۔ وہ

پھر گاؤں کے ایک چودھری صاحب ریڈیو لے آئے۔ اب پیپہ پیپہ لوگ شام کو چودھری کی بیٹھک میں جمع ہو جاتے۔ ملکی اور غیر ملکی خبریں سنتے اور ساتھ ساتھ موسیقی سے لطف اندوز ہوتے۔ اسی ریڈیو پر لوگوں نے ہندوستان کی آزادی کا اعلان سنا کہ ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اور اب ان کا وطن پاکستان ہے۔ ۱۹۶۵ء اور پھر ۱۹۷۱ء کے جنگی واقعات بھی اسی ریڈیو کے ذریعے لوگوں کو معلوم ہوئے۔ نور جہاں کے ملتی ترانے بھی ان کی یادوں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ریڈیو پاکستان کے معروف کمپیوٹر نظام دین کا نام آج بھی بزرگوں کو یاد ہے۔ مرحوم حالات حاضرہ کو دلچسپ باتوں اور لطیفوں میں بیان کرتے تھے۔

ریڈیو کے بعد نیلی ویشن آیا جو آواز کے ساتھ تصویر بھی دکھاتا۔ گاؤں کے دو تین متمول خاندان جن کے جوان بہ سلسلہ روزگار سعودی عرب میں مقیم تھے، نیلی ویشن لے آئے۔ سرشام صحن میں چٹائی یا دری ڈال دی جاتی۔ اڑوس پڑوس کے بچے اور خواتین جمع ہوتیں۔ ہفتہ وار اقساط میں ڈرامے دکھائے جاتے۔ لوگ پورا ہفتہ ایک ڈرامے کا انتظار کرتے۔ بچوں کو نصیحت کی جاتی کہ پاؤں دھو کر آئیں اور شور نہ مچایا کریں۔

سونا چاندی، اندھیرا اجالا اور وارث نامی ڈرامے اس دور کی یادوں میں شامل ہیں۔ مقبول ترین ڈراما اندھیرا اجالا ہوا کرتا۔ جس دن یہ ڈراما لگتا، شام کو گاؤں میں ہو کا عالم ہوتا۔ اگر کبھی کبھار لوڈ شیڈنگ ہوا کرتی تو یار لوگ اپنے ٹریکٹروں کی



ایک صدی قبل کا دلچسپ واقعہ

جب علامہ اقبال نے

مجھے ہندوؤں سے لڑوا ڈالا

ممتاز اردو ادیب کے قلم سے ان لمحات کا شگفتہ تذکرہ
جو شاعر مشرق کی معیت میں بسر ہوئے

ایم۔ اہلم

نے ۱۹۰۸ء میں اسلامیہ ہائی اسکول

شیرانوالہ گیٹ سے میٹرک کیا اور اردو
میں بانی پرائیوٹ کالج میں شہسختی حاصل کر

لیا۔ پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ مجھے اسکول
کے زمانے سے شعر و شاعری کا بھی شوق تھا۔ اس کے

علاوہ ادبی طرز کے چھوٹے چھوٹے مضامین بھی لکھا
کرتا۔ یہ مضامین ”کشمیری میگزین“ میں چھپتے جو لاہور

سے منشی محمد دین فوق کی زیر اہانت ماہ ماہ شائع ہوتا تھا۔
منشی محمد دین فوق کے جناب ڈاکٹر پروفیسر شیخ محمد

اقبال سے گہرے مراسم تھے۔ میرے کالج میں سالانہ
امتحان کے نتیجے میں جو انعامات دیے جاتے ان میں

نیچرل شاعری کے لیے بھی ایک انعام تھا۔ ایک بار میں
نے ”وسط ایشیا“ کے عنوان سے نظم لکھ کر پیش کر دی۔

شاعری کے انعام کا فیصلہ بھی حضرت ڈاکٹر صاحب نے
کرنا تھا۔ پہلا انعام مجھے ملا۔ انعامات پنجاب کے

لیفٹیننٹ گورنر دیتے تھے۔ جس روز انعام تقسیم کیے
جاتے اسی رات کالج کی ڈراما ٹک سوسائٹی ایک ڈراما

پیش کیا کرتی اور اس کے بعد انعامی نظم
سنوائی جاتی۔ اس موقع پر سب کالجوں کے پروفیسر اور
مہماندین شہر بھی مدعو ہوتے۔ چنانچہ جب ڈراما ختم ہوا
تو مجھے نظم سنانے کو کہا گیا۔

اس زمانے میں لاڈل اپیکر نہیں ہوتے تھے۔ کالج کا
وسیع ہال مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ میری آواز بلند تھی اور

میں نظم نے سے پڑھا کرتا۔ مجھے یہ کہتے ہوئے فخر محسوس
ہوتا ہے کہ نظم بہت پسند کی گئی۔ اگلے روز کالج میں چھٹی

تھی۔ ان ایام میں جناب ڈاکٹر پروفیسر شیخ محمد اقبال ہار
ایٹ لا بھائی دروازے رہتے تھے۔ میرا بھی گھر سے کالج

آنے جانے کا یہی راستہ تھا۔
گریموں کا موسم تھا۔ کالج گیا وہ بارہ بجے کے

درمیان بند ہو جاتا۔ میرا ایک دوست بھائی دروازے ہی
میں کہیں رہتا تھا۔ چونکہ اس نے ایف۔ اے میں فلسفہ

رکھا ہوا تھا، وہ اکثر ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا
کرتا۔ میں نے جلسے میں جو نظم پڑھی تب ڈاکٹر صاحب

ہال جبریل

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے مینانے
یہاں ساتی نہیں پیدا وہاں بے ذوق ہے صہبا

نہ ایراں میں رہے باقی نہ توراں میں رہے باقی
وہ بندے فقر تھا جن کا ہلاک قیصر و کسری

یہی شیخ حرم ہے جو پڑا کر بیچ کھاتا ہے
کلیم نوڈز و ذلق اولیں و چادر زہرا

حضور حق میں اسرائیل نے میری شکایت کی
یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے برپا

ہوا آئی کہ آشوب قیامت سے یہ کیا کم ہے
”مگرتہ چینیاں احرام و کئی خفتہ و بطحا“

لبالب ہیئتہ تہذیب حاضر ہے ”لأے سے
مگر ساتی کے ہاتھوں میں نہیں پیانہ ”الآ“

دبا رکھا ہے اس کو زخمہ ور کی تیز دہتی نے
بہت نیچے سروں میں ہے ابھی یورپ کا واڈیلا

اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موج شہد جولاں بھی
نہنگوں کے نشین جس سے ہوتے ہیں تہ وہالا

(علامہ اقبال)

گاؤں کے ایک مولوی صاحب اور چند
صاحبان عقل کیبل کی مخالفت میں پیش پیش رہے۔

لیکن زیادہ تر لوگ اس کے حمایتی نکلے۔ انھوں نے
یہ جواز پیش کیا کہ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ شہروں

میں ہر گھر میں کیبل موجود ہے۔ اس پر دنیا بھر کی
خبریں سنی جاتی ہیں۔ مذہبی پروگرام پیش کیے جاتے

ہیں۔ نعت اور تواریخوں کے پروگرام ہوتے ہیں۔
چنانچہ مخالفت کے باوجود لوگوں نے کیبل کے

کنکشن لیے اور دو تین برس کے دوران ہر گھر میں
کیبل داخل ہو گئی۔ اب ہر گھر میں سینما گھر موجود

ہے۔ وہاں دنیا بھر کی فلمیں لگتی ہیں اور ناچ گانا ہوتا
ہے۔ کہیں کہیں آنے میں نمک برابر لوگ مذہبی

پروگرام بھی دیکھ لیتے ہیں۔
کیبل کے بعد موہائل کا دور آ گیا۔ ریڈیو،

ٹیلی ویژن، سینما اور وی سی آر سے مستفید ہونے
کے لیے تو ہاتھ پاؤں بلانے پڑتے تھے، موہائل

نے یہ مسئلہ بھی ختم کر ڈالا۔ اب ہر شخص کی جیب
میں دنیا جہاں کی خبریں، فلمیں اور موسیقی سمائی ہوتی

ہے۔ جب اور جہاں جی چاہا، جیب سے موہائل
نکالا اور ہر چیز سے لطف اندوز ہونے لگے۔ اس کی

اقادیت اپنی جگہ مگر غلط استعمال اخلاقیات کا جنازہ
نکال رہا ہے۔

مہمان بھی میزبان کے گھر پہنچ کر اہل خانہ کی
خیریت دریافت کرنے سے پہلے پوچھتا ہے ”آپ
کے گھر میں باریک پن والا چارج ہے؟“

آکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
موجیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

بھی موجود تھے۔ ہم جب ڈاکٹر صاحب کے مکان کے قریب سے گزرے تو میرا دوست مجھے یہ کہہ کر "آؤ ڈاکٹر صاحب کو سلام کرتے جاؤ۔" اوپر لے گیا۔

ایک کمرے میں دو پنگ ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ ایک پر جناب ڈاکٹر صاحب اور دوسرے پر حضرت گرامی جو فارسی کے مشہور شاعر تھے، استراحت فرما رہے تھے۔ حضرت گرامی جب کبھی لاہور آتے تو ڈاکٹر صاحب کے ہاں ہی قیام فرمایا کرتے۔ چھت پر ہنگامہ لگ رہا تھا۔ ایک ملازم دروازے پر بیٹھا جھلنے میں محو تھا۔

ہم نے سلام کیا اور فرش پر بیٹھ گئے۔ اچانک ایک طرف سے ڈاکٹر صاحب کا ملازم علی بخش آ گیا اور مجھے دیکھتے ہی پنجابی میں بولا "اسلم جی تاساں رات جلسے میں حد کر دتی۔" (اسلم صاحب، آپ نے رات جلسے میں حد کر دی۔) حضرت گرامی اونچا سنتے اور اونچی آواز ہی میں ٹھینٹہ پنجابی میں بات چیت کرتے تھے۔ انہوں نے علی بخش سے مخاطب ہو کر کہا

"اوائے کی کہیا ای؟" (اوتھ نے کیا کہا ہے؟)

علی بخش نے میرا نام لے کر کہا کہ میں نے کالج کے رات کے جلسے میں بڑی پیاری آواز سے ایک نظم سنائی تھی۔ یہ سن کر حضرت گرامی نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "اومندیا! سانوں وی کجھ سنا۔" (اولا کے ہمیں بھی کجھ سنا)

میں جب سے کالج آیا تھا، میں نے حضرت ڈاکٹر صاحب کو یہ کبھی نہیں بتایا کہ میں شعر بھی کہتا ہوں۔ میں اشعار کی اصلاح جناب چودھری خوشی محمد ناظم لی۔ اسے سے بذریعہ خط لیا کرتا تھا۔ ان ایام میں چودھری صاحب ریاست جموں و کشمیر میں عہدہ وزارت پہ فائز تھے۔ میں شش و پنج میں تھا کہ حضرت گرامی ذرا غصے سے بولے

"اومندیا تو سنیا نہی۔" (اولا کے تم نے سنا نہیں) میرے دوست نے بولے سے کہا کہ کوئی شعر سنا دو۔ میں نے کہا "عرض کرتا ہوں۔"

چناں چہ میں نے دو شعر سنائے۔ تیرا آباد رہے میخانہ مگر اے ساقی طش اندوزی دل کے تو وہ سماں نہ رہے قیس اڑائے نہ جنوں سے جو کہیں گردوغبار سرمہ پھر زہب وہ چشم غزالاں نہ رہے حضرت گرامی بولے

"اوائے ای تے تیرے استاد وارنگ اے۔ کوئی ہور سنا۔" (یہ تو تمہارے استاد کا رنگ ہے کوئی اور شعر سنا)

میں نے عرض کیا۔ جس طرح بنے گزارہ کر اب زمانہ نہیں شکایت کا حضرت گرامی خوش ہو کر بولے "چنگا شعراے، دل شعراے (خوب شعر ہے اچھا شعر ہے)

حضرت علامہ نے پھر فرمایا: "پھر پڑھو۔" میں نے یہی شعر پھر پڑھ دیا۔ دو چار منٹ خاموش رہنے کے بعد حضرت علامہ نے فرمایا "اسلم شعر مت کہا کرو ڈاکٹر لکھا کرو۔"

کچھ دیر بعد ہم دونوں اجازت لے کر واپس آ گئے۔ مجھے تعجب تھا کہ ایک دو روز پہلے تو مجھے شاعری پر پہلا انعام ملا اور آج شعر کہنے سے منع فرما دیا۔ شش و پنج سے چمکا رہا پانے کی خاطر میں دو چار روز بعد پھر حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ بڑی خندہ پیشانی سے ملے، باتوں باتوں میں، میں نے عرض کیا: "ڈاکٹر صاحب، (عام و خاص آپ کو ڈاکٹر ہی کہا

کرتے تھے) اس روز آپ نے مجھے شعر کہنے سے منع اور نثر لکھنے کی ہدایت فرمائی۔ میں زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہوں کہ انگریزی کہانیاں اردو میں منتقل کروں۔"

ارشاد ہوا: "کچھ مذاقت نہیں، فضا بدل دیا کرو۔ لیکن جو کچھ لکھو، قومی نکتہ نگاہ سے لکھو۔ محنت سے سب کچھ ہو سکتا ہے" اس سے زیادہ نہ میں نے کچھ پوچھا، نہ حضرت علامہ نے کچھ فرمایا۔

اسی زمانے میں پنجاب گورنمنٹ نے لائل پور (فیصل آباد) میں "پنجاب ایگریکلچرل کالج" فیصل آباد قائم کر دیا۔ یہ تین سال کا کورس تھا۔ پہلے سال کے لیے پنجاب بھر سے صرف تیرہ طالب علم منتخب کیے گئے۔ لاہور ڈویژن سے مجھے لیا گیا۔ ایگریکلچرل کالج میں داخل ہونے والا میں پہلا طالب علم تھا۔ کاشنر لاہور ڈویژن کے حکم سے مجھے گورنمنٹ کالج چھوڑنا پڑا۔ کالج چھوڑنے سے پیشتر میں نے حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہو کر مشورہ کیا۔ آپ نے مسکرا کر صرف اتنا کہا "حکم حاکم مرگ مفاجات۔"

میں پانچ سال لاہور سے باہر رہا۔ دو سال بعد گورنمنٹ نے مجھے محکمہ انہار میں بطور ضلعدار لے لیا۔ میں نے صرف تین سال ملازمت کی پھر استعفا دے دیا۔ ملازمت کے دوران دو سال سے زیادہ میں ان علاقوں میں رہا جہاں کے رہنے والوں کو "جانگی" کہا جاتا ہے۔ ان لوگوں کی تہذیب، رسم و رواج، عادات اور زندگی میں قدم قدم پر رومانیت جلوہ گر نظر آتی۔ گویا مذہب کے لفظ نظر سے وہ "اصلی مسلمان" تھے۔

ملازمت کے دوران میں ہر سال تین چار بار رخصت پر لاہور آیا اور آتے ہی حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ آپ جانگیوں کے حالات بڑے شوق

ہال جبریل سے انتخاب

گیسوائے تاب دار کو اور بھی تاب دار کر ہوش و خرد فکار کز قلب و نظر فکار کر عشق بھی ہو حجاب میں، محسن بھی ہو حجاب میں یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر

کو ہے محیط بے کراں میں ہوں ذرا سی آنکھ یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر

میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گنہگار کی آہوں میں ہوں خرف تو کو مجھے گوہر شاہوار کر

لفظہ، تو بہار اگر میرے نصیب میں نہ ہو اس دم نیم سوز کو طائرک بہار کر

ہالغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں کار جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

روز حساب جب مرا پیش ہو دلچر عمل آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

(علامہ اقبال)

سے سنتے اور ان کی زندگی کو فطری زندگی کہتے۔ کبھی مسکرا کر مجھے فرماتے:

"اسلم! تم بہت خوش نصیب ہو کہ رومانوں کی دنیا میں رہتے ہو۔ انسانوں کے لیے تمہیں بہت مواد ملتا ہو گا۔ اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرو۔"

اور یہ حقیقت ہے کہ بسلسلہ ملازمت میں جتنا عرصہ جاٹھیوں کے علاقے میں رہا میرا قلم انہی لوگوں کے رومانوں اور عجیب عجیب واقعات کی دنیا آباد کرتا رہا۔ میرے افسانے اردو ادبی رسائل میں کثرت سے شائع ہوتے۔ اس زمانے میں معاوضہ لینے کی رسم بالکل مفقود تھی۔

چودھری محمد حسین ایم۔ اے ان ایام میں سول سیکرٹریٹ میں ملازم تھے (پھر پریس برانچ کے سیکرٹری ہو گئے)۔ آپ فرصت کے لمحات حضرت علامہ کی خدمت میں گزارتے۔ حضرت علامہ کو بھی ان سے دلی لگاؤ اور محبت تھی۔ چودھری صاحب کبھی کبھی میرا کوئی افسانہ حضرت علامہ کو سنایا کرتے تھے اور بذریعہ خط ان کی رائے سے بھی مطلع کرتے۔ مجھے حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کا ارشاد یاد ابیت ابھی تک یاد تھی: ”اسلم! جو کچھ لکھو، قومی نقطہ نظر سے لکھو۔“ چنانچہ میں جو کچھ لکھتا رومانی رنگینیوں کے ساتھ ساتھ ان میں قومی رنگ بھی خوب نمایاں ہوتا۔ یعنی وہی بقول حضرت علامہ

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
ہر نہیں طاقت پر ادا ٹکر رکھتی ہے
یہ وہ زمانہ تھا جب کانگریس اور ہندو مہا سبھا شدت سے مسلمانوں کی مخالفت کر رہی تھیں۔ اور انگریزی حکومت ان کی پیٹھ ٹھونکتی۔ اسی زمانے میں، میں نے انگریزی کی ایک مزاحیہ کہانی، The jumping Erogo کو مرزا مینڈکی کے نام سے اردو کا جامہ پہنایا۔ اس افسانے کو قدرت الہی نے بہت قبولیت بخشی۔ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ نے بھی بہت پسند فرمایا۔

میں پھر ملازمت چھوڑ کر لاہور چلا آیا اور لکھنا پڑھنا ہی میرا اڑھنا بچھونا بن گیا۔ ایک روز حضرت علامہ نے مجھے فرمایا کہ میں اسی رنگ میں کانگریس اور مہا سبھا سے

متعلق بھی لکھوں۔ لیکن مضمون ذاتیات سے پاک ہو، صرف ہندو کی اسلام دشمنی، تنگ نظری اور غلامانہ ذہنیت کو مزاح کے رنگ میں کسی افسانے میں شامل کر دیا کروں..... افسانے کا نام یا عنوان کچھ بھی ہو، لیکن افسانہ ذاتیات سے بالکل پاک ہو۔

میں نے حضرت علامہ کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے تین چار مہینے محنت سے مزاحیہ مضامین لکھے، ایک مجموعہ ترتیب دیا اور اس کتاب کا نام ”مرزا جی“ رکھا۔ جس روز کتاب تیار ہوئی میں نے ایک جلد حضرت علامہ کی خدمت میں پیش کر دی۔ آپ سرورق کی تصویر دیکھ کر مسکرائے۔

”مرزا جی“ اردو ادب طبعے میں بہت مقبولیت ہوئی۔ لیکن ہندو اس سے بہت برہم ہوئے۔ ہندوستان کے تمام ہندو اخبارات میرے اور مرزا جی کے خلاف خوفناک حد تک غوغا آرائی مرزا کرنے لگے۔ حکومت سے پُر زور یہ مطالبہ ہونے لگا کہ ”مرزا جی“ بحق سرکار ضبط کر کے مصنف کو پنجاب ”بذ“ کر دیا جائے۔ لاہور میں ہندو روزنامے ”نرجیمان“ انگریزی ”ٹاپ“ اور ”پرتاپ“ میں ہر روز مرزا جی اور میرے متعلق بڑی شدت سے زہرا گلا جانے لگا۔ بنگال میں ہندوؤں کا مشہور اخبار، امرت بازار پتریکا بھی بڑی شدت سے ہندو عوام کے مطالبے کی شدت سے حمایت کرتا۔

پنجاب گورنمنٹ کا چیف سیکرٹری، مسٹر گارٹ اپنی تند مزاجی کے باعث بہت بدنام تھا۔ چودھری محمد حسین اس وقت پنجاب پریس برانچ کے سیکرٹری تھے۔ ایک روز انھوں نے مجھے بتایا کہ مسٹر گارٹ نے حکم دیا ہے ”مرزا جی“ کے جن مضامین پر ہندوؤں کو اعتراض ہے، اس کا انگریزی میں ترجمہ کرا کر حکومت کے پاس بھیج دیا جائے۔“

ہندوؤں کی اس غوغا آرائی سے میرا سارا خاندان بہت پریشان تھا۔ میں ہر روز حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا۔ جب بھی حضرت علامہ کو ہندوؤں کی غوغا آرائی کی طرف توجہ دلاتا تو آپ مسکرا کر ہمیشہ یہی فرماتے ”کچھ نہیں ہوگا۔“

وقت گزر رہا تھا۔ ہندو پریس میرے اور میری کتاب ”مرزا جی“ کے خلاف زہرا گلا رہا۔ کچھ عرصہ بعد ایک روز چودھری محمد حسین نے مجھے اپنے دفتر سے ٹیلی فون کیا اور کہا ”مبارک ہو، مسٹر گارٹ (چیف سیکرٹری پنجاب) نے فیصلہ کر دیا اور لکھا ہے:

Mirzaji is humourous and harmless. No action is needed.

(مرزا جی مزاحیہ اور بے ضرر ہے۔ اس کے خلاف کسی اقدام کی ضرورت نہیں۔)

میں اسی روز حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور چودھری محمد حسین نے مجھے ٹیلی فون پر جو کچھ کہا تھا، وہ بھی عرض کر دیا۔ یہ سن کر حضرت علامہ نے حسب دستور مسکرا کر فرمایا ”میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا، کچھ نہیں ہوگا۔“ پھر ہاتوں ہاتوں میں پہلی بار مجھے کتاب کے متعلق مسکرا کر فرمایا: ”میں نے ”مرزا جی“ پڑھا ہے۔ خوب لکھی ہے آپ نے۔“

علامہ کی خدمت میں کالج کے طلبا بھی فیض و برکت حاصل کرنے اکثر آیا کرتے تھے۔ مختلف موضوع پر بحث بھی ہوتی۔ حضرت علامہ بڑی خندہ پیشانی سے مسکرا مسکرا کر ان سے باتیں کرتے۔ قومیت کا موضوع اکثر زیر بحث رہتا۔ حضرت علامہ فرمایا کرتے تھے کہ انسان کی عزت (کردار) سے ہے۔ خصوصیت سے قومی کردار پر بہت زور دیتے۔ آپ کا ارشاد تھا کہ مسلمان کی پہچان

صرف اس کے کردار سے ہوتی ہے۔ آپ کو نوجوانوں میں قومی جذبہ دیکھنے کی بہت آرزو رہتی۔

مخلوط تعلیم کے سختی سے مخالف تھے۔ گرمیوں کا موسم تھا، حضرت علامہ حسب دستور برآمدے سے باہر پنک پر لیٹے تھے۔ چودھری محمد حسین اور میں کرسیوں پر بیٹھے تھے کہ پردے کے متعلق باتیں ہونے لگیں۔ اتنے میں ایک صاحب ہائیکل پر آئے۔ گھبرائے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ انھوں نے آتے ہی ہائیکل زمین پر ڈال دی اور حضرت علامہ کو سلام کر کے کہا:

”ڈاکٹر صاحب! آج خلیفہ شجاع الدین نے سینٹ میں مخلوط تعلیم کارپوریشن منظور کرا لیا۔“ خلیفہ شجاع الدین انجمن حمایت اسلام لاہور کے جنرل سیکرٹری تھے۔ یہ سنتے ہی حضرت علامہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ آپ نے پنک پر زور سے ہاتھ مار کر فرمایا ”آج مسلمانوں کی بدبختی پر مہر لگ گئی۔“

مجھے حضرت علامہ کے درج ذیل تین شعر بہت پسند ہیں۔

خدا تو ملتا ہے لیکن بشر نہیں ملتا
یہ چیز وہ ہے جو دیکھی کہیں کہیں میں نے
☆☆☆

اجاڑا ہے حمیر ملت و آئین نے قوموں کو
میرے اہل وطن کے دل میں کچھ فکر وطن بھی ہے
☆☆☆

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں، انوں میں بھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ انوں کا جس کو خدا کے بندے سے پیار ہو گا
(ایم اسلم اردو کے ممتاز افسانہ نگار اور ناول نگار گزرے ہیں۔ سٹی جذبوں سے مبرا رومان اور قومی مسائل آپ کی تخلیقات کے موضوع تھے) ◆◆◆

تازہ افسانہ

طاؤز نے نظر ڈالتے ہوئے اس نے دیکھا کہ ملاقاتیوں کے لیے رکھے گئے صوفے پر ایک بنوہ پڑا تھا۔ وہ ٹھنک گیا کہ یہ کون ہو سکتا ہے جسے پورا دن گزار کر بھی یاد نہ آیا کہ میرا بنوہ کہاں ہے۔ تمام ملاقاتیوں کو ذہن میں لانے سے بہتر تھا کہ وہ اسے کھول کر نام و پتا معلوم کرنے کی کوشش کرتا۔

بنوہ کھولا، کچھ رسیدیں تھیں اور چند ریال، وزنگ کارڈ اور کچھ تصاویر۔ اوہ، یہ تو اس کے دوست راشد کی پاسپورٹ سائز تصویر تھی۔ اس سے پرسوں سفارت خانے کی سیزھیاں چڑھتے ہوئے سرراہ ملاقات ہوئی تھی۔ ریحان نے اسے اپنے دفتر آنے کی دعوت دی۔ وہی آج ملنے آیا تھا۔

ریحان کے چہرے پر مسکراہٹ تیر گئی۔ یہ ہیں سدا کے لاپرواہ راشد! کالج میں تھا، تو کیسے میرا میں کتابیں چھوڑ جانا، بل ادائیگی کے بعد بتایا رقم چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہونا، بانیگ میں پھول ڈالواتے وقت ٹنگی کا ڈھکنا ڈالنے

نے گھڑی پر نظر ڈالی، میز سے اٹھا اور **ریحان** حسب معمول کل کے کاموں کی خاطر کمر ترتیب دینے لگا۔ یہ اس کی عادت تھی تاکہ دوسرے دن جب دفتر آئے تو دن کا آغاز ترتیب سے ہو۔ زندگی میں نظم و ضبط کی عادت نے اسے کئی فائدے پہنچائے تھے جن میں سے ایک جہد میں اس کی یہ شاندار ملازمت تھی۔

وہ جہد میں پاکستانی سفارت خانے کے ایک ذیلی دفتر میں اہم عہدے پر فائز تھا۔ کمرے پر

دور جدید کے انسانوں نے زمانے کو بنایا

معبود

ایک بد قسمت بیوی کی غمناک کہتا، بے حیائی کا سیلاب اسے بیٹھے بٹھائے تباہ و برباد کر گیا

توقیر عاتق



والے کے ہاتھ میں تھا کہ ادھر ادھر ڈھونڈنا اسے سب یاد آ گیا "تو تم اب تک نہیں سدھرے۔" اس نے سوچا اور بے دھیانی میں بقیہ دو تصاویر دیکھنے لگا۔

یہ کسی خاتون کی تصویر تھی۔ ہو سکتا ہے بیوی ہو اور دوسری تصویر..... اسے زبردست جھکا لگا۔ وہ بھی ایک خاتون ہی تھی..... مگر ہو بہو شیمہ سے ملتی جلتی، اس کی اپنی بیوی! پر تکلف لوازمات سے سچی میز پر بیٹھی، بے ساختہ مسکراتے ہوئے! تصویر اتنی واضح تھی کہ اس کے گال پر پڑنے والے گڑھے بھی نمایاں تھے۔ پس منظر میں ایک معروف ریستوران کا مخصوص نشان نظر آ رہا تھا۔ وہ الجھن میں پڑ گیا۔ آخر راشد سے اس کا کیا تعلق ہے؟ کبھی شیمہ نے کسی حوالے سے راشد کا ذکر تو نہیں کیا۔

اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف راشد ہی تھا۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ بنوہ ریحان کے دفتر میں ہو سکتا ہے۔ اسی کے متعلق پوچھ رہا تھا۔ ریحان کے منہ سے آہ ہاں کے بے ربط جملے نکلے۔ ادھر راشد بھی کچھ جلدی میں تھا، کل آنے کا کہہ کر کال ختم کر دی۔ ریحان بے مقصد تصویروں کو گھورتا رہا۔ پھر بنوہ دراز میں رکھ کر چابی گھمائی اور بوجھل قدموں سے لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔

.....

"پھپھو! منگنی تک تو رک جائیں گی نا!" شیمہ نے لندن سے آئی اپنی چھو پھو کے پاس بیٹھ کر بڑی امید سے پوچھا۔

"نہ بیٹا! یہاں کے حالات کا کچھ بھروسہ نہیں، پندرہ دن کے لیے آئی تھی، بارہ تو پر لگا کر ہی از گئے۔ تقریب جلد ہوتی تو شاید شریک ہو جاتی۔"

پھپھو نے صاف جواب دے دیا۔ "تو کیا ہوا، ہم تقریب جلد کر لیتے ہیں۔" یاسر نے کہا جو ابھی کمرے میں داخل ہوا تھا۔ بات یہ تھی کہ شیمہ کا رشتہ طے ہوا چکا تھا۔ اب لڑکے والے منگنی کی تقریب رکھنا چاہ رہے تھے۔ شیمہ کی امی نے جو بچوں کے یہ ارادے سنے تو ہڑ بڑا گئیں۔ کہنے لگیں "ہال کی بنگ، مہمانوں کا پناؤ، کھانے کا انتظام دلہما، لین دین، کیسے ہوگا اتنی جلدی سب کچھ؟"

"ارے امی! سب کچھ ہو جائے گا، آپ ابو سے بات تو کریں۔" یاسر نے جوش سے کہا۔

"بھابی! ایک رسم تو میرے سامنے کر لیجیے۔ پھر آپ جاتی رہیے گا، لڑکے والوں کے ہاں۔" پھپھو کو یہ پروگرام بڑا اچھا لگا۔

"تقریب تو خیر اب ایک ہی دن ہوتی ہے۔ لڑکے کو وہیں بلا لیتے ہیں۔ جو لین دین ہونا ہے، وہیں کر لیں گے۔" شیمہ کی امی نے کہا۔

"بھابی! یہ تو اور اچھا ہے۔ ورنہ دو دن وقت نکالو۔ اور اخراجات بھی کر دو۔"

نند کو سمجھاتے ہوئے امی کہنے لگیں "ارے سمیں! میں اخراجات تو ٹھیک ٹھاک ہی آتے ہیں۔ لڑکے والے بھی تو اپنے مہمان لاتے ہیں۔ اب ہم ان سے یہ تھوڑی کہیں گے کہ آدھے اخراجات آپ اٹھائیں۔"

"تو بھابی! آپ نکاح ہی کر لیں۔" سمیں نے مشورہ دیا۔

"نہیں بھئی!" وہ جو منگنی کرنے سے ڈر رہی تھیں، اب نکاح کے مشورے پر بہت گھبرا گئیں۔ "بس منگنی ہی صحیح ہے۔ منگنی کے بعد ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع

مل جاتا ہے، ہم آہنگی ہو جاتی ہے۔ نکاح کر کے پھنس گئے تو برا ہوگا۔"

سیمیں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "بھائی! زمانہ کتنا بدل گیا ہے۔ پہلے تو لڑکا لڑکی کا ایک دوسرے کو دیکھنا، بات کرنا بڑا معیوب سمجھا جاتا تھا۔" وہ لندن میں رہتے ہوئے بھی پرانا زمانہ یاد کر رہی تھیں۔

"بس زمانے کے ساتھ تو چلنا ہی پڑتا ہے ورنہ لڑکی اپنے گھر بیٹھی رہے۔" شیمہ کی امی نے اٹھتے ہوئے کہا اور ابو سے بات کرنے کمرے کی طرف چل دیں۔

.....☆.....

منگنی کا دن جلد آ گیا۔ شیمہ پارلر سے تیار ہو کر آئی۔ لڑکے کی تیاری بھی دیدنی تھی۔ دونوں ساتھ بیٹھے بڑے پیارے لگ رہے تھے۔ مسٹائی، انگوٹھیوں کا لین دین، فونو سیشن سب ہی کچھ ہوا، بس نکاح ہی کی کسر رہ گئی۔

مہمانوں کے تعریفی کلمات دونوں کو بھرپور اعتماد دے گئے۔ پُر تکلف کھانے کے بعد تقریب اختتام کو پہنچی۔ دوسرے ہی دن پھولوں سے روانہ ہو گئیں۔

اگلے ہفتے لڑکے گھر والوں نے پھر پر تکلف دعوت رکھ لی جو ایک بڑے ہوٹل میں تھی۔ دونوں نئے ملبوسات اور کچھ نئی تیاریوں کے ساتھ شریک ہوئے۔ دونوں خاندان روشن خیال تھے لہذا کبھی فون پر، کبھی ہوٹل میں اور کبھی تفریحی مقام پر ملاقاتوں کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ آپس میں ہم آہنگی کے اب یہی طریقے رواج پائے۔

ابتدا کی فطری جھجک قدرے بے تکلفی میں بدل گئی۔ بلکہ شیمہ تو ابھی سے ہونے والے شوہر کی

"کلاس" لینے لگی۔ "اس دن تائی امی کے ہاں کیوں نہیں آئے؟"..... "خاک پتلون کے ساتھ سفید قمیص کیوں نہیں پہنی، اسکول یونیفارم لگ رہا ہے؟....." "اس دن کھانے پر ماموں کو اتنی لمبی کال کیوں کی؟" ساتھ فرمائشیں بھی جاری رہیں۔

مشین میں لگانے کی خاطر ایک دھاتی پرزے کی قوت برداشت جانچنے کے لیے اسے آزمائشی مدت سے گزارنا سمجھ آنے والی بات ہے۔ مگر دو جیتے جاگتے انسانوں کے نازک جذبات و احساسات ہم آہنگی کے نام پر آزمائش کی بجائی سے گزارنا کبھی کبھی سنگین کھیل ثابت ہوتا ہے۔ اس سے مرد کو تو کوئی فرق نہیں پڑتا مگر صنف نازک کے حصے میں عموماً سوائی ہی آتی ہے۔

وہ جرح جو شیمہ بلا شرکت غیرے اپنا حق سمجھ کر کرتی تھی، اس نے منگیتیر کی رائے کو بدل دیا۔ لڑکے کے ذہن میں یہ خیال جو تک کی طرح چٹ گیا کہ ایسی روک ٹوک کے ساتھ زندگی گزارنا مشکل ہو جائے گا..... چنانچہ اس نے بڑی آسانی سے منگنی توڑ دی کہ نکاح تو ہوا نہ تھا۔

لڑکے کو نیا رشتہ مل ہی جاتا، البتہ کئی دن منگنی رہنے اور اپنی سہیلیوں کو منگیتیر کے ساتھ گزرے خوشگوار لمحات کی روداد سنانے کے بعد ساری رسوائی شیمہ کے حصے میں آئی۔ یہ تو ابھی رسوائی کی محض پہلی قسط تھی۔

مسترد کیے جانے کے احساس نے اس کی روح کو بوجھل کر دیا۔ اب کسی سے کہنے سننے کی کوئی بات ہی نہ رہی تھی۔ دل چاہتا، کمر بند کیے بیٹھی رہے۔ والدین کے لیے بھی یہ ایک بڑا صدمہ تھا۔ اب کوئی نیا رشتہ دور دور تک آنے کا امکان نہ تھا۔ خاندان میں موجود تمام لڑکوں کی

مائیں نیک اور پارسا دلہنوں کی تلاش میں تھیں۔ منگیتیر سے مپ شپ کرنے والی شیمہ انھیں ایک آنکھ نہ بھاتی۔ حالانکہ یہ وہی تھیں جو منگنی کے موقع پر "ماشا اللہ! بڑی خوبصورت جوڑی ہے" کہہ رہی تھیں۔ اب انھیں اس گھر میں جمانا اور میل رکھنا بھی گوارا نہ تھا کہ کہیں شیمہ کی امی رشتے کے لیے ان ہی کی طرف اشارہ نہ کر بیٹھیں۔

یوں بھرے پرے خاندان کے ہوتے ہوئے بھی اب وہ تنہا رہ گئے۔ بس کسی طرح وقت گزر رہا تھا، انگ، جوش اور کسی زندہ دلی کے بغیر! اب والدین اس فکر میں تھے کہ ملک سے باہر کا کوئی رشتہ آجائے۔ ایسے میں ہی پھپھو کام آئیں۔ انھیں اپنی سہیلی کے توسط سے جدہ میں رہائش پذیر ایک صاحب حیثیت خاندان سے ملاقات کا موقع ملا۔ ان کا بیٹا پاکستانی سفارت خانے میں اہم عہدے پر فائز تھا۔ یہ ریمان تھا۔ چند ملاقاتوں میں بات بن گئی۔ شیمہ سے فوری نکاح طے پا گیا۔ تین ماہ کا تعداد کی تیاری میں لگے اور یوں وہ جدہ پہنچ گئی۔ نئی زندگی کی خوش رنگیوں نے چھپلی تخیلیوں کو بھلا دیا۔ والدین بھی مطمئن تھے۔ زندگی کی گاڑی ہموار رستے پر رواں دواں تھی کہ ایک خوفناک گڑھا آ گیا۔

.....☆.....

ریمان گھر پہنچا تو بے حد الجھا ہوا تھا۔ تصویر کے ہارے میں کس سے پوچھے؟ شیمہ سے، مگر وہ تو بھائی کی شادی میں پاکستان گئی ہوئی تھی۔ سوچا، راشد کل آئے گا، کل تک انتظار کرنا ہی بہتر ہے۔ مگر وقت تو جیسے ٹھہر گیا تھا۔ صبح وہ وقت سے کچھ پہلے ہی دفتر جا پہنچا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی بنوہ نکال

کر تصویر دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کے پاس بسلسلہ کام لوگ آنے لگے۔ وہ الجھن سے نجات پا کر مصروف ہو گیا۔ راشد دوپہر کو فارغ ہوا، تو ریمان کے پاس پہنچا۔ ریمان نے اپنی پریشانی ظاہر کیے بغیر خوشدلی سے اس کا استقبال کیا اور بنوہ نکال کر میز پر رکھ دیا۔

"معاف کرنا یار! میں نے مالک کا پتا لگانے کے لیے اسے کھول کر دیکھ لیا تھا۔ مگر اب پتا چلا کہ آپ اب بھی جیب میں خواتین کی تصاویر لیے گھومتے ہیں۔" ریمان نے موزا خوش گوار بناتے ہوئے کہا۔

راشد یہ سن کر ہنسا۔ بنوہ میز پر الٹ دیا اور کہا "ارے بھائی! ایک تصویر تو میری بیوی کی ہے۔ دوسری میری ساتھ منگیتیر کی۔"

ریمان کو ایک دم جھٹکا لگا مگر اپنی حالت پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔ "اب تو تم نے شادی بھی کر لی ہے۔ اسے اب تک نہیں بھولے؟"

"نہیں، نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ اصل میں وہ زندگی کا ایک اہم دور تھا میرے لیے! یار! ایک خوبصورت لڑکی کے ساتھ وقت گزارنا کسے برا لگتا ہے۔ اب یہ اور بات کہ وہ قسمت میں نہیں تھی۔"

ریمان نے سنبھل کر پوچھا "ہوا کیا تھا آخر؟" راشد نے بے پروائی سے جواب دیا "بس اس کے ساتھ ہم آہنگی نہیں ہو سکی۔"

"تمہاری بیگم تصویر جیب میں لیے پھرنے پر اعتراض نہیں کرتی؟" ریمان نے سوال کر ڈالا۔ راشد نے فوراً تردید کر دی۔ "ارے نہیں، میری بیگم تو کھلے ذہن کی مالک ہے۔ وہ تو ایسی تصویریں دیکھ کر لطف اٹھاتی ہے۔ میرے پاس تو ساہتہ منگیتیر کی اور

تاریخ اسلام

۶۹۹ھ ۱۳۰۰ء کی بات ہے جب اتا طولیہ یا سیہ ایشیائے کوچک (موجودہ ترکی) میں ترکمان سردار عثمان خان نے عالم اسلام کی سب سے بڑی سلطنت کی بنیاد ڈالی جو تاریخ میں سلطنت عثمانیہ کہلاتی ہے۔ عثمانی سلطنت کے تیسرے سلطان مراد اول نے یورپ میں فتوحات کے جھنڈے گاڑے۔ ادرنہ (ایڈریانوپل) اور لاپو پولس (بلغاریہ) کی فتح کے بعد سلطان مراد اول نے خلیفہ المسلمین کا لقب بھی اختیار کر لیا۔

تاہم عالم اسلام میں مصر کی خلافت عباسیہ کی مرکزی حیثیت مسلم رہی۔ چنانچہ سلاطین ہند محمد تغلق اور فیروز تغلق نے قاہرہ ہدایا بھیج کر عباسی خلیفہ ہی سے سند حکومت حاصل کی تھی۔ ساتویں عثمانی سلطان محمد ثانی نے قسطنطنیہ (ہیر قیصر) فتح کر کے گیارہ سو سال سے قائم بازنطینی رومی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ یوں وہ حدیث رسول ﷺ پر پورا اترنے والا مجاہد بن گیا۔ تاریخ نے اسے محمد فاتح کا لقب دیا۔



دنیا میں مسلم حکومتوں کا طوطی بولتا

ترکی جب سپر پاور تھا

عثمانی ترک خلافت کے خلاف

مغربی ممالک کی سازشوں اور

اپنوں کی غداری کا عبرت ناک قصہ

محسن فارانی



ہال جبریل سے انتخاب

غلامی کیا ہے ذوقِ حُسن و زیبائی سے محرومی جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا

بھروسا کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر کہ دنیا میں فقط مروانِ حُر کی آنکھ ہے بیٹا

وہی ہے صاحبِ امروز جس نے اپنی ہمت سے زمانے کے سمندر سے نکالا گوہرِ فردا

فرنگی شیشہ گر کے فن سے پتھر ہو گئے پانی مری اکسیر نے شیشے کو بخششِ سخی خارا

رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں اب تک مگر کیا غم کہ میری آتیش میں ہے پد بیضا

وہ چنگاریِ خس و خاشاک سے کس طرح دب جائے جسے حق نے کیا ہو نیماں کے واسطے پیدا

محبتِ خویشتنِ بینی، محبتِ خویشتنِ واری محبتِ آستانِ قیصر و کسری سے بے پروا

عجب کیا گرمہ و پرویں مرے فنجیر ہو جائیں کہ برقت اک صاحبِ دو لے بستمِ سرخو دروا

(علامہ اقبال)

بھی تصویریں ہیں۔ ”راشد نے چائے رکھتے ہوئے کہا ”اچھا اب اجازت دو۔ مجھے بیگم کے ساتھ ایک دوست کے گھر جانا ہے۔“

وہ تو چلا گیا مگر ریحان کے دماغ میں دھماکے ہونے لگے۔ اچھا تو یہ اس کی سابقہ منگیت تھی۔ کتنی خوش نظر آرہی تھی تصویر میں! پتا نہیں کہاں کہاں گھومے پھرے ہوں گے۔ نجانے بات کہاں تک پہنچی ہوگی۔ کیا کچھ نہ کہا ہو گا ایک دوسرے سے۔ نہ جانے...؟ ذہن میں انتشار تھا۔ خاکے بن اور بگڑ رہے تھے۔ اگر راشد اپنی بیوی کے ساتھ خوش ہے تو شیماء کی تصویر لیے کیوں گھومتا ہے؟ وہ تو کہتا ہے کہ میری بیوی کھلے ذہن کی ہے۔ لیکن ایسا ہونا تو بیگم راشد آپ کی مجبوری ہے، اس کے علاوہ آپ کر بھی کیا سکتی ہیں؟ مگر کھلے ذہن کا مالک ہونا میری مجبوری نہیں۔ آج وہ دفتر جلد آیا تھا اور جلد ہی اٹھ بھی گیا۔ اسے چند ضروری کام نمٹانے تھے۔

.....

شیماء کے بھائی کی شادی کو ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ وہ دن بعد شیماء کی واپسی تھی۔ ادھر ریحان کے ضروری کام بھی انجام کو پہنچ گئے۔ واپسی والے دن ہی ”رہ پند کورئیر سروں“ سے شیماء کو ایک لفافہ موصول ہوا۔ ان خاص دستاویز میں ریحان اور شیماء کے قانونی تعلق ختم ہونے کا واضح اعلان درج تھا۔

شیماء کی والدہ کا خیال تھا زمانے کا ساتھ نہ دیا تو بیٹی گھر بیٹھی رہ جائے گی۔ بیٹی تو پھر بھی واپس آگئی۔ زمانہ ایسا مجبور ہے جو اپنی پرستش کرنے والوں کو بڑا تکلیف دہ بدلہ دیتا ہے۔ پھر بھی اس کی پوجا زور و شور سے جاری ہے۔

کرائی اور ہزاروں عرب شہید کر ڈالے۔ اس برطانوی جارحیت کا سبب یہ تھا کہ عربوں نے چند انگریزوں کو شہار اسلامی کی بے حرمتی کرنے پر موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ خلیفہ عبدالعزیز جنگ کریسیا (۱۸۵۳ء) میں روس کے خلاف ترکوں کا ساتھ دینے پر برطانیہ اور فرانس کے لیے نرم گوشہ رکھتا اور انگریزوں سے الجھنے کو تیار نہ تھا۔

خلیفہ نے یورپی طاقتوں کے ایما پر ”خط ہمایوں“ کے نام سے ایک دستوری اعلان بھی نشر کیا جس میں ہر فرقے اور ہر مذہب کے پیروکاروں کو اپنے مذہبی فرائض ادا کرنے کی پوری آزادی دی گئی۔ ان دنوں روس اور فرانس بڑھ چڑھ کر خلافت عثمانیہ کی عملداری میں بسنے والے عیسائیوں کے حقوق کے محافظ بنے ہوئے تھے۔ انہیں نام نہاد حقوق دلوانے کی آزادی میں انہوں نے یونان، مونٹی نیگرو، رومانیہ اور سربیا کو آزادی دلائی۔ البتہ جنگ کریسیا کے بعد روس مملکت خلافت کے عیسائیوں کی حمایت اور سرپرستی سے دست بردار ہو گیا اور اس کی جگہ برطانیہ نے لے لی۔

ترکی کو اب یورپ کا مرد بیمار کہا جانے لگا۔ سلطنت عثمانیہ میں مغربیت کا نفوذ خلیفہ عبدالعزیز (۱۸۷۱-۱۸۷۶ء) کے عہد میں سلطنت عثمانیہ میں مغرب کا اثر تیزی سے پھیلنا جو خلافت کے بقا اور استحکام کے لیے بہت مضر ثابت ہوا۔ ترکی میں آزادی

میں نمودار ہوئی۔ جب عثمانی ترکوں کو دی آنا (آسٹریا) کے دوسرے محاصرے میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ تین سال بعد ہنگری ترکوں کے ہاتھ سے نکل گیا جو ۱۵۲۶ء سے ترکوں کے زیر تسلط تھا۔ اگلی سو دو صدیوں میں روس اور آسٹریا کی مسیحی بادشاہتیں طاقت پکڑ کر بار بار عثمانی سلطنت سے ٹکراتی رہیں۔

انیسویں صدی عیسوی میں فرانس اور برطانیہ (انگلستان) بھی سلطنت عثمانیہ کے خلاف محاذ آرائی میں شامل ہو گئے۔ ان مسیحی طاقتوں کی سازشوں اور پے در پے حملوں سے یونان، رومانیہ، مالڈووا، بلغاریہ، مونٹی نیگرو، سربیا، بوسنیا و ہرزگووینا، کروشیا و سلاوینیا، جارجیا اور کریسیا (یوکرین) عثمانیوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔ ادھر الجزائر اور تیونس پر فرانس اور مصر و سواڈان، عدن (یمن) اور عمان (مسقط) پر برطانیہ نے تسلط جما لیا۔ باریں ہمہ خلافت عثمانیہ کا پرچم البانیہ و مقدونیہ سے لے کر بغداد و بصرہ اور حدو دینین تک لہراتا تھا اور حرمین شریفین اسی کی عملداری میں تھے۔

یورپ کا مرد بیمار ۱۸۲۶ء میں سلطان محمود ثانی نے عثمانی افواج کے ہازدے شمشیر زن بینی چری فوج کو توڑ دیا۔ سلطان عبدالعزیز اول (۱۸۳۹ء-۱۸۶۱ء) کے عہد میں انگریزوں نے عدن سے اپنے جنگی جہاز بھیج کر جہدہ پر گولہ باری

بوسنیا و ہرزگووینا، کروشیا، سلاوینیا، ہنگری، رومانیہ، بلغاریہ، مالڈووا، یوکرین، آرمینیا اس کا حصہ تھے۔ غرض سولہویں اور سترھویں دو صدیاں عثمانی سلطنت و خلافت کے عروج و کمال کا زمانہ تھیں۔ ایران کی صفوی سلطنت، ہندوستان کی مغل بادشاہت اور سمرقند و بخارا اور خوارزم کی ریاستوں کے سوا پورا عالم اسلام ایک مرکز خلافت کے تحت جمع تھا۔

اسلامیوں کا وقار عروج پر

اس دوران مغرب میں فرناط (اندلس) اور مشرقی یورپ میں قازان (موجودہ تاتاریستان) اور استراخان کی مسلم تاریخی ریاستوں پر مسیحی قابض ہو گئے۔ سقوط فرناط (۱۳۹۲ء) اور روس کے ہاتھوں سقوط قازان (۱۵۵۲ء) اور سقوط استراخان (۱۵۵۵ء) کے المیوں سے قطع نظر خلافت عثمانیہ کے دم قدم سے دنیا بھر میں اسلام کا وقار اور دہد بہ قائم تھا۔ حتیٰ کہ ملکہ انگلستان الزبتھ اول نے ۱۵۸۰ء کی اسپین کے خلاف بحری جنگ میں عثمانی بحریہ کی معاونت پر خلیفہ مراد ثالث کو شکریے کے خطوط لکھے۔

دنیا بھر کے حکمران اور بادشاہ عثمانی خلیفہ کا دم بھرتے۔ قسطنطنیہ (استنبول)، اورتہ، بیلغرو، ایٹینز، بوڈاپست، حلب، اسکندریہ، سرانیو، الطایق، قاہرہ، طرابلس (لبنان)، دمشق، موصل، بغداد، بصرہ، تونس، الجزائر، فاس، فزطوم، مسقط، مہاسہ، بیت المقدس، یوزو، عدن، طرابلس (لیبیا) خلافت اسلامیہ کے قابل فخر اور پہولتے پہلے شہر تھے۔ ان کے درمیان مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے آفتاب و ماہتاب جگمگاتے۔

جب خلافت میں دراڑیں پڑیں

عثمانی خلافت میں کمزوری کی پہلی علامت ۱۶۸۳ء

خلافت عثمانی ترکوں کو منتقل ہو گئی

سولہویں صدی عیسوی کے اوائل میں پرنگالی مسیحی ہندوستان اور جزائر شرق الہند (اندونیشیا و ملایا) کی بندرگاہوں سے لے کر ہرمز (ایران)، مسقط (عمان) اور عدن (یمن) تک چھا گئے۔ ان کے بحری حملوں سے ارض حرمین تک کو خطرات لاحق تھے۔ جب کہ ممالیک مصر جن کی عملداری میں تجاز شامل تھا، کمزور پڑ چکے تھے۔ ان حالات میں نوٹس عثمانی سلطان سلیم اول (۱۵۱۲ء-۱۵۲۰ء) نے شام و مصر فتح کر کے تجاز کو بھی اپنی تحویل میں لے آفری عباسی خلیفہ متوکل علی اللہ سے منصب خلافت حاصل کر لیا۔ یوں خلافت عباسیوں سے عثمانی ترکانوں کو منتقل ہو گئی اور قاہرہ کے بجائے قسطنطنیہ دارالخلافہ قرار پایا۔

عثمانیوں کی یورپ میں فتوحات

دسویں عثمانی خلیفہ، سلیمان اعظم (۱۵۲۰ء-۱۵۶۶ء) نے یورپ میں فتوحات کا دائرہ ہنگری سے آگے آسٹریا کی حدود تک پھیلا دیا۔ اس کے جانشین سلیم ثانی نے بحیرہ روم میں قبرص کا مسلیمی مرکز فتح کر لیا۔ سلیم ثانی کے فرزند خلیفہ مراد ثالث کے عہد (۱۵۷۳ء-۱۵۹۵ء) میں اسلامی سلطنت و خلافت کو جو عروج حاصل ہوا، اس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔

جب خلافت عثمانیہ تقریباً ۲ کروڑ مربع کلومیٹر پر محیط تھی۔ مشرق میں اس کی عملداری میں ریاست آچے (اندونیشیا) مغرب میں سلطنت فاس (مراکش)، جنوب میں افریقا کے اندر ریاست بورنو (نائیجیریا) اور بگیری (چاڈ) اور ریاست مہاسہ شامل تھیں اور شمال میں یورپ کے اندر یونان، مقدونیہ، البانیہ، کوسوو، مونٹی نیگرو، سربیا،

خیالی کو فروغ ملا۔ آزاد خیال ڈراما نگار نامق کمال اس تحریک کا سرخیل تھا۔ مغربی طاقتوں کے اکسانے پر ۱۸۶۸-۶۹ء میں جزیرہ کریٹ کے یونانیوں نے بغاوت کر دی۔ یہ جزیرہ دو صدیوں سے ترکوں کے زیر تسلط تھا۔ جزیرے کے عیسائیوں نے یونان سے الحاق کا اعلان کر دیا۔ عثمانی فوج نے ایک سال کے اندر بغاوت فرو کر دی۔

۱۸۷۵ء میں بوسنیا، ہرزگووینا اور بلغاریہ میں بغاوتیں ہوئیں۔ ترکی کے نام نہاد اصلاح پسندوں کا سرخیل مدحت پاشا تھا جو ۱۰ مئی ۱۸۷۶ء کو وزیر اعظم بنا۔

۳۰ مئی کو مدحت اور اس کے ساتھیوں نے عبدالعزیز کو تخت سے اتار اس کے نتیجے کو مرادخاس کے نام سے خلیفہ بنا دیا، تاہم اگست میں خلل دماغ کی بنا پر اسے معزول کر دیا گیا۔

اب عبدالحمید ثانی (۱۸۷۶ء تا ۱۹۰۹ء) خلیفہ بنا۔ وہ چاہتا تھا کہ خلافت کے منصب اور ترکوں کا وہی وقار بحال کر دے جو اس کے اسلاف کا طرہ امتیاز تھا۔ وہ سید جمال الدین افغانی کی تحریک اتحاد عالم اسلام (پان اسلامزم) کا ہم خیال اور اسلامی حمیت کا علمبردار تھا۔ اس کی اسلامی حمیت کے باعث نام نہاد آزاد خیال اور جدیدیت پسندوں نے اس پر طرح طرح کے الزام لگائے۔ ان میں صدر اعظم مدحت پاشا پیش پیش تھا۔

خلیفہ نے فروری ۱۸۷۷ء میں مدحت پاشا کو



اصلاح پسندوں کا سرخیل مدحت پاشا

برطرف کر کے جلاوطن کر دیا۔ ۱۹ مارچ کو پہلی ترکی پارلیمان کا افتتاح ہوا۔ جب پارلیمان نے ترکی کو مغربیت کی راہ پر ڈالنے میں تیزی دکھائی تو ۱۸۷۸ء میں سلطان نے اسے معرض التوا میں ڈال کر وہ دستور معطل کر دیا جس کا مدحت پاشا نے دسمبر ۱۸۷۴ء میں اعلان کیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد سابق خلیفہ عبدالعزیز نے خودکشی کر لی یا اسے قتل کر دیا گیا۔ ۱۸۸۱ء میں مدحت اور اس کے ساتھیوں پر عبدالعزیز کے قتل کا مقدمہ چلا اور ان پر جرم ثابت ہو گیا۔ مگر برطانوی حکومت کی مداخلت نے انہیں سزائے موت سے بچا لیا۔

آخری روس۔

ترکی جنگ

۱۸۷۶ء میں سربیا اور مونٹی نیگرو کی سبھی ریاستوں نے مغربی طاقتوں کی شہ پر ترکی کے خلاف لڑائی کا بازار گرم کیا۔ ۱۸۷۷ء میں روس نے ترکی کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ غازی عثمان پاشا نے قلعہ پلونا میں زبردست مزاحمت کی، تاہم روسی فوجیں اور تھک آپہنچیں اور اس پر قابض ہو گئیں۔ ۱۸۷۸ء میں یورپی طاقتوں نے برطانیہ، فرانس اور جرمنی نے جنگ بند کر دی۔ تاہم جنگ بندی کی آڑ میں برطانیہ نے قبرص پر قبضہ کر لیا۔

اس پر فرانس نے ناراضی ظاہر کی تو جرمن چانسلر بسمارک نے یہ کہہ کر فرانس کو خاموش کر دیا کہ وہ موقع ملنے پر تیونس پر قبضہ کر سکتا ہے۔ اس حملے پر برطانیہ کو کوئی

اعتراض نہ ہوگا، چنانچہ ۱۸۸۱ء میں فرانس نے فوج کشی کر کے تیونس پر قبضہ کر لیا۔ بعد ازاں معاہدہ برلن (۱۸۷۸ء) کی رو سے بلغاریہ نے برائے نام عثمانی سیادت کے تحت آزادی حاصل کر لی اور بوسنیا و ہرزگووینا کا علاقہ آسٹریا کی تحویل میں دے دیا گیا۔ ادھر خلیفہ سامراجی منصوبے کے مطابق ۱۸۸۲ء میں برطانیہ نے مصر پر قبضہ جمایا۔

۱۸۹۷ء میں یونان نے ترکی سے جنگ

چھیڑ دی۔ غازی ادہم پاشا نے یونان پر لشکر کشی کر کے چند دن کے اندر اندر بیشتر یونانی علاقہ فتح کر لیا۔ قریب تھا کہ ترک یونانی دار الحکومت ایتھنز پر قابض ہو جاتے کہ برطانیہ اور دیگر طاقتوں نے ترکی اور یونان میں اس شرط پر صلح کرادی کہ ترک مفتوحہ علاقے چھوڑ دیں اور جزیرہ کریٹ میں ترک حاکم کے بجائے یونانی گورنر مقرر کر دیا جائے۔ یوں عالمی طاقتوں کی چودھراہٹ کے باعث الٹا یونان کو جنگ چھیڑنے کا انعام مل گیا۔

عالمی صہیونیت کی پیشکش اور

خلیفہ عبدالحمید کا انکار

۱۸۹۷ء ہی میں سوئٹزرلینڈ کے شہر بازل (Basel) میں یہودیوں کی عالمی تحریک، صہیونیت (Zionism) کا ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں



خلیفہ عبدالحمید ثانی جو تادم آخر مسلم دشمنوں کا مقابلہ کرتے رہے

"صہیونی بڑوں" (Zionist Elders) نے پروٹوکولز (دہشتے) منظور کیے۔ ان میں اہم نکتہ فلسطین میں یہودی وطن کا قیام تھا۔

چنانچہ عالمی صہیونی تنظیم (World Zionist Organisation) کا ایک وفد خلیفہ عبدالحمید ثانی سے ملا اور درخواست پیش کی کہ فلسطین میں یہودی وطن قائم کر دیا جائے، اس کے عوض وہ سلطنت عثمانیہ کے تمام قرضے ادا کر دے گی۔ خلیفہ عبدالحمید نے

اسلامی حمیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے صاف انکار کر دیا اور یہودی بڑوں کو ہار کرایا کہ وہ فلسطین کا ایک تنکا بھی یہود کو دینے کا حق نہیں رکھتا۔ اس یہودی وفد کا ایک رکن خلیفہ کی رعایا میں سے تھا، حاخام قرہ صو آخدی جس نے عثمانی خلافت کی شکست و ریخت میں اہم کردار کیا۔

صہیونی خلافت کی جڑیں

کاٹنے پر تل گئے

جب خلیفہ عبدالحمید ثانی کے دربارت صہیونی وفد ناکام لونا تو صہیونیوں نے خلافت کی جڑیں کاٹنے کے منصوبے پر عمل شروع کر دیا۔ اپنے مذہب مقصد کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلے میں نوجوان ترکوں (Young Turks) کی تحریک ان کے بہت کام آئی۔ یہ خلیفہ تحریک ۱۸۹۶ء میں قائم ہوئی تھی جس میں زیادہ

ترہ نو جوان ترک شامل تھے جو خلافت دشمن سرگرمیوں کے باعث فرانس، سوئٹزر لینڈ اور برطانیہ میں جلاوطن تھے۔ یورپی خیالات سے متاثر یہ لوگ خلافت کے خاتمے کے لیے سرگرم تھے۔ اس تحریک میں قرہ صو آئندی جیسے یہودی، مسیحی ارمینی اور مقدونی وغیرہ بھی شامل تھے۔

۱۹۰۳ء میں نو جوان ترک پارٹی کے ایک لیڈر طلعت بے نے پیرس میں خلائیہ پارٹی کا مرکز قائم کر لیا تاکہ اس کے اغراض و مقاصد کی کھلم کھلا نشر و اشاعت ہو سکے۔ نو جوان ترکوں نے عثمانی فوج میں بھی اثر و رسوخ پیدا کر لیا اور ہزاروں فوجی افسر اس تحریک کے حامی بن گئے۔ پیرس ہی میں انجمن اتحاد و ترقی کی داغ بیل ڈالی گئی۔ ۱۹۰۰ء۔ ۱۹۰۸ء دمشق سے مدینہ منورہ تک حجاز ریلوے کی تکمیل ہوئی۔ یہ ریلوے پہلی عوام کے ہندے سے بنی تھی۔ اس سے شام و فلسطین، ترکی اور یورپ کے زائرین اور حجاج کرام کو عرب آنے میں بڑی سہولت پیدا ہو گئی۔



نو جوان ترک پارٹی کا امیر رہنما
طلعت بے پاشا

خیالوں) کے حلقوں سے رابطے کا فیصلہ کیا گیا۔ اب انجمن اتحاد و ترقی نے اپنا مرکز پیرس سے سالونیکا منتقل کر لیا۔ یاد رہے مصطفیٰ پاشا (اتاترک) سالونیکا میں پیدا ہوا جو اس وقت سلطنت عثمانیہ میں شامل تھا مگر اب یونان کے زیر تسلط ہے۔

ترکی میں انقلابی تحریک کا سب سے بڑا منظم نیازی بے تھا۔ اس نے ۱۵ جولائی ۱۹۰۸ء کو مقدونیہ میں بغاوت کا علم بلند کیا۔ انور پاشا کی قیادت میں مقدونیہ کی فوج نے اس کا ساتھ دیا۔ خلیفہ نے باغیوں کی سرکوبی کے لیے عزیز بے کو مقدونیہ کا حاکم بنا کر بھیجا۔ اس نے سالونیکا میں کئی افسر گرفتار کر لیے مگر حکومت کے خلاف تحریک بہت زور پکڑ چکی تھی۔ سلطان نے اب شمس پاشا کو لشکر دے کر مقدونیہ بھیجا۔ انور پاشا نے مناسٹر (مقدونیہ) میں شمس پاشا سے ملاقات کر کے نو جوان ترکوں کے خلاف کارروائی سے باز رہنے کو کہا۔ اگلے ہی دن شمس پاشا کو قتل کر دیا گیا۔

خلیفہ عبدالحمید ثانی کی معزولی خلیفہ عبدالحمید نے اب عثمان پاشا کو باغیوں کی سرکوبی پر مامور کیا۔ مگر اس کی فوج باغیوں سے جا ملی۔ ادھر انجمن اتحاد و ترقی نے خلیفہ کو معزول کرنے کا عزم کر لیا۔ انجمن کی تحریک سے مختلف مراکز کے فوجی

یہود نواز انجمن اتحاد و ترقی دسمبر ۱۹۰۷ء میں نو جوان ترکوں اور خلافت کے مخالف دیگر انقلابی گروہوں کا پیرس میں اجلاس ہوا۔ اس اجلاس میں غیر مطمئن ترک فوجی افسروں کے گروہوں اور سالونیکا و دیگر شہروں میں فری میسنوں (آزاد

افسروں نے ایک ہی دن خلیفہ کو برقی پیغام بھیجے کہ دستوری حکومت کے قیام کا فوری اعلان کیا جائے۔ پناہ چاہنے والے خلیفہ نے ۲۳ جولائی ۱۹۰۸ء کو ۱۸۷۶ء کا دستور بحال کر دیا۔ اسی سال اکتوبر میں بلغاریہ نے مکمل آزادی کا اعلان کیا اور آسٹریا نے اپنے ساتھ بوئنیوا ہرزگیوینا کا الحاق کر لیا۔

پارلیمنٹ کا پہلا اجلاس ۱۷ دسمبر ۱۹۰۸ء کو منعقد ہوا۔ اس میں نو جوان ترکوں کی بھاری اکثریت تھی۔ انہوں نے فروری ۱۹۰۹ء میں اعتدال پسند صدر اعظم (وزیر اعظم) کاہل پاشا کو استعفادینے پر مجبور کیا اور اپنے ایک بھروسہ مند حلی پاشا کو صدر اعظم بنا لیا۔ ۱۳ اپریل کو قسطنطنیہ میں مقیم پہلی فوج نے جو زیادہ تر اہل انیسویں پر مشتمل تھی، بغاوت کر دی۔

اس موقع پر خلافت کے حامیوں اور اسلامی گروہوں کی مخالفت کے باعث حلی پاشا نے استعفا دے دیا۔ ۲۳ اپریل کو انجمن کا لیڈر محمود شوکت پاشا نیازی، حقیقی اور انور پاشا جیسے فوجی افسروں کے ساتھ "عسکر آزادی" لیے قسطنطنیہ پہنچا جس کی تعداد ۲۵ ہزار تھی۔ پانچ گھنٹے کی جنگ کے بعد وہ شہر پر قابض ہو گیا۔ خلیفہ عبدالحمید کے بہت سے حامی مارے گئے۔ ۲۶ اپریل ۱۹۰۹ء کو پارلیمنٹ کی منظوری سے خلیفہ معزولی کا اعلان کر دیا گیا۔

ستم ظریفی یہ کہ انور پاشا کی قیادت میں جو وفد خلیفہ کے پاس معزولی کا پروانہ لے کر گیا، اس میں یہودی حاخام قرہ صو آئندی بھی شامل تھا۔ خلیفہ عبدالحمید کو سالونیکا بھیج دیا گیا جہاں فروری ۱۹۱۸ء میں اس نے وفات پائی۔ (اس تاریخی داستان کی آخری قسط اگلے شمارے میں ملاحظہ فرمائیے۔)

لالہ صحرا

یہ گلاب بینائی، یہ عالم تنہائی
مجھ کو تو ڈراتی ہے اس دشت کی پہنائی
بھنکا ہوا راہی میں بھنکا ہوا راہی تو
منزل ہے کہاں تیری اے لالہ صحرائی!
خالی ہے کلیسوں سے یہ کوہ و کمر ورنہ
تو شعلہ سینائی، میں شعلہ سینائی!
تو شاخ سے کیوں بھونتا میں شاخ سے کیوں ٹوٹا
ایک جذبہ پیدائی، اک لذت یکتائی!
لغواص محبت کا اللہ نگہبیاں ہو
ہر قطرہ دریا میں دریا کی ہے گہرائی
اس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ
دریا سے اٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی
ہے گرمی آدم سے ہنگامہ عالم گرم
سورج بھی تماشائی، تارے بھی تماشائی
اے ہاؤ بیابانی! مجھ کو بھی عنایت ہو
خاموشی و دل سوزی، سرمستی و رعنائی!
(علامہ اقبال)

ارسطو نے کہا "آپ فکر نہ کیجئے سب انتظام ہو جائے گا۔ آپ بس تشریف لائیے۔"

چنانچہ جب مقررہ وقت پر بادشاہ سلامت لاؤشکر سمیت پہنچے تو دیکھ کر حیران رہ گئے کہ جنگل میں منگل کا سماں تھا۔ وہاں خوبصورت شامیانے لگے تھے۔ قیمتی قالین، چھولداریاں اور حسین خادمائیں! خدام اور خادماؤں نے ایسی نفیس پوشاکیں زیب تن کر رکھی تھیں کہ ان کی مثال ملنی مشکل تھی۔ بادشاہ بڑا حیران ہوا کہ ایسی شاندار چیزیں تو اس کے دربار میں بھی میسر نہیں تھیں۔

تھوڑی دیر بعد کھانا پیش کیا گیا۔ کھانا جن برتنوں میں تھا وہ سونے چاندی کے تھے اور کھانا اتنا پُر ذائقہ کہ سب نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ کھانے کے بعد محفل موسیقی کا پروگرام شروع ہوا۔ وہ بھی اتنی درجے کا تھا۔

اس کے بعد ایک مشروب پیش کیا گیا۔ اُسے پیتے ہی سب کو شمار آ گیا اور وہ مدہوش ہو گئے۔ جب کافی دیر بعد ہوش آیا تو بادشاہ اور درباریوں نے دیکھا کہ وہاں نہ شامیانے ہیں نہ چھولداریاں اور نہ ہی وہ قالین۔ سب کے سب زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ ارسطو سے پوچھا گیا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟

ارسطو نے کہا "بادشاہ سلامت! یہ میرے علم کا ایک ادنیٰ سا مظاہرہ اور نظر کا دھوکا تھا۔ میں نے آپ سب کو ہینائزم کر دیا تھا اور ساری چیزیں آپ کو مصنوعی طور پر دکھائیں۔ البتہ کھانے کا انتظام ضرور کر رکھا تھا۔"

☆☆☆

اب کچھ ذاتی تجربات کے سہارے واقعات پیش ہیں جنہوں نے بارہ سال قبل مجھے ششدر کر دیا تھا۔ انہیں پڑھ کر قارئین بھی حیران رہ جائیں گے۔ میں بسلسلہ ملازمت جیسے سال ایبٹ آباد مقیم رہا

ہینائزم یا نیلی میتھی کیا ہے؟ اس کی وضاحت یوں سمجھیے کہ کسی مادی واسطے کے بغیر ایک دماغ کا دوسرے سے رابطہ نیلی میتھی کہلاتا ہے۔ گویا روحانی دنیا کا یہ بے تار (کارڈلیس) رابطہ ہوا۔ اس کیفیت میں دونوں دماغ بالکل وائریس انٹیشن کے مانند کام کرتے ہیں۔ یعنی انسانی دماغ سے غیر مرئی لہریں خارج ہوتی ہیں جن کے ذریعے انسان ایک دوسرے سے تعلق قائم کر لیتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ یہ لہریں طاقتور ہونی چاہئیں۔ ان غیر مرئی لہروں کے حامل انسانوں کی قوت ارادی بہت مضبوط ہوتی ہے۔ نیز رابطہ قائم کرنے کا طریقہ بھی آنا چاہیے۔ کہا جاتا ہے کہ مشہور مفکر اور فلاسفر ارسطو جہاں بہت سے علوم کا موجد ہے وہیں اس نے "ہینائزم" کو بھی ایجاد کیا۔

اس سلسلے میں ایک حکایت کا اکثر تذکرہ ہوتا ہے۔ ایک روز ارسطو اپنے شاگردوں کے درمیان جنگل میں بیٹھا درس و تدریس میں مصروف تھا۔ اتفاق سے بادشاہ وقت کا ادھر سے گزر ہوا۔ ارسطو کے علم و فن کے بہت چرچے تھے۔ بادشاہ نے سوچا کہ اس سے ملاقات کی جائے۔ چنانچہ وہ خود اس کے پاس گیا اور کہا "سنا ہے آپ کئی علوم کے موجد ہیں۔ کئی دن دربار میں تشریف لائیے اور ہمیں اپنے فن سے روشناس کرائیے۔"

ارسطو نے کہا "بادشاہ سلامت! آپ اگلے ہفتے یہاں تشریف لے آئیے۔ دوپہر کا کھانا میرے ساتھ تبادل فرمائیے۔"

بادشاہ نے کہا "جب ہم کہیں جائیں تو ہمارا لاؤشکر بھی ساتھ ہوتا ہے۔ اتنے زیادہ لوگوں کے کھانے کا انتظام تم کس طرح کرو گے؟"

دلچسپ و عجیب



دوسروں کو اپنے سحر میں گرفتار کرنے والا

ہینائزم کا ماہر بابا

نیلی میتھی کے راز جاننے والے
دو ماہرین کا حیرت انگیز ماجرا.....
روحانیت کی دنیا سے توشہ خاص

حبیب اشرف صہجی

مشہور قول ہے کہ مال و دولت قارون ایک جبکہ "علم" انبیا کی میراث ہے۔ دنیا میں ہزار ہا قسم کے علوم رائج ہیں اور ہر علم کی مزید ذیلی شاخیں ہیں۔ گویا ہر علم کا ایک بے کنار سمندر ہے جو ازل سے رواں دواں ہے اور ابد تک رہے گا۔ علوم خواہ سائنسی ہوں یا روحانی، انہی میں علم ہینائزم یا نیلی میتھی بھی شامل ہے۔ اُسے ماہرین نے اپنی کدوکاوش سے اس مقام پر پہنچا دیا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔



ہوں۔ وہاں سے آنے کے پانچ سال بعد میں اپنے دوستوں سے ملنے ایبٹ آباد گیا۔ جن افسروں میں نے چارج دیا تھا دو تین دفعہ ان کے پاس دفتر گیا لیکن ملاقات نہ ہو سکی۔ لاہور آنے سے قبل اتوار کو ان کے گھر فون کیا تو بات ہو گئی۔ کہنے لگے ”مجھے آپ کے آنے کی خبر مل گئی تھی۔ جب آپ مجھ سے ملنے دفتر آئے تو اتفاق سے میں بسلسلہ سرکاری کام باہر گیا ہوا تھا۔ اب آپ میرے گھر فوراً آ جائیں۔ میں آپ کو ایک بزرگ سے ملانا چاہتا ہوں۔ آپ مل کر خوش ہوں گے۔“

میں جلد ان کے گھر پہنچ گیا۔ ایک باریش شخصیت سے ملاقات ہوئی۔ ان کا نام دوست نے بابا سلیمان بتایا۔ بابا جی نے ہمارے محلے کے چار پانچ بڑے بڑے افسروں کے نام لیے اور بتایا ”وہ میرے مرید ہیں اور میری بڑی عزت کرتے ہیں۔ ہو سکے تو انھیں سلام کہہ دینا۔“ اس کے بعد انھوں نے ایک اور افسر کا ذکر کیا جو مجھ سے پہلے ایبٹ آباد میں تعینات تھے۔

میں بابا سلیمان سے بہت متاثر ہوا۔ ان سے کہا کہ آپ اپنے روحانی مشاہدات سے ہمیں بھی لیسز یاب کیجیے۔ کہنے لگے ”بسم اللہ۔“ انھوں نے پھر ایک سادہ کاغذ منگوایا۔ اس کی لمبی لمبی جیسے سات کتریں بنائیں جو کافی چوڑی تھیں۔ پھر ان پر کچھ لکھنے لگے۔ اس کے بعد کتروں کی جہیں بنا دیں۔ پھر میری طرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھو۔ میں ان کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ اس کے بعد انھوں نے کہا ”ایک نمبر والی کترن اٹھاؤ۔ اس کے اوپر محض بول کے ایک سے چار تک گنتی لکھو۔“

میں نے بول کر گنتی لکھ دی تو کہا ”اس میں سے کسی ایک نمبر کو کاٹ دو۔“ میں نے چار نمبر کاٹ دیا۔

پھر کہا کہ اس کے نمبر پر کسی پھول کا نام لکھ دو۔ میں نے بول کر ”اس پر گلاب کا پھول لکھ دیا۔ کہا ”اب کاغذ کی تمہیں کھولو۔“ جب کاغذ کھولا تو اس پر چار نمبر کا ہوا اور گلاب کا پھول لکھا تھا۔

یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ اس کے بعد کہا ”اب دل ہی دل میں دوسری کترن پر کوئی چار اعداد لکھو اور انھیں جمع کرو۔“ میں نے چار اعداد لکھ کر ان کا حاصل جمع کر لیا۔ بابا جی نے کہا کہ اب کاغذ کو کھولو۔ جب کاغذ کھولا تو اس پر وہی چار اعداد لکھے تھے اور اس کا حاصل جمع بھی وہی تھا جو میں نے سوچا تھا۔ انھوں نے بقیہ کترنوں پر بھی مختلف تصوراتی باتیں لکھوائیں۔ جب کترن کھلتی تو اس پر میری پہلے سے سوچی گئی بات تحریر ہوتی۔ یہ ”کرامت“ دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ملازم چائے وغیرہ لے کر آیا۔ میں نے ملازم سے کہا ”چائے میں چینی نہیں ڈالنا۔ مجھے منع ہے اور نہ میں کوئی میٹھی چیز کھاؤں گا۔“ بابا جی کہنے لگے: آج آپ چائے میں چینی پیئیں گے اور مشائی بھی کھائیں گے۔ نزدیک ہی پھولوں کا گلہ دستہ رکھا تھا۔ انھوں نے اس میں سے گلاب کی چھوٹی سی پٹھوڑی توڑی اس پر کچھ لکھا اور مجھے کہا کہ اسے اچھی طرح دانتوں کے نیچے دباؤ اور پھر تھوک دو۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ پھر کہنے لگے کہ اب مشائی کھاؤ اور چائے میں چینی کے تین چمچ ڈالو۔ جب میں نے چائے پی تو وہ بالکل پھینکی گئی۔ حتیٰ کہ مشائی بھی پھینکی محسوس ہوئی۔

اس کے بعد وہ میرے نئے دفتر کے متعلق بتانے لگے کہ وہاں تمہارے مخالفین پیدا ہو چکے اور تمہاری ترقی میں بھی رکاوٹ آ رہی ہے۔ میں نے کہا، بابا جی اس مسئلے کا حل بھی آپ نے نکالنا ہے۔ کہنے لگے ”تم

پر بندیشیں ہیں ان کا توڑ میں کروں گا۔ اس کے لیے مجھے وظیفہ پڑھنا پڑے گا۔ تمہیں ایک تعویذ بھی دوں گا۔ یہ تعویذ بڑا کر شافی ہے۔ اسے بہن کر تم اپنے اندر تہذیبی محسوس کرو گے۔ تمہارے سب کاموں میں آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔“

میں نے کہا ”بابا جی میں آپ کا شکر گزار ہوں گا۔ آپ مجھے وہ تعویذ دے دیجیے۔“

کہنے لگے ”اس تعویذ کا ہر دو ہزار روپے ہے۔ آپ رقم دیجیے، میں ابھی کو تعویذ دیتا ہوں۔“

میں نے کہا ”بابا جی میں چند گھنٹے بعد لاہور جا رہا ہوں۔ ابھی میرے پاس اتنے پیسے نہیں۔“ وہ کہنے لگے، لاہور جا کر فوراً بھیج دینا۔ میں نے آج سے تمہارے لیے پڑھائی شروع کر دی ہے۔ تمہیں جلد تہذیبی محسوس ہوگی۔

میں ان سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ چنانچہ بڑے ادب و احترام سے رخصت ہوا۔ میں ایبٹ آباد اپنے ایک عزیز کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ جب شام کو وہ آئے تو بابا سلیمان سے ملاقات کا ذکر کیا اور ان کی روحانیت کے قصے سنائے۔ انھوں نے فوراً پہلا سوال یہ کیا ”پیسے تو نہیں دیے؟“

میں نے حیرانی سے کہا ”نہیں۔“

انھوں نے کہا ”اللہ کا شکر ادا کرو کہ فراڈ سے بچ گئے۔“

میں حیرانی سے بولا ”آپ ایسی نیک شخصیت کو فراڈ یا کہہ رہے ہیں؟“

کہنے لگے کہ یہ حقیقت ہے۔ انھوں نے پھر بتایا ”چند سال قبل یہی شخص میری دکان میں آیا۔ اس زمانے میں مجھے کئی گھریلو اور کاروباری پریشانیاں لاحق تھیں اور میں ذہنی طور پر بہت پریشان تھا۔ اتفاقاً ان

بابا جی سے ملاقات ہو گئی۔ ان کی باتوں سے میں بھی بہت متاثر ہوا۔ انھوں نے بتایا کہ آپ کے کاروبار کو کسی نے ”ہاندھ“ دیا ہے اور کئی ”شعبدے“ بھی دکھائے۔ میں بھی آپ کی طرح بہت متاثر ہوا اور ان کی خوب خاطر مدارات بھی کی۔

”میرا ایک ملازم کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دکان میں چلا آیا۔ وہ بابا جی کو اچھی طرح جانتا اور ان کے کرتوتوں سے واقف تھا۔ اس نے اشارے سے مجھے بلایا اور کہا کہ بابا جی کی باتوں میں مت آئیے اور نہ انھیں کوئی رقم وغیرہ دیں بلکہ ان سے کہیں کہ اپنی ”شعبدے بازی“ اس پہ بھی آزمائیں۔ چنانچہ کچھ وقفے کے بعد میں نے بابا جی سے کہا کہ یہ ہمارا ملازم ہے اور روحانی چیزوں کو نہیں مانتا۔ آپ اپنا علم اس پر بھی آزمائیں۔“

بابا جی نے اسے اپنے سامنے بٹھایا اور کہا کہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھو۔ ملازم اس کے برعکس آنکھیں جھپکنے لگا۔

بابا جی نے کہا ”یہ کیا کر رہے ہو؟“ ملازم نے کہا کہ یہ اس کی عادت ہے۔ تب بابا جی نے کہا کہ اس پر میرا ”عمل“ نہیں چل سکتا اور چپ چاپ دکان سے چلے گئے۔

بعد میں میرے ملازم نے بتایا کہ اس کی ”شعبدے بازی“ ختم کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ آنکھیں جھپکتے رہیں۔ یوں میں ملازم کی مہربانی سے اس کے فراڈ سے بچ گیا۔ اپنے عزیز کی باتیں سن کر مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ بابا جی کا ملازم کا ماہر تھا۔ اسی کے سہارے وہ دوسروں کو الو بنا دیتا۔“

لیکن بعض لوگ پناہ نام کی مدد سے اپنے کام کراتے

جیتی جاگتی زندگی

کھانا پینا اور اپنی زبان تک فراموش کرتی جا رہی ہے۔

☆ ☆ ☆
ایک بار شکر قندی کھانے کو بڑا جی چاہا۔ پیٹھے بٹھائے یہ نعمت کھانے کو طبیعت مچلنے لگی۔ قرب و جوار کی دکانوں پر گیا مگر کسی کے پاس شکر قندی نہیں تھی۔ آخر ایک دکاندار کہنے لگا "باؤ جی! آپ دہلی دروازے سے چلے جاؤ وہاں سے ملے گی۔"

گھر لوٹا تو بیگم نے خالی ہاتھ دیکھ کر استفسار کیا۔ میں نے

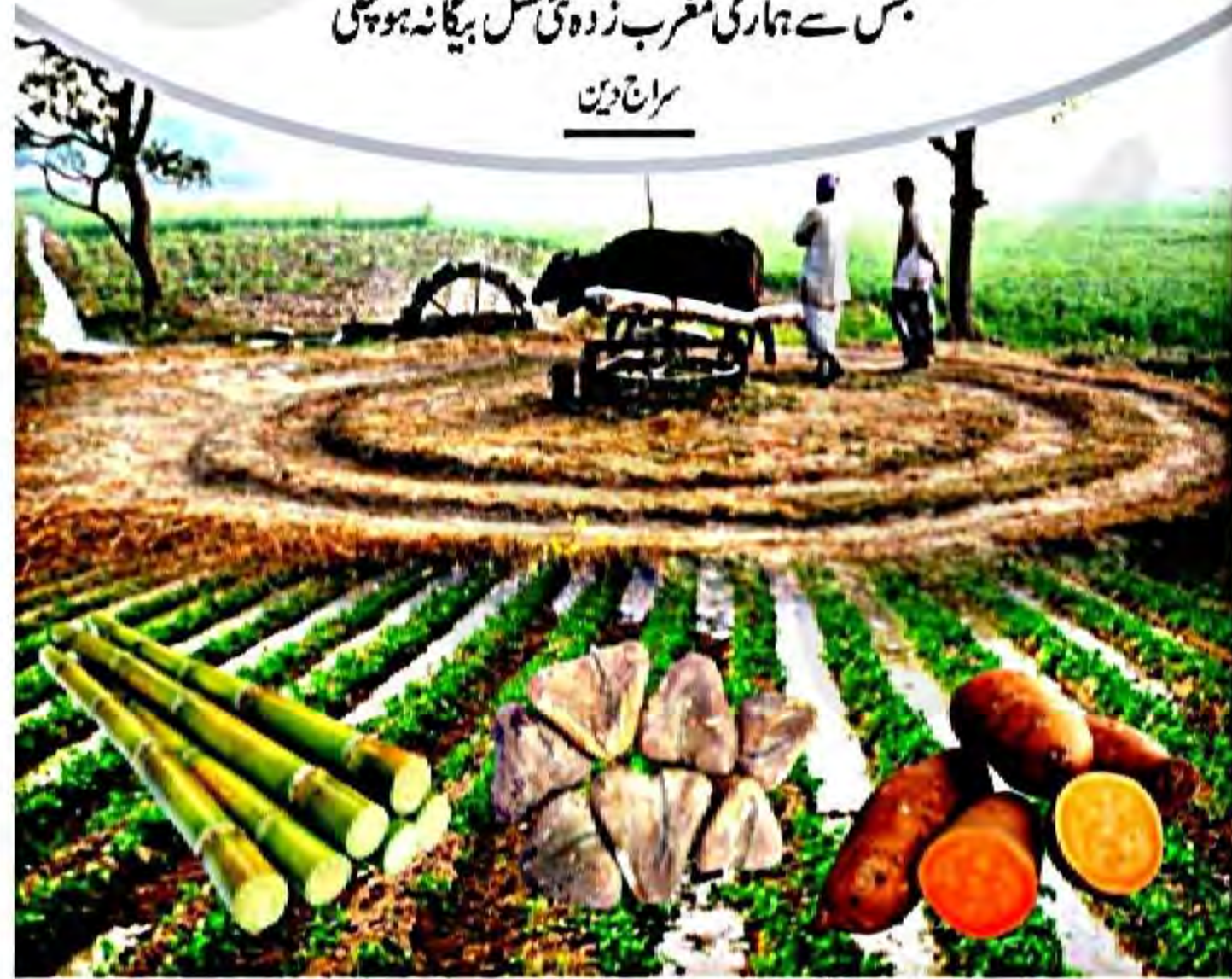
انگلستان جاؤ یا امریکستان مگر

حال ہماری نوجوان نسل کا ہے جو اپنی ثقافت، بود و باش بول چال

اپنی پہچان کبھی نہ بھولو

پاک مٹی سے جڑے اس روایتی رہن سہن کا دلچسپ تذکرہ جس سے ہماری مغرب زدہ نئی نسل بیگانہ ہو چکی

سراج دین



کر آؤ گے۔" زاہد کی یہ ایسی پریشانی تھی کہ وہ کسی کو اپنا شریک بھی نہیں بنا سکتا تھا۔ تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔

جائے حاجت سے نکلنے ہی اس نے فوراً ڈیمانڈ نوٹس تیار کروایا اور باباجی کے گھر پہنچ گیا۔ وہ گھر میں نہیں تھے۔ زاہد بے چینی سے باہر نکلنے اور ان کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد باباجی آتے دکھائی دیے۔ انھیں دیکھتے ہی زاہد نے ان کی جانب دوڑ لگا دی اور باباجی کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر معافی مانگنے لگا۔ باباجی نے اُسے پہچاننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں تمہیں نہیں جانتا لہذا کس بات کی معافی دوں؟

جب باباجی نے زاہد کو اچھی طرح خوار کر لیا تو پھر معافی دی اور کہا "ہر آدمی کو ایک جیسا نہ سمجھا کرو۔ آئندہ لوگوں سے پیار اور محبت سے پیش آنا۔ ورنہ ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰ پیدا ہوتا ہے۔" باباجی نے زاہد کو اس شرط پر معاف کیا کہ آئندہ اُس کی کوئی شکایت نہیں آنی چاہیے۔

یہ واقعہ عیاں کرتا ہے کہ زاہد جسمانی طور پر بالکل تندرست تھا لیکن باباجی نے اُسے پینانا ناز کر کے دماغی طور پر مفلوج کر دیا۔ زاہد سے میری بڑی دوستی تھی۔ اس واقعے کے بعد وہ بزرگوں کی تعظیم کرنے لگا۔ جب اُسے کسی بزرگ کا پتا چلتا تو وہ فوراً اُس کے پاس حاضر ہوتا۔ میرے ساتھ بھی کئی دفعہ بیروں کے پاس گیا جن کے واقعات کسی دوسری نشست میں سناؤں گا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ بیرونی ممالک میں پینانزم سے مریضوں کا علاج ہوتا ہے اور کئی دوسرے مثبت اقدام بھی کیے جاتے ہیں۔ گویا وہاں بنیادی طور پر پینانزم فراڈ 'دھوکے اور کمائی کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک طرح کا فلاحی کام ہے۔

ہیں اور اپنے علم کا چرچا نہیں کرتے۔ اسی ضمن میں ایک واقعہ پیش ہے۔

میرا ساتھی زاہد میرے محکمے میں سینئر آفیسر تھا۔ بڑی سخت طبیعت کا آدمی تھا اور ضرورت سے زیادہ اصول پسند۔ اُس کا کام ڈیمانڈ نوٹس جاری کرنا تھا۔ ایک روز ایک بزرگ اُس کے پاس آئے اور کہا "میں دو دفعہ پہلے بھی اپنے ڈیمانڈ نوٹس کے سلسلے میں آپکا۔ آپ نے کہا تھا کہ گھر پہنچ جائے گا لیکن ابھی تک نہیں پہنچا۔ آج میں برصورت لے کر جاؤں گا۔"

زاہد نے کچھ دفتری مسائل بتائے اور کہا کہ اگلے ہفتے تک آپ کا کام ہو جائے گا۔ باباجی بولنے میں آج برصورت ڈیمانڈ نوٹس لے کر جاؤں گا ورنہ تم خود میرے گھر لے کر آؤ گے اور ڈیمانڈ نوٹس کی فیس بھی تم خود جمع کر آؤ گے۔

اس پر زاہد نے غصے میں کہا "تمہارے جیسے روزانہ کئی آتے اور دھمکیاں دے کر چلے جاتے ہیں۔ میں کسی سے نہیں ڈرتا۔"

باباجی نے زاہد کو کہا "میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالو اور مجھے اچھی طرح پہچان لو تا کہ تمہیں پہچاننے میں دقت نہ ہو۔ یہ میرا پتا بھی سمجھ لو۔ کچھ دیر بعد تم خود میرے آستانے پر آؤ گے۔"

زاہد نے کہا "میں نے تمہیں اچھی طرح دیکھ لیا اور پہچان بھی لیا۔ جو کرتا ہے کر لینا۔"

اس کے بعد باباجی چلے گئے۔ کچھ دیر بعد زاہد کو پیشاب کی حاجت محسوس ہوئی۔ وہ جب جائے حاجت گیا تو یہ دیکھ کر اسے بڑی تشویش ہوئی کہ اُس کا آلہ بول ہی غائب تھا۔ اُسے بھی باباجی کے الفاظ یاد آئے "تم خود میرے آستانے پر آؤ گے اور ڈیمانڈ نوٹس لے

کامیاب نہیں ہوا۔ موصوف اس قسم کی خاصی معلومات رکھتے ہیں۔ انھوں نے دریائے راوی سے ملحق کسی گاؤں کا نام بتایا اور ڈیرے دار سے ملنے کو کہا۔ تھوڑی دیر میں ہم ڈیرے پر موجود تھے۔ شہزاد کے توسط سے ہماری خوب آؤ بھگت ہوئی۔ وہاں پنجھی دیو بیگل چارپائی (جسے مقامی زبان میں ”ہاچہ“ کہا جاتا ہے) پر ہمیں بٹھایا گیا۔ بچوں کے لیے یہ انوکھی چیز تھی۔ وہ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے ”اس پر تو کوئی جن جن ہی

بوکوں کا ہار دھڑا دھڑکنوئیں سے پانی نکال فولادی چادر سے بنے کھال میں اندھیلتا۔ وہاں سے پانی کی موٹی دھار کھیت کو سیراب کر رہی تھی۔ بس جی دونوں کے سوال شروع ہو گئے: کنواں کیا ہوتا ہے اس میں پانی کہاں سے آتا ہے؟ یہ کتنا گہرا ہوتا ہے اس میں مچھلیاں بھی ہوتی ہیں؟ ہم نے بھی کنواں دیکھا ہے۔ میں نے جواب دینے کے بجائے انھیں کنواں دکھانے کا فیصلہ کیا اور دونوں کو ساتھ لیے گاڑی پر نکل پڑا۔ اتوار تھا اسی لیے یہ کشت اٹھانے کا حوصلہ مل گیا۔ دونوں بڑے خوش تھے جیسے کوئی بڑی ہی نایاب چیز دیکھنے جا رہے ہیں۔ پورا لاہور چھان مارا مگر کنواں کہیں نظر نہ آیا۔ ایک وہ بھی دور تھا جب ہر دوسرے تیسرے گھر کنواں ہوتا جسے عام طور پر ”کھوئی“ کہتے۔ مسجدوں میں بھی کنوئیں ہوا کرتے تھے جن کا ٹھنڈا میٹھا پانی وضو اور غسل کے کام آتا۔ بعض



موت کا پھل بیٹھا ہوتا ہے

سوتا ہو گا۔“ سرسبز و شاداب درختوں کے جھنڈوں سے مزین ڈیرا دیکھ کر بچے بھی کھل اُٹھے۔ ایک جانب درخت کی چھاؤں تلے تندرست و توانا بھوری بھینس اپنے بچھڑے کے ساتھ بیٹھی جگالی کر رہی تھی۔ دو بکرے بھی قریب ہی بندھے تھے جبکہ سات آٹھ دیسی مرغیاں بڑے ہی خوبصورت مرغ کے ساتھ پھر رہی تھیں۔ ڈیرے کے ساتھ ہی ہری بھری

فصلیں لہلہا رہی تھیں جنھیں سیراب کرنے کو ٹنڈاں والا کھوہ موجود تھا۔ بچے کنوئیں کی جانب پکٹنے لگے تو میں نے رعب دار آواز میں انھیں روکا ”مبادا اٹھیلیاں کرتے اس میں نہ جا پڑیں۔ میں خود بچوں کے ساتھ گیا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر کنوئیں میں جھانکنے کو کہا۔ دونوں گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے۔ پھر انھیں بوکوں کے ہار دکھا کر بتایا کہ ان کی مدد سے کنوئیں کی تہ سے پانی نکالا جاتا ہے۔ وہ بڑی

کنوئوں کا پانی کھارا ہوتا تھا جو صرف نہانے کپڑے دھونے اور گائے بھینسوں کی پیاس بجھانے کے کام آتا۔ ہم اکثر ثواب کی نیت سے کنوئیں سے سیکڑوں بوکے نکال کر مسجد کی نیکی بھرا کرتے تاکہ نمازیوں کو وضو کے دوران پانی کی قلت نہ ہو۔ یوں کہہ لیں تب کنوئیں زندگی کی علامت تھے۔ میں نے اپنے دوست شہزاد بٹ کو فون کیا اور بتایا کہ بچوں کو ٹنڈاں والا کھوہ دکھانے نکلا تھا مگر تاحال

قدیر کی بے پروائی اور حکومت کی عدم توجہ کے باعث اس کے مضبوط دروازے سال خورودہ اور بے یار و مددگار محسوس ہوتے ہیں۔ خواجہ فروشوں اور پھیری والوں نے بھی مغلیہ دور کی اس دیو بیگل یا دگار کا حسن گہنا رکھا ہے۔ موٹر سائیکل پر ہم چند منٹوں میں وہاں پہنچ گئے۔ ۲۴۰ روپے کے عوض دونوں نعمتیں دو دو کلو کے حجم میں مل گئیں۔ بیگم نے دو کلو بھنے بھی تلوا لیے کہ بچوں کو کھلاؤں گی۔ گھر کی جانب رخ کیا تو محترمہ نے خریداری کا ذکر چھیڑ دیا۔ میں وقت گزارنے کے لیے دہلی دروازے کی طرز تعمیر کا بغور معائنہ کرنے لگا اور بیگم اپنی خریداری میں مصروف ہو گئی۔

بچوں کے پیچیدہ سوالات

شکر قدی سنگھازے کما (من) جیسی نعمتوں سے آج کی نسل قلعی نا آشنا ہے۔ جب کبھی بھولے سے انھیں یہ نظر آ جائیں تو ان کی حیرت دیدنی ہوتی ہے اور وہ ان کے متعلق سوالات بھی عجیب و غریب کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کیا چیز ہے؟ اسے کیا کہتے ہیں؟ یہ کھاتے بھی ہیں ایسے ہی پا پکا کر۔ بعض بچے تو سنگھاڑا ہاتھ میں پکڑتے ہی پھینک دیتے اور غریب انداز میں کہتے ہیں کہ میں تو یہ کبھی نہ کھاؤں.....

میرے بچپنے، عبدالعاشر اور عبدالاحد جزواں بھائی اور بلا کے ذہین ہیں۔ ایسے پیچیدہ سوال کرتے ہیں کہ ان کے جواب دینا مشکل ہو جاتا ہے۔ بروز اتوار ٹی وی کے ایک پروگرام میں پر کسی گاؤں کی سیر کرائی گئی۔ اچانک اسکرین پر ٹنڈاں والا کھوہ (کنواں) دکھایا گیا۔ بڑا ہی خوبصورت منظر تھا۔ ایک بیل جس کی آنکھوں پر نوپے چڑھے ہوئے تھے چرخ کے ساتھ بندھا گرد و پیش سے بے نیاز مسلسل کنوئیں کے گرد گھوم رہا تھا۔

مدعا بیان کیا تو محترمہ نے جھٹ برقع پہنا اور کہنے لگیں ”میں نے بھی وہاں سے خریداری کرتی ہے۔“ یوں تو اتوار کا بڑی شدت سے انتظار ہوتا ہے کہ ہفتہ بھر کی تنگ آتاریں گے مگر یہ دیوانے کا خواب ہی ہے۔ بچے سیر پانے کی فرمائش کرتے ہیں اور بیگم کے کاموں کی تفصیل نہ ہی پوچھیں تو اچھا ہے۔ مثلاً واشنگ مشین ٹھیک کروادیں رک رک کر چلتی ہے..... پانی کا پائپ ٹپکتا ہے جس کے باعث صحن میں کچھڑ ہو جاتا ہے..... ہاورچی خانے کی چھت بھی ٹپکتی ہے..... بچوں کے جوتے مرمت کے لیے موچی کو دینے ہیں۔

غرض ایسے بے شمار کام میرا منہ چزارہے ہوتے۔ ان ذخیرہ سارے کاموں میں سے ایک آدھ کھل سا کام انجام دے کر میں بقیہ آئندہ کے لیے ڈال دیتا تو بیگم رو ہانسی صورت بنا کر کہتی ”یہ کام آپ ہی کو کرنے ہیں آپ کو نہ کہوں تو کس سے کہوں؟“ بیگم کی بات دل کو لگتی مگر میں خود کو جسمانی طور پر ایسی مشقتوں کا تحمل نہ پاتا۔ یوں کہہ لیں کہ عمر کے اس حصے میں ہوں جب انسان آرام اور سکون تلاش کرتا ہے..... مگر میرے لیے یہ انہونی بات بن چکی۔

بیگم نے تھیلے میں بنوہ ڈال اسے لپیٹ کر ہاتھ میں تمام لیا۔ دہلی دروازہ ہمارے گھر سے دو تین فرلانگ کی مسافت پر ہے۔ مغلیہ دور کی یہ یادگار قدیم لاہور کے بارہ دروازوں میں سے ایک ہے۔ یہ عظیم الشان دروازہ آج بھی اپنی باقیات کے ساتھ اسی طمطراق سے استادہ ہے۔ خدو خال دیکھ کر ہی زمانہ ماضی میں اس کی شان و شوکت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ دروازے کا رخ دہلی شہر کی جانب ہے اسی نسبت سے یہ دہلی دروازہ کے نام سے موسوم ہوا۔ محکمہ آثار

جاتی۔ ہوا بھوسی ازا دیتی اور دانے زمین پر گر جاتے۔ یہ عمل پورے کھیت میں کسانوں کو نچائے رکھتا۔ جیسے ہی ہوا رخ بدلتی، چارہ دہقان بھی تنگھی (بیلچہ نما) اٹھائے اُدھر کا رخ کرتا۔

پیاس بھمانے کے لیے برف اور فریج کا تصویری موجود نہ تھا۔ پانی سے بھرا مٹی کا گھڑا گھاس پھوس سے ڈھانپ کر ایک جگہ رکھ دیا جاتا۔ جب کسی کو پیاس لگتی وہ گھاس ہٹا کر گھڑے پہ رکھے مٹی کے پیالے میں پانی پی لیتا۔ یہی پیالہ گھڑا ڈھانکنے کے بھی کام آتا۔ کھانے کے وقت وہی کھی سے چھڑی روٹیاں آج

آم کے اچار کی پھانک اور چائی کی لسی کا جگ گھر کا کوئی فرد لیے کھیت پہنچ جاتا۔ بعض کسان اپنا کھانا ساتھ ہی لائے ہوتے۔ سب مل بیٹھ کر کھاتے تو پیار و محبت اور بھائی چارے کی عجب عکاسی ہوتی۔



محنتی کسان بخیر لگاتے ہوئے

ان دنوں ولایتی کھی، کوکگ آئل چائے برائمر مرغی کا گوشت، فارمی مچھلیاں، برگر، شوارما وغیرہ ناپید تھے۔ ہر نعمت فطری اصول کے تحت میسر تھی۔ بس اُسے دھو کر پکانے کا اہتمام کر لیا جاتا۔ کھن اور دہی کھی خواتین گھر ہی میں بناتیں، دودھ بھی خالص ملتا جو آج کے دور میں جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ غربت ضرور تھی (میں اسے غربت کے بجائے سادگی کہوں گا) مگر صحت کے معاملے میں لوگ امیر تھے۔

جب کبھی گھر میں کوئی بیمار ہوتا تو ڈاکٹر مریض کو

کھیت کی دیکھ بھال اور دعائیں مانگ مانگ کر فصل پکنے کا انتظار کرتا ہے۔

جب فصل تیار ہوتی تو کٹائی کے بعد اسے دھوپ میں سکھایا جاتا۔ پھر کئی فصل کے ڈھیر سے کھجی بنا کر کسان دھوپ کے مانند اُسے پیروں میں رکھے درخت کے تنے پر پٹختا تو چاول شاخوں سے علیحدہ ہو کر زمین پر گرتے جاتے۔ یہ مرحلہ طے کرنے کے بعد چھلکے اتارنے کے لیے چاولوں کو ٹھیلر یا گاؤں ہی میں چکی پر لے جاتے۔ چکی والا ایک من چاولوں کی چھانکی کے بدلے دو کلو چاول رکھ لیتا۔ تب کہیں جا کر لے لے

خوشبودار چاول کھانے کو ملتے جو موجودہ نسل انسانوں سے خوبصورت پیکنگ میں خریدتی اور کھا کر لطف اٹھاتی ہے۔

گندم کی فصل بھی کچھ اسی طرح حاصل ہوتی۔ فصل پک جاتی تو تہتی دھوپ میں کٹائی ہوتی۔ پھر ہالیوں کے کٹھے ہاندھ ایک جگہ ڈھیریاں لگائی جاتیں اور بارش ہونے کی صورت میں انھیں پانی سے محفوظ رکھا جاتا۔ یہ بڑے ہی کنٹھن مراحل تھے۔

ہمارے دور میں گندم کی چھانکی ہوا کے دوش پر منحصر تھی۔ تہتی دھوپ میں کھلے آسمان تھے، سروں پر سفید پر نے لپینے کسان گندم سے بھوسی الگ کرنے کی خاطر ہوا کے ”بیلچے“ کے منتظر ہوتے۔ جیسے ہی ”رحمت“ کا در کھلتا، بھاگ بھاگ اُس سمت گندم اچھالی

تصور بچوں کا بھی نہیں بلکہ جدت پسندی اور مغربی تہذیب پہ آنکھیں بند کر کے عمل کرنے سے ہم اپنی ثقافت، بود و باش اور قومی زبان تک فراموش کرتے جا رہے ہیں۔

کاشت کاری کے جان گسل مراحل

”چھوٹی ذیل روٹی اور تین انڈے لے آؤ۔ باقی پیسے دھیان سے لانا۔“ میں نے سوکا نوٹ دیتے ہوئے پھلے بیٹے افغان سے کہا۔ ”پنہتیس روپے کی ذیل روٹی اور گیارہ روپے کا انڈا ہے، پتیس روپے واپس آئیں گے۔“

افغان مسکراتے ہوئے بولا ”پاپا انگلش میں بتائیے مجھے سمجھ نہیں آئی۔“ یہ سن کر میں حیرت سے اُس کا منہ ٹکنے لگا۔

انگلش میڈیم اور اولیول کا طالب علم یہ جانتا ہی نہیں کہ گندم چاول اور دیگر اجناس کا شکار کن جان گسل مراحل سے گزر کر حاصل کرتا ہے۔ وجہ یہی ہے کہ انھیں فاسٹ فوڈ اور ڈبا بند غذا نہیں ہر اسٹور سے بنا کسی مشقت کے بہ عوض چند روپے مل جاتی ہیں۔ وہ ان ہاتوں سے بے خبر ہیں کہ کسان مل، بیلچہ درانی، کھرپہ اور چوپائے (نیل) سے لیس ہو کر منہ اندھیرے کھیتوں میں مل چلاتا اور زمین کا سینہ بڑی محنت سے چیر کر یہ نعمتیں حاصل کرتا ہے۔

کو چلتی گرم ہواؤں کی پروا کیے بغیر کھڑے پانی والے کھیت اور جس زدہ ماحول میں جہاں سانس لینا بھی دشوار ہوتا ہے اور ناگہوں کی کھال تک جھلس جاتی ہے، جفاکش کسان رکوع کے انداز میں کھڑے ہو کر وسیع رقبے پر چاولوں کی بخیری لگاتا ہے۔ پھر روزانہ

حیرت سے سب کچھ دیکھتے اور سنتے رہے۔ پھر بچوں کے کہنے پر ذیرے دار نے نیل جوت کر کونہیں سے پانی نکال کر دکھایا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ میں نے ذیرے دار کا شکر یہ ادا کیا۔ رخصت ہونے لگے تو موصوف نے قریبی استادہ نیم کے درخت سے ایک شاخ توڑی اور منہ میں چبانے لگا۔

راستے میں دونوں پوچھنے لگے ”اُس درخت کی شاخیں کیا میٹھی تھیں جو وہ آدمی چہار ہاتھا؟“ میں دل ہی دل میں مسکرایا۔ پھر انھیں بتایا کہ نیم کا درخت کڑوا اور کسلا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بے شمار خوبیوں سے نوازا ہے۔ اس کا پھل، پتے اور شاخیں کئی بیماریوں میں کام آتی ہیں۔ شاخ بطور مسواک دانتوں کے لیے نہایت مفید ہے۔ نیم کی مسواک کرنے والوں کے دانت مضبوط ہوتے اور کیزرا لگنے سے محفوظ رہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ میں اپنے تئیں انھیں اپنی ثقافت اور بود و باش کے متعلق بتاتا رہا۔ جب انھیں یہ بتایا کہ ماضی میں مردوں کا ننگے سر پھرنا بھی معیوب سمجھا جاتا تھا تو وہ بہت حیران ہوئے۔ تب ہر کوئی پگڑی پرنا، صاف یا رومال سر پہ رکھتا۔ کسی محفل میں کوئی ننگے سر آتا تو یہی سمجھا جاتا کہ مبادا اسے کوئی پریشانی ہے جو ننگے سر ہی گھر سے نکل آیا۔

گھر میں ایک ہی کٹھی، سرے دانی اور ایک ہی تولیہ ہوا کرتا حتیٰ کہ سر پہ تیل لگانے کے لیے تیل کی شیشی بھی ایک ہی ہوتی۔ اس کے باوجود نہ کوئی چھوت چھنتی نہ کوئی موذی بیماری۔ ”یہ تیری چیز ہے اور وہ میری“ جیسی باتوں کا فقدان تھا۔ کھانے میں چھری کانٹے کا تصور ہی نہ تھا۔ ایک ہی تھال میں سب مل بیٹھ کے ہاتھ سے کھاتے۔

نرم غذا کھانے میں تجویز کرتا۔ تب (بی بی) نامی ذہل روٹی کی شکل دیکھنا نصیب ہوتی جو سفید کاغذ میں لپیٹی آتی۔ وہ بھی کسی خاص دکان سے لانی پڑتی تھی۔ اب تو ناشتے میں ذہل روٹی نہ ہوتی ہے منہ بنا لیتے ہیں۔

جب کسی نے کونھا لپٹا یا نانا بنانا ہوتا تو ساٹھی کسان مقررہ دن اور وقت پر پہنچ جاتے اور بنا کسی اجرت کے دن بھر مزدوروں کی طرح کام کرتے۔ پھر شام ڈھلے گھر کی روکھی سوکھی کھا کر اپنے گھر لوٹ جاتے۔ یہ مشقت سب ایک دوسرے کے لیے خوشی خوشی اور بلا معاوضہ کرتے۔

اسی طرح جب گندم کی فصل پک کر تیار ہوتی تو لڑکے ہالے اور کسان اپنی اپنی درانتیاں لیے فصل کی کٹائی میں جت جاتے۔ یہ بھائی چارے کا بڑا ہی خوبصورت اکٹھ ہوتا۔ یوں ہفتوں کا کام ایک ہی دن میں انجام پا جاتا۔ اب جدید مشینری نے فصلوں کی کٹائی کا کام قدرے آسان کر دیا جو دانہ اور بھوسی خود بخود الگ کر دیتی ہے مگر افسوس اس سہولت نے ہا ہی محبت کا بھی تیا ناچ کر ڈالا۔ اجتماعی سوچ ناپید ہوئی اور اُس کی جگہ نفسانسی نے لے لی۔

تب دانے اور بھوسی الگ کرنے کا کام "قدرتی" تھریٹر یعنی بیلوں سے لیا جاتا۔ اس عمل کو دیہی زبان میں "گاہ" کہتے تھے اور سب بڑھ چڑھ کر اس میں حصہ لیتے۔ کیونکہ اُس روز بھٹنا ہوا گوشت اور حلوہ کسان کی طرف سے کھانے کو ملتا۔ "گاہ" کا منظر بھی خوب ہوتا۔ سوکھی فصل کھیت میں بچھا دی جاتی اور اُس پر ایک موٹے تازے تیل سے "تازا" کروایا جاتا۔ بعض سادہ لوح دیہاتی گوشت اور حلوہ کھانے کے منتظر رہتے اور گاہے گاہے کسان سے پوچھتے کہ "گاہ" کب ہوئی

ہے؟ گندم کے خوشے تیل کے وزنی پیروں تلے آتے ہی چھٹکوں سے ہا ہر آ جاتے اور ذرا سی ہوا چلنے پر چھٹکے اُڑ کر پرے جا گرتے۔ یہ کام کسان سمیت دیگر دیہاتی مل کر انجام دیتے۔

ایک شخص تیل کی رسی تھامے اُسے فصل پر تھماتا دوسرا گندم کے بندھے گٹھے کھول کھول کر تیل کے قدموں تلے بچھاتا تیسرا آدمی ایک بڑا سا برتن تھامے ہمہ وقت تیار رہتا۔ جیسے ہی تیل حاجت کے لیے ذم اٹھاتا ایک دیہاتی زور سے آواز لگاتا "اُوئے! پھوسی پھوسی۔" برتن والا مددگار فوری تیل کی جانب دوڑتا۔ گجٹ میں اگر برتن ہاتھ سے گر جاتا تو دونوں ہاتھ جوڑ کر گو بر ہاتھوں میں لے لیتا تا کہ گندم خراب نہ ہو۔

گڑ بنانے کا بھی اپنا ہی لطف تھا۔ پورے گاؤں کو علم ہوتا کہ آج فلاں چودھری یا ملک کا بیلنا چلنا ہے تو لوگ گاہے گاہے ادھر آ نکلتے۔ انھیں کشادہ دلی سے خوش آمدید کہا جاتا اور گرم گڑ یا "رو" سے اُن کی تواضع بھی کی جاتی۔

کما د (گنے) کی کئی قسمیں ہیں مگر کالا کما گڑ بنانے کے لیے بہترین ہے کیونکہ یہ خوب رسیلا ہوتا ہے۔ کٹائی اور چھٹائی کے بعد جب کما کا ڈھیر لگتا تو بیلنے کے ساتھ تیل جوت دیا جاتا۔ جیسے ہی تیل گھومنا شروع کرتا ایک آدمی بیلنے میں گنے ٹھونٹا جاتا۔ رَس کی موٹی سی دھار بیلنے کے نیچے رکھی ہالٹی میں گرنے لگتی۔ جیسے ہی ہالٹی لہا لہا بھرتی اُس کی جگہ چھوٹی ہالٹی رکھ پہلی والی بھٹی پر رکھی دیو بیکل کڑا ہی میں انڈیل دی جاتی۔ دو ڈھائی من رَس اکٹھا ہو جاتا تو بھٹی میں آگ سلگائی جاتی۔

اس دوران گنے چوپنے اور آئے گئے مہمانوں کو جی بھر کے رو پلانے کا عمل بھی جاری رہتا۔ جیسے ہی کڑا ہی میں رو کھولتی سطح پر ڈھیر ساری جھاگ اکٹھتی ہوتی جو ایک بڑی سی چھٹی کی مدد سے اتار کر کنستریں میں ڈال دی جاتی۔ اسی جھاگ کو "راب" کہتے ہیں جو سرطان کے مریضوں کے لیے اکسیر ہے۔

یہ جھاگ رو اُہالنے کے دوران کئی بار اتاری جاتی حتیٰ کہ کنستریں لہا لہا بھر جاتا۔ آخر رو اُہل اُہل کر گاڑھی ہو جاتی۔ یہ پرکھنے کے لیے کہ اس کا گڑ بن سکتا ہے یا نہیں رو میں گنا ڈبو کر ہوا میں بلند کیا جاتا۔ اگر رو کی تار بن جاتی تو سمجھ لیں کہ اُس کا گڑ بن سکتا ہے ورنہ اُسے مزید پکایا جاتا۔

رو پک کر تیار ہو جاتی تو ایک بڑے سے چکور تسلے میں انڈیل دی جاتی اور کچھ دیر اُسے ٹھنڈا ہونے دیا جاتا۔ تب تک دوسرے ضروری کام نپٹا لیے جاتے۔ لیجیے جناب گڑ بننے کا آخری مرحلہ آ گیا۔ تسلے کے قریب ہی ایک صاف ستھری چادر بچھا دی جاتی۔ ایک آدمی لکھیر نما چوہی ڈوٹی لیے تسلے میں سے مخصوص انداز میں تین چھٹائیک کے لگ بھگ ملغوبہ نکالتا اور ہاتھ میں رکھ چیز اُہنا چادر پر رکھتا چلا جاتا۔ تھوڑی سی دیر میں وہ جم کر گڑ کی ڈلی بن جاتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ڈھیروں گڑ بن جاتا۔ پھر گھر میں استعمال کرنے کے لیے خاص گڑ تیار ہوتا جو گھر آئے مہمانوں کی تواضع کرنے میں کام آتا یا شہر میں کسی عزیز کے ہاں جاتے ہوئے بطور سوغات پیش کیا جاتا۔ بادام اُٹروٹ کشمش ناریل سونف اور خشکاش ملا کر یہ گڑ تیار ہوتا تو جو واقعی خاصے کی چیز ہوتی۔

کوا چلا ہنس کی چال
الوس جہید دور نے آپس میں پیار محبت اور

پکا گت کے ماحول کو معدوم کر دیا۔ لوگ روپے پیسے کمانے کی دوز میں ایسے اچھے کہ ساری قد ریں پس پشت ڈال دیں۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔
چنگے طور طریقے محمد کے "زہری" ہوندے جانے نہیں
ہولی ہوئی پنڈاں والے "شہری" ہوندے جانے نہیں
رہی سہی کسر سائنس نے فطرت کے کاموں میں
دُخل اندازی کر کے پوری کر دی۔ کئی زمیندار اب زرعی زمینوں میں مصنوعی کھا ڈال کر سال میں دو کے بجائے چار چار فصلیں لیتے ہیں۔ لیکن یہ عمل زمین کی زرخیزی ختم کر دیتا ہے۔ چنانچہ اب ہم کم توانائی والی اجناس کھا رہے ہیں۔

یوں سمجھ لیجیے کہ جدت ہماری ہر اقدار پر اثر انداز ہو چکی۔ ایک اور افسوس ناک رجحان یہ بھی ہے کہ ہماری نسل اُردو زبان سے نابلد ہو رہی ہے۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے بعض جوان لڑکے اور لڑکیاں جب یہ کہیں کہ وہ اُردو نہیں جانتے تو حیرت ہوتی ہے۔ تب خیال آتا ہے کہ لاکھوں کی تعداد میں ہمارے نامور مصنفین اور علمائے کرام کی لکھی اُردو کتابوں سے استفادہ کون کرے گا؟ ہمارے ارہاب اختیار کو اس جانب خلوص دل سے متوجہ ہونے کی اشد ضرورت ہے۔

پاکستان میں اُردو قومی اور سرکاری زبان ہے مگر نئی نسل میں اس کے فروغ سے دانستہ آنکھیں چرائی جا رہی ہیں۔ یہ ہمارے لیے لمحہ فکریہ ہے۔ دائے افسوس مغربی تہذیب کی اندھا دھند تقلید نے ہم سے سب کچھ چھین لیا حتیٰ کہ قومی زبان ہی نہیں ہمیں دین سے بھی دور کر دیا۔ اُرتا ہوں اپنا حال اُس کو سے جیسا نہ ہو جائے جو اُنہں کی پیروی کرتے کرتے اپنی چال بھی بھول جاتا ہے۔

آرام سے رہتے۔ اکثر کے بچے سال میں دو دفعہ ملنے چلے آتے۔ گو یہ مغربی تہذیب کا منہنی پہلو ہے کہ بچے بڑے ہو کر والدین سے زیادہ تعلق نہیں رکھتے۔

بہر حال ندیم کو محسوس ہوا کہ ترقی یافتہ معاشروں میں حکومت سے لے کر عام لوگ تک بزرگوں کا خیال رکھتے ہیں۔ ایک دن سرورے کرتے کرتے وہ لاہور کی خوشحال بستی "ڈیفنس" جا پہنچا۔ ایک گھر کے دروازے پر ڈاکٹر امان اللہ خان کے نام کی تختی نصب تھی۔ ندیم نے چوکیدار سے کہا "میں مردم شماری کے دفتر سے آیا ہوں اور صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ چوکیدار نے انٹرکام پر مالک سے بات کی تو اجازت ملنے پر ایک اور ملازم نے دروازہ کھولا۔ وہ ندیم کو وسیع لان میں لے گیا جہاں چند کرسیاں اور میز سلیقے سے رکھی تھیں۔ لان میں چاروں طرف خوبصورت پھولوں کے تختے لگے تھے۔ پھولوں کی خوشبو سے اس کا دماغ معطر ہو گیا۔

ابھی وہ لان کی سجاوٹ دیکھنے میں محو تھا کہ ایک بزرگ آتے نظر آئے۔ ہاتھ میں چھتری تھا سے وہ وجہہ بزرگ شاندار لباس میں ملبوس تھے۔ قریب آنے پر ندیم نے اٹھ کر انہیں سلام کیا۔ وہ مسکرائے اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ملازم کو چائے لانے کا کہا۔ ملازم رخصت ہوا، تو وہ ندیم سے مخاطب ہوئے "کیو میاں، کیسے آئے؟" ندیم نے کہا "ڈاکٹر صاحب! میں محکمہ مردم شماری کی طرف سے حاضر ہوا ہوں۔ یہ فارم ہے، اسے پُر کر دیجیے۔ آپ کے علم میں ہوگا، انتخابات ہونے والے ہیں۔ مردم شماری کے ساتھ ووٹروں کی فہرٹیں بھی بن جائیں گی۔"

"انہوں نے فارم پر طائرانہ نظر ڈالی اور بولے، "میں بتاتا ہوں آپ ہی بھر دیجیے۔"

ندیم نے کہا "بہت بہتر۔ مناسب ہو تو پہلے اپنے

موسیٰ۔ ہر بزرگ دادا جی کہلاتا۔ دن ڈھلے لوگ اپنے کھیتوں اور دوسرے کاموں سے فارغ ہو کر چوپال میں بیٹھتے۔ قصے کہانیاں ہوتیں۔ بچے شرارتیں کرتے آپس میں جھگڑتے تو بزرگ ان کے کان مروڑتے۔ لیکن مجال ہے جو بچوں کے والدین یہ کہتے "تو نے میرے بچے کو ہاتھ کیوں لگایا؟"

نو جوانوں میں گھرار ہوتی تو کوئی بزرگ انہیں سمجھا کر بات ختم کر دیتے۔ سب ایک دوسرے کی دلجوئی کرتے۔ کوئی بیمار ہوتا تو سب اس کی دوا دارو کا خیال رکھتے۔ کسی کو چلنے میں دقت ہوتی تو اسے چوپال میں چارپائی پر لٹا کر لایا جاتا۔ سب اس کی دیکھ بھال میں لگ جاتے۔ یوں پورا گاؤں ایک خاندان کی طرح تھا جن کے درمیان جھگڑے ہوتے تو سبھی میں پیار بھی بہت تھا۔ کوئی اس دارفانی سے کوچ کرتا تو پورا گاؤں سوگوار ہو جاتا۔ مرحوم یا مرحومہ کے بچوں کا خیال رکھا جاتا۔ ندیم شہر آیا تو اسے وہاں کا ماحول مختلف لگا۔ گاؤں میں سب مل جل کر رہتے تھے مگر یہاں تو نفسا نفسی کا عالم تھا۔

ایک دن اسے خیال آیا کہ شہروں میں بزرگوں کے گھر (اولڈ ہومز) بنے ہوئے ہیں۔ وہاں مقیم بزرگوں سے بھی ملنا چاہیے۔ ندیم نے پھر انٹرنیٹ میں یورپ اور امریکا میں "اولڈ ایج ہومز" سے متعلق معلومات حاصل کیں۔ اسے معلوم ہوا ان گھروں میں بزرگوں کا بڑا خیال رکھا جاتا ہے۔ ہر ہفتے ڈاکٹر ان کا معائنہ کرتا معالج کی ہدایت کے مطابق انہیں غذا دی جاتی ان کے لیے کشادہ لائبریری ہے جہاں اخبارات اور مختلف موضوعات پر کتابیں رکھی ہوتیں۔ معذور افراد کی مدد کے لیے رضا کار موجود ہوتے جو انہیں ویل چیئر پر سیر کراتے اور بازار بھی لے جاتے۔ یوں وہ بزرگ

جگ بیٹی



چچی دھوپ میں ٹھنڈی چھاؤں

مردم شماری کے

بزرگوں کا نشیمن

اولاد کی بے اعتنائی و ظلم کے مارے والدین کا نوحہ، ایک درد مند نوجوان نئی نسل کو ان کی پچاسانا چاہتا ہے

صبیحہ خان

میں داخل ہو گیا۔ سب بچے مل کر اسکول جاتے۔ راستے میں پہاڑے یاد کرتے۔ چشمے کے کنارے بیٹھ کر اپنی تختیاں دھوتے۔ منہ مذاق کرتے وقت کا پتا ہی نہ چلتا۔ گاؤں میں ہر بڑا شخص چاچا ہوتا اور ہر بڑی عورت

ندیم دفتر میں ملازم تھا۔ انتخابات کی آمد آمد تھی، لہذا اسے ووٹروں کی فہرٹیں تیار کرنے کا حکم ملا۔ ندیم کو لکھنے پڑھنے کا شوق بھی تھا۔ اسی لیے وہ اخبار میں کالم لکھتا۔ ایڈیٹر نے اسے مشورہ دیا کہ تم گلی گلی قریب قریب جا رہے ہو، تو بزرگوں کے مسائل معلوم کر کے ان کے حالات، خیالات اور احساسات پکھو۔ شروع میں ندیم کو ان مسائل پر لکھنا فضول لگا۔ لیکن جب وہ بزرگوں سے ملا تو اسے احساس ہوا کہ ہر بزرگ کے مسائل الگ ہیں۔ ہالشافہ گفتگو سے ایسی باتیں آشکار ہوئیں جن کے متعلق وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ تب اسے اپنا گاؤں اور وہاں کا ماحول یاد آیا جہاں سے اس کا ضمیر اٹھا تھا۔

ندیم نے گاؤں میں آنکھ کھولی۔ بچپن گلیوں میں بھاگتے دوڑتے گزرا۔ جب بڑا ہوا تو پرائمری

اس کی نگاہ باہر کھڑے ایک سفید پوش بزرگ پر پڑی جو خاموشی سے اندر جانے والے ہر فرد کو تک رہے تھے۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں۔

ندیم ان کے پاس گیا اور پوچھا "میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں؟" بزرگ نے جھکی نظروں سے کہا "اگر ہو سکے تو کھانا کھلا دیں۔"

ندیم نے ان کی خوداری کو محسوس کر لیا۔ اسے جھنکا سا لگا۔ اس نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ دونوں اندر جا کر میز کے گرد بیٹھ گئے۔ کھانے کا آرڈر دے کر ندیم نے بزرگ کی طرف دیکھا، ان کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ دوران طعام خاموشی چھائی رہی۔ ہوٹل سے نکل کر ندیم نے کہا "میں آپ کو گھر چھوڑ آؤں؟"

بزرگ بولے "میرے بیٹے کا گھر قریب ہی ہے، لیکن



میں مشعل راہ ہیں۔ میں پھر آؤں گا جب بھی موقع ملا۔" "ہاں ضرور آنا مجھے بھی انتظار رہے گا اور فارم بھرنے کا شکر۔"

دوری نے انہیں تنہا کر دیا تھا۔ ندیم کے آنے پر وہ چند ساعتوں کے لیے ہی سہی اپنی تنہائی سے نکل آئے۔ جیسی انہوں نے ایک اجنبی کو اپنے دل کا حال کبہ سنایا۔ اسے احساس ہوا کہ ماضی ان کے حواس پر طاری ہے۔ انہوں نے اپنے ماضی کی جو عکاسی کی ایسا وہی کر سکتا ہے جو مشترکہ خاندانی نظام کا حصہ رہا ہو جسے اپنے افلاس سے لگاؤ ہو جس کی نظریں پل پل یادوں کی دہلیز پر تکی ہوں۔ جو تصویروں سے باتیں کرتا اور خیالات کے درپے سجاتا ہو۔ آخر ندیم نے ٹھنڈی سانس بھری، گھڑی پر نظر ڈالی، ڈاکٹر صاحب سے اجازت لی اور بولا "آپ سے مل کر بہت مسرت ہوئی۔ آپ کی باتیں ہم نوجوانوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔ میں پھر آؤں گا جب بھی موقع ملا۔"

ندیم کوٹھی سے باہر چلا آیا لیکن انہی کے متعلق سوچتا رہا۔ اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر صاحب کو ہر آسائش سے نوازا لیکن تنہائی کا زہر انہیں آکٹوپس کی طرح جکڑے ہوئے ہے۔ جس اولاد کے لیے سب کچھ کیا، وہی چھوڑ گئی۔ اب وہ ہیں تنہائی اور گھڑی کی تک تک..... ندیم کے دل سے دعا نکلی کہ اللہ ان کے بیٹوں کو نیکی کی ہدایت دے اور باپ کو اطمینان اور صبر! دوسرے دن پھر اس نے سروے کا سامان اٹھایا اور ڈیوٹی پر نکل پڑا۔ مختلف گھروں سے معلومات اکٹھی کرنے کے بعد پیٹ پوچا کرنے ایک ہوٹل گیا۔ وہاں

ڈاکٹر صاحب مسکرائے اور بولے "بھئی اب بچے بھی کیا کریں، ہم خود ہی نہیں گئے۔ وہ بیگمات کی وجہ سے یہاں نہیں آتے۔ ہم ایک دوسرے کی مجبوریاں سمجھتے ہیں۔ لہذا اب تو اسی طرح زندگی گزارنی ہے۔" اسی دوران ملازم چائے لے آیا۔ میں چائے پیتا رہا اور وہ خود ہی بولتے رہے:

"ایک زمانے میں ہمارے ہاں مشترکہ خاندانی نظام رائج تھا۔ گھر بڑے نہ ہوتے، تب بھی سب مل جل کر رہتے۔ کئی لوگ ایک ہی کمرے میں سما جاتے۔ درحقیقت گھر تو کمینوں سے آباد ہوتے ہیں۔ ان گھروں میں خوشیاں اور غم سانچے ہوتے۔ سب کے بچے اپنے ہی لگتے۔ وہاں کوئی ضعیف یا بیمار تنہائی کا شکار نہ ہوتا۔ جس گھر میں بچوں کی شرارتیں، نوجوانوں کے قہقہے اور بزرگوں کی دعائیں گونجتیں وہاں خدا کی رحمت نازل ہوتی ہے۔ رات کو کھلے سخن میں سب سوتے۔ دادی اور ثانی بچوں کو چاند والی بڑھیا کی کہانیاں سناتی۔"

ندیم کو یوں لگا جیسے ڈاکٹر صاحب نے اس کے گاوؤں کا نقش کھینچ دیا ہے۔ وہ کہہ رہے تھے "تمہارا تعلق گاوؤں سے لگتا ہے۔ مجھے بھی وہاں کی آب و ہوا پسند ہے۔ نہ گاڑیوں کا شور نہ ڈیزل کا دھواں۔ لوگ جسمانی محنت کرنے کے باعث دل اور ذیابیطس (شوگر) جیسی موذی بیماریوں سے بچتے رہتے ہیں۔ قناعت پسند ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی سعی نہیں کرتے۔ شہر میں تو ایک دوڑ لگی ہے۔ جس کے پاس پیسا اور طاقت ہے، وہی راج کرتا ہے۔ رشوت، ملاوٹ، مارو دھانز، قتل و غارتگری..... بس یہ کہہ لو کہ نفسی کا عالم ہے۔"

ندیم غور سے ان کی باتیں سنتا رہا۔ ان کے چہرے پر دکھ کے آثار نمایاں تھے۔ بیوی کی وفات اور بچوں کی

بارے میں بتائے۔ گھر میں کتنے افراد ہیں کیوں کہ ہر ایک کے متعلق لکھنا ہے۔"

انہوں نے ٹھنڈی سانس لی اور اداسی سے بولے "بیٹا میں اس وسیع مکان میں تنہا رہتا ہوں۔ چند ماہ قبل میری شریک حیات ملک عدم سدھار گئیں۔ اب میں ہوں اور میرے دو ملازم!"

"آپ کے بچے نہیں؟" ندیم نے کچھ سوچ کر پوچھا۔ "وہ بیٹے ہیں لیکن دونوں امریکا رہتے ہیں۔ ان کی بیگمات انگریز ہیں۔ بچے بھی وہیں پیدا ہوئے۔" "وہ آتے تو ہوں گے؟"

"ہاں آتے تو ہر سال ہیں۔ ماں کے انتقال پر بھی آئے۔ ایک ماہ رہے۔ مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے لیکن میں نے انکار کر دیا۔ اپنا ملک اپنا ہی ہوتا ہے۔ میں امریکا جا چکا لیکن مستقل وہاں نہیں رہ سکتا۔"

ندیم کو احساس ہوا کہ تنہائی کا شکار ڈاکٹر صاحب دل کی بجز اس نکالنا چاہتے ہیں۔ اس نے پوچھا "ڈاکٹر صاحب! اپنے بچوں کے بارے میں بتائیے کہ وہ وہاں کیا کرتے اور یہاں کب آتے ہیں؟ آپ کے تنہا رہنے سے پریشان تو ہوں گے؟"

"ہاں فکر مند تو ہیں لیکن میں وہاں جا کر کیا کروں؟ یہاں میری چھوٹی سی لائبریری ہے۔ مجھے لکھنے پڑھنے کا شوق ہے۔ میں نے ساری عمر پڑھایا لکھایا ہے۔ پھر ان کی ماں بھی امریکا نہیں جانا چاہتی تھی۔ یہ ملازم میرا خیال رکھتے ہیں۔"

"پھر بھی ڈاکٹر صاحب، میں حیران ہوں کہ بیٹوں نے آپ کو تنہا کیسے چھوڑ دیا۔ اپنے تو اپنے ہی ہوتے ہیں۔"

”کافروں کے دہس میں۔“

”چلیے بیٹا ہے تو سہی، آتا تو ہوگا؟“

”ارے نہیں، وہ یہاں کیوں آنے لگا۔ اس کی بیوی اگریز ہے۔ بیٹے نے اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش تو کی تھی لیکن میں کیوں جاؤں کافرستان! ہاں کبھی کبھی پیسے بھیج دیتا ہے۔ بس یہی گھر ٹھیک ہے۔ یہاں میرے کبھی دوست اچھے ہیں۔ ان سے دل لگا رہتا ہے۔ کھانے کو روٹی مل جاتی ہے، رہنے کو چھت ہے مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔“

”تو آپ یہاں خوش ہیں؟“ ندیم مسکرایا۔

”ظاہر ہے۔ یہ میرا وطن ہے۔ اسے ہم نے بہت قربانیاں دے کر بنایا۔ کئی پاکستانی اپنے ملک کی قدر نہیں کرتے لیکن میں اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکتا۔“

ندیم کو باتوں سے وہ پڑھے لکھے لگے۔ ان کی گفتگو سن کر وہ بہت خوش ہوا۔ وہ کچھ دیر رک کر بولے ”اچھا اب میں آرام کروں گا۔“ یہ کہہ کر انھوں نے اپنی چھتری اٹھائی اور کمرے کی طرف چل دیے۔ چلنے میں انھیں کچھ دشواری محسوس ہو رہی تھی۔

تیسرے صاحب نے اپنی عینک درست کرتے ہوئے کہا ”ارے تم یہ بتاؤ کہ ہو کون؟ ہماری خبر لینے تو کوئی بھی نہیں آتا؟“

اس سے پہلے کہ ندیم کچھ کہتا، صدر الدین جو خاموشی سے ساری باتیں سن رہے تھے، بولے ”یہ ندیم صاحب ہیں۔ محکمہ بہبود آبادی میں کام کرتے ہیں۔ آج کل انتخابات

”میرا نام ندیم ہے اور میں محکمہ مردم شماری کی طرف سے سروے کر رہا ہوں تاکہ ملک کی صحیح آبادی کا پتا چل سکے۔ انتخابات ہونے والے ہیں آپ بھی ووٹ ڈالیں گے نا؟“

”بہت خوب، کیا حکومت کو معلوم ہو گیا کہ ہم بھی اسی ملک کے شہری ہیں؟ اور ہمارے بھی کچھ حقوق ہیں۔ ہم نے ساری زندگی اس ملک کی خدمت کی ہے مگر ہمیں اس کا کیا صلہ ملا؟“

ندیم نے کہا ”قبلہ! حکومت آپ بزرگوں کے لیے کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہے۔ مگر ”کالی بھیڑیں“ اپنی بد عنوانیوں کی وجہ سے سرکاری امداد آپ تک نہیں پہنچتی

دیتیں۔ آپ کو یہاں حکومت ہی نے تحفظ دیا ہے لیکن اس جگہ کارندے ایماندار، منمنی اور خوش اخلاق ہوں تبھی آپ سرکاری سہولتوں سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔“ ندیم کو

ہاتھیں کرتا دیکھ کر دوسرے بزرگ بھی وہاں آگئے۔ ندیم نے ایک نئے بزرگ سے پوچھا ”آپ کے بچے ہیں؟“

وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولے ”میرا کوئی بیٹا نہیں۔“ ندیم نے محبت سے ان کا ہاتھ پکڑا اور کہا ”چلیے مجھے اپنا بیٹا بنا لیں۔“

دوسرے صاحب جو قریب ہی بیٹھے تھے، بولے ”میرا بیٹا تو ہے مگر وہ یہاں نہیں رہتا۔“

ندیم نے ان کی طرف رخ کر کے پوچھا ”پھر وہ کہاں رہتا ہے؟“



www.paksociety.com

تھے۔ ندیم نے سلام کیا اور انھیں کھانا کھلایا۔ پھر بتایا کہ میں آپ کے لیے ”اولڈ ایج ہوم“ والوں سے بات کر آیا ہوں۔ یہ سن کر وہ کچھ مطمئن ہوئے اور چلنے کی ہامی بھری۔ ندیم نے ان کا شناختی کارڈ دیکھا، تعلیم وغیرہ کا پوچھا اور انھیں ”جائے عاقبت“ لے آیا۔ اس نے دفتر والوں سے کہا ”یہ صدر الدین ہیں، پڑھے لکھے ہیں۔ سرکاری ملازمت میں رہے ہیں۔ جسمانی طور پر فٹ ہیں۔ اگر ان کے ذمہ کوئی کام لگا دیا جائے تو میرے خیال میں اچھی طرح انجام دیں گے۔“

اباکار نے انھیں خوش آمدید کہا اور کہنے لگا ”آپ یقیناً ہمارے ادارے کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوں گے۔“ ان کا مسئلہ حل کرنے کے بعد ندیم نے اپنا سروے شروع کرنے کی اجازت مانگی جو اسے بخوشی مل گئی۔

ندیم ادارے کے اندر چلا گیا۔ سردیوں کے دن تھے۔ کچھ بزرگ کرسیوں پر بیٹھے دھوپ تاپ رہے تھے۔ برآمدے میں پنگ بجھے تھے۔ بعض بزرگ ان پر لینے آرام کر رہے تھے۔ اس نے قریب جا کر دیکھا تو اکثر بیمار اور کمزور نظر آئے۔ بستر اور کپڑے بھی میلے تھے۔ کسی کے کان میں آلہ سماعت تھا، کسی نے موٹے دھاگے سے بندھی عینک لگا رکھی تھی۔ کوئی چلنے سے معذور تھا۔ ایک بزرگ کرسی پر براجمان تھے۔ ان کے کان میں آلہ اور ناک پر موٹے شیشوں والی عینک جمی تھی۔ ندیم نے سوچا، ابتدا ہی بزرگ سے کی جائے۔ صدر الدین بھی ساتھ تھے۔

ندیم نے انھیں سلام کیا اور صدر الدین کا تعارف کرایا کہ یہ صاحب آپ کے نئے ساتھی ہیں۔ ان بزرگ نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا ”میرا نام زاہد ہے اور آپ کون ہیں؟“

اس نے کہا ”آپ کل مجھے یہیں ملیے گا۔ میں آپ کو لے جاؤں گا۔“ یہ کہہ کر اس نے خاموشی سے ایک سرخ نوٹ ان کی جیب میں رکھا اور اپنے کام پہ چلا گیا۔ گھر واپسی پر بزرگ کا چہرہ اس کی نظروں میں گھومتا رہا۔ ندیم نے سوچا، اس شہر میں نجانے کتنے بزرگ اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھے فاقہ کشی کرتے ہوں گے۔ تبھی اسے حضرت عمر کا فرمان یاد آ گیا۔ آپ نے فرمایا تھا ”دریائے قرات کے کنارے اگر ایک کتابھی بھوکا سویا تو اس کا حساب قیامت کے دن عمر کو دینا پڑے گا۔“ اور ہم کیسے مسلمان ہیں کہ جنہیں اپنے پڑوسی کی بھی خبر نہیں؟

اگلے دن وہ سب سے پہلے بوزھوں کے ایک گھر پہنچ گیا۔ دروازے پر لکھا تھا ”جائے عاقبت۔“ یہ بزرگوں کا سرکاری گھر تھا۔ وہ منتظم سے ملا اور اسے بتایا کہ ملک میں مردم شماری ہونے والی ہے۔ ووٹرسٹوں کا کام بھی جاری ہے۔ چنانچہ ادارے میں مقیم افراد کے کوائف درکار ہیں۔

اس نے بڑی نخوت سے کہا ”آپ ان بوزھوں کے کوائف لے کر کیا کریں گے؟ ان میں تو بیشتر معذور اور کمزور ہیں۔“

”اچھا میں ان سے بات چیت تو کر سکتا ہوں؟“

”ہاں کیوں نہیں؟ ضرور ملیے اور بات کیجیے۔ آپ کو خود ان کی حالت کا اندازہ ہو جائے گا۔“

تب ندیم نے کہا ”کل مجھے ایک لاوارث بزرگ ملے تھے۔ اگر آپ انھیں داخل کر لیں تو مہربانی ہوگی۔“

منتظم بولا ”کیوں نہیں میں انھیں خوش آمدید کہوں گا۔“

ندیم نے نماز ظہر کے بعد آنے کا وعدہ کر لیا۔ وہ جب ہوٹل پہنچا تو بزرگ چھوٹا سا تھیلا لیے کھڑے

ہونے والے ہیں تو یہ دہروں کی لہرتیں تیار کر رہے ہیں۔
 آپ کو بھی ووٹ ڈالنا ہے؟“
 ”یہ نوجوان تو ہمارے لیے مسیحا ثابت ہوا ہے۔
 دوسرے بزرگ بھی ان کی طرف متوجہ ہوئے اور بولے
 ”شکر ہے، کسی کو تو ہمارا احساس ہوا۔“
 ندیم نے گھڑی دیکھی، اسے یہاں خاصا وقت بیت
 چکا تھا۔ وہ بولا ”مجھے اجازت دیجیے۔ لیکن آپ حضرات
 ووٹ ضرور ڈال لیں گے۔“
 ایک صاحب بولے ”بھئی کوئی بھی حکومت آئے
 ہماری فکر کس کو ہوتی ہے؟ جب اپنی اولاد توجہ نہیں دیتی تو
 دوسروں کو کیسے ہوگی؟“

آج تجھے کیوں چپ سی لگی ہے
 کچھ تو کیا بات ہوئی ہے
 آج تو مجھے ساری دنیا
 ہم دونوں کو دیکھ رہی ہے
 تو ہے اور بے خواب درتے پچھے
 میں ہوں اور سنان سکل ہے
 خیر تجھے تو جانا ہی تھا
 جان بھی تیرے ساتھ چلی ہے
 اب تو آگے لگا لے ناصر
 دیکھ تو کتنی رات گئی ہے
 (ناصر کاظمی)

کر مغرب کی نقالی کی ہے۔ مگر یوں ہمیں سر چھپانے کی
 جگہ مل گئی۔ لیکن ہماری آواز حکومت تک پہنچا دو کہ مغرب
 والوں جیسا اخلاق بھی پیدا کرو۔ بوزھوں سے محبت کرو
 انھیں عزت دو، نیشن کی وصولی میں جو مشکلات ہیں، ان
 کا خاتمہ کرو اور نوجوان نسل کو بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا
 ہے، اپنے ماں باپ کے سامنے اُف تک نہ کرو۔ ان کا
 ہر طرح خیال رکھو نہ کہ انھیں بوزھوں کے گھر ڈال کر خود
 بے فکر ہو جاؤ۔ اب یہ ہمارے ساتھ جو بھی سلوک کریں،
 تم نے دیکھ ہی لیا۔“
 ”میں کل ہی کے اخبار میں آپ کا پیغام شائع کر
 دوں گا۔ آپ بالکل فکر نہ کیجیے۔“ ندیم کا مقصد پورا ہو چکا
 تھا۔ اس نے بزرگوں سے اجازت طلب کی۔
 صدر الدین نے کہا ”ندیم ہم سے ملنے آتے رہنا۔
 تم سے مل کر دل کا بوجھ ہلکا ہو گا اور ہم سمجھیں گے کہ کسی
 نوجوان کو تو ہمارا خیال آیا۔“
 اس نے کہا ”آپ فکر نہ کیجئے میں اور میرے ساتھی
 بھی آپ لوگوں کے پاس آتے رہیں گے۔“
 ندیم وہاں سے نکلا تو اس کے دل پر بڑا بوجھ تھا۔ وہ

سوچ رہا تھا کہ ہم پاکستانیوں میں سے اکثر والدین اور
 بزرگوں کے ساتھ ناروا سلوک کرتے ہیں۔ وہاں جس
 کسپہری کے عالم میں وہ رہ رہے ہیں اور جو گندگی کا
 حال تھا، اللہ کی پناہ.....
 یہ خیالات اس کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے تھے کہ
 اچانک اس کی نظر خانہ بدوشوں کی ایک بستی پر پڑی۔ دل
 میں آیا کہ ان کے بزرگوں سے بھی بات چیت کرنی
 چاہیے۔ یوں پتا چلے گا کہ وہ کس حال میں ہیں۔ چنانچہ
 وہ اس طرف بڑھا۔ سڑک سے تھوڑا نیچے جمونہ پڑیاں بنی
 ہوئی تھیں۔ بچے ننگے پاؤں ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔
 چند کتے، بندر اور بکریاں چارپائی کے پائے سے بندھے
 اگتھ رہے تھے۔ خیموں کے اندر باہر مرد اور عورتیں کام کاج
 میں مصروف تھے۔ ندیم ان کی طرف بڑھا۔ اسے دیکھ کر
 بچے دوڑتے ہوئے اس کی طرف لپکے۔ ندیم نے کہا
 ”سامنے جو شخص بیٹھا ہے، اس کو بلاؤ وہ تمہارا کون ہے؟“
 کسی نے کہا ”چاچا“ کسی نے کہا ”ملا“ اور کوئی شرملا کر
 بھاگ گیا۔ ندیم نے آدمی کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ آتے
 ہی بولا ”کیا آپ بندر کا تماشہ دیکھنا چاہتے ہیں؟“
 ندیم نے کہا ”نہیں، آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“
 وہ حیران ہوا، تو ندیم نے کہا ”گھبراؤ نہیں، میں معلوم
 کرنا چاہتا ہوں کہ ان خیموں میں کتنے لوگ رہتے ہیں اور
 جب بارش ہو تو اس سے کیسے بچاؤ کرتے ہیں؟“
 اس نے کہا ”صاحب جی ہم تو، تجارت سے ہیں اور
 آپ جانتے ہو کہ ہمارا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا۔ جہاں جگہ
 ملے، خیمہ لگا لیتے ہیں۔ وہ سامنے والی عمارت خالی ہے۔
 بارش ہو تو کچھ دیر وہاں سر چھپا لیتے ہیں۔“
 ندیم نے بچوں کی طرف دیکھ کر کہا ”یہ اسکول
 نہیں جاتے؟“

اس نے ہنس کر کہا ”کیوں بخول کرتے ہو جی۔ جس
 کے ہاپ دادا نے اسکول کی شکل نہیں دیکھی تو یہ کیا
 دیکھیں گے۔ کھانے کو روٹی مل جائے یہی بڑی بات
 ہے۔ فیس اور کتابوں کی رقم کہاں سے لائیں؟“
 ندیم نے اطراف پر نظر ڈالی اور بولا ”یہاں تو
 بہت گندگی ہے۔ کوزے کے ڈھیر اور اس نالے کی
 بدبو، کیسے رہتے ہو؟“
 ”صاحب! ہم ان بدبوؤں کے عادی ہو چکے۔
 بارش کے بعد نالہ بھر جائے تو ہم یہ جگہ چھوڑ دیتے
 ہیں۔ آپ بتائیے کیسے آئے؟“ ایسا لگا وہ ندیم کی
 باتوں سے تنگ آ گیا ہے۔
 ندیم نے بتایا ”میں سرکاری دفتر میں کام کرتا ہوں
 انتخابات ہونے والے ہیں۔ میں جانا چاہتا ہوں کہ تم
 لوگوں کے شناختی کارڈ ہیں۔ اگر ہوں گے تو تم سب بھی
 ووٹ ڈال سکو گے۔“
 ”ہمارا پکا گھر ہوتا تو شناختی کارڈ بھی بن جاتا۔“
 ندیم نے سوچا ہات تو ٹھیک ہے۔ ان کی بھی کیا زندگی
 ہے۔ پھر پوچھا ”یہ بتاؤ تمہاری گزر بسر کیسے ہوتی ہے؟“
 اس نے جانوروں کی طرف اشارہ کیا اور بولا ”جی یہ
 سب میری گزر بسر کا ذریعہ ہیں۔ ہم سب ساتھی
 جانوروں کا تماشہ دکھاتے اور کچھ محنت مزدوری کرتے
 ہیں۔ عورتیں لوگوں کے گھروں میں کام کرتی ہیں۔ اللہ
 بڑا ہادشاہ ہے۔ روزی کا انتظام تو اوپر والا ہی کرتا ہے۔“
 ندیم نے کہا ”ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن تمہارے گھر
 میں بزرگ نہیں ہیں؟ یعنی تمہارے ماں باپ.....“
 اس نے سر جھکا کر کہا ”وہ بھی ہیں لیکن ہم انھیں
 اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے۔“
 ندیم نے حیرت سے کہا ”تم جانور رکھ سکتے ہو لیکن

دین کی دنیا

بسر کرتے یہ سوچ کر آنے والے کل کے آئینے میں خود کو بار بار نہ جھانکے گا کہ "کیسا لگ رہا ہوں؟" میرے کہتے ہیں کہ آدم اور ابلیس میں اگر کوئی فرق ہے تو وہ اسی گمراہ مارے "امپریشن" (تاثر) کا ہے۔

اے مسلمانو! ہوشیار! خبردار

اللہ دیکھ رہا ہے

نامہ اعمال سنوارنے کی تک و دو میں
بتلا ایک مسلمان کا چشم کشا سفر خود آگہی

عجم اسمر

بچپن ہی سے تاریخ میں گہری دلچسپی
مجھے رہی ہے۔ اسی لیے اسے پڑھتے ہوئے
ماضی کے کئی جہروں میں جھانکا، تو
بڑے بڑے مہذب اور معقول لوگ کبھی کبھی خاصے
غیر مہذب اور نامعقول نظر آئے۔ دوسری طرف کئی
ڈاکو اور چور کبھی کبھی درویش منش اور صوفی صفت
لگے۔ ایک مدت مطالعے کے بعد کچھ عقدے ہم پر
کھل ہی گئے۔

پہلا تو یہ کہ ایک جاسوس نامہ شخص مسلسل ہر خاص و
عام اور کس و ناکس پر کڑی نظر رکھے ہوئے ہے۔ وہ ہر
رو نما ہونے والا ہر چھوٹا بڑا واقعہ نوٹ کرتا ہے۔ دوسرا یہ
کہ جب بھی کوئی عزت دار شخص زندگی گزار کر یہ خاک
اہدی نیند جاسوے اور اس کی نیک نامی مستند ہو جائے تو
ایک آدھ صدی بعد یہ جاسوس اپنے سفاک رجسٹر کے
صفحے پلٹ کر موصوف کی حیات کا کوئی ایسا گوشہ
"بریکنگ نیوز" کی طرح فوکس میں لاتا ہے جس سے
مرحوم لینے لٹائے (قبر میں) جی بھر کے بدنام ہو جاتا
ہے۔ تیسرا عقدہ یہ کہ آپ بھلے سے چھپ کر یا بشری
تقاضوں کے ہاتھوں مجبور ہو کے کوئی مزے دار سا گناہ
کریں، یاد رکھیے، جب بھی وہ زمانے کے آگے آیا ہے
حد گھٹناؤنا اور کریم ہو جائے گا۔

بیچے اب اس ساری آگہی کے بعد
کون کم بخت ہو گا جو اپنے
آج کو



غزل

ہر چیز ہے محو خود نمائی
ہر ذرہ شہید کبریائی
بے ذوق نمود زندگی، موت
تعمیر خودی میں ہے خدائی
رائی روز خود سے پرہت
پرہت ضعف خودی سے رائی
تارے آوارہ و کم آمیز
تقدیر وجود ہے جدائی
یہ پچھلے پہر کا زرو رو چاند
بے راز و نیاز آشنائی
تیری قدیل ہے ترا دل
تو آپ ہے اپنی روشنائی
اک تو ہے کہ حق ہے اس جہاں میں
باقی ہے نمود سببائی
ہیں عقدہ کشا یہ خار صحرا
کم کر گلہ برہنہ پائی
(علامہ اقبال)

اپنے والدین کو کیوں نہیں؟

آدمی شرمندہ تھا۔ گردن نیچی کر کے کہنے لگا "جی
ہمارا کوئی گھر نہیں۔ ماں باپ بوڑھے اور بیمار ہوں تو ہم
انہیں لیے کیسے پھر سکتے ہیں؟"

ندیم نے حیران ہو کر پوچھا "تو وہ کہاں ہیں؟"
"وہ سڑک کنارے بیٹھ جاتے ہیں۔ کوئی پیسے
دیتا ہے کوئی کپڑے! رات کو وہ کسی دربار میں چلے
جاتے ہیں۔"

ندیم نے کہا "یوں کہو تم ان سے بھیک منگواتے ہو۔"
وہ ہاتھ ملتے ہوئے بولا "بس جی مجبوری ہے۔"
"تم لوگ کتنے ظالم ہو۔ یہ جانو اور بہت سے بچے تو
اپنے ساتھ رکھتے ہو لیکن ماں باپ بوجھ لگتے ہیں۔ اب پتا
چلا، ملک میں فقیروں کی تعداد کیوں بڑھ رہی ہے۔"

وہ آدمی خاموش رہا۔ ندیم دل پر مزید بوجھ لیے اٹھ
کھڑا ہوا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا سڑک پر آ گیا۔ بہر حال
اسے اپنے کالم کے لیے خاصا مواد مل چکا تھا۔

جب اس مصیورت حال کا تجزیہ کیا تو اسے احساس
ہوا، تینوں طبقوں سے تعلق رکھنے والے بوڑھوں کے
مسائل ایک ہی ہیں لیکن نوعیت جدا جدا ہے۔ ڈاکٹر امان
اللہ معاشی طور پر مطمئن لیکن ان کی روح تنہائی کا شکار
تھی۔ باقی حضرات مائی مشکلات کا شکار محبت کے
بھوکے اور ملنے والوں سے بات کرنے کے خواہش مند
نکلے۔ ادھر جاہل خانہ بدوشوں کو اپنے والدین کے
جذبات کا احساس ہی نہیں۔ اس نے سوچا "بہر حال
مجھے اپنا وعدہ نبھانا ہے۔ میں اپنے ساتھیوں سے بھی
درخواست کروں گا اگر ممکن ہو تو نشتے میں یا کم از کم مہینے
میں ایک بار اولد اتج ہوم جا کر بزرگوں سے مل لیا کریں
تا کہ ان کے دل کا بوجھ ہلکا ہو سکے۔"

ہم نے پوچھا "وہ کیسے؟"

بولے "حضور! بھلا تم عدوی کرتے اور پھر اڑیل و ڈھیٹ ہوتے وقت اٹلیس نے یہ سوچا کہ ہزار ہا ملائکہ کروڑ ہا جنات، ایک خاکی آدم اور خود رب العالمین کے سامنے اس کا کیا امپریشن بن رہا ہے؟"

ہم شیطان نہیں چناں چہ آئینے میں اپنی صورت خوب ہی دیکھنے کی آرزو ہے۔ اس لیے اوائل جوانی ہی سے ہم حد درجہ محتاط ہو گئے کہ ہر اس بات سے بچنا ہے جسے جاسوس کبھی ہمارے خلاف استعمال کر کے ہمیں اس حالت میں رسوا کر دے جب ہم جواب دینے کے لائق بھی نہ رہیں یعنی سو برس یا دو سو سال بعد اگر یہ کتنا کٹھن کام تھا اس کا اندازہ درج ذیل واقعات سے لگایا جاسکتا ہے۔

لڑکپن میں ہمارے ہم عمر لوندے کچھے کھیلتے، چٹکیں اڑاتے اور کبوتر بازی کر کے مزے لیتے اور ادھر ہم انہیں ہنستا کھیلتا دیکھ کر جی ہی جی میں کھستے رہتے۔ کیوں؟ تاکہ بعد میں لوگ یہ نہ کہیں "مولانا ابرار الدین کے خاندانی ہونے پر کوئی شبہ نہیں مگر تاریخ میں ہے کہ ان کے بچھے صاحبزادے اعزاز الدین گھنیا اور بیچ لوگوں کی معیت میں غیر شریفانہ کھیل تماشوں میں حصہ لیا کرتے تھے۔" (اعزاز الدین ہمارا ہی نام ہی ہے)

جوانی کے دیوانہ ہونے پر کسی کو شبہ نہیں مگر ہم نے اس عالم میں بھی ہوش کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ کیا مجال جو کئی محلے میں کوئی آنکھ منکا کیا اگرچہ بقول میر کے اس کی وجہ آنکھوں کا مرکز مشترکہ نہ ہونا تھا۔ مگر یہ ان کی رائے سے ہماری نہیں۔ کوئی عشق ہمارے نامہ اعمال میں درج نہیں جو پھر بقول میر ہمارے کم زد

ہونے پر دلیل ہے شرافت میں نہیں۔ اس پر ہم برامان گئے تو انہوں نے الفاظ واپس لے کر آئینہ ہمیں تھما دیا۔ ہم نے غور کیا تو لگا کہ چند بنیادی کمزوریوں اور کمی گوشت کے علاوہ ہمارا چہرہ ٹھیک ٹھاک ہی ہے۔ مگر جب ہم نے اپنے جذبات تیر تک پہنچائے تو انہوں نے آہ سرد بھر کر آئینہ ہاتھ سے لے لیا۔

بہر کیف شادی ہوئی۔ بیگم شروع ہی سے ہماری بھر کم ملیں۔ اب ہماری جوڑی 'الف، نون' کے مثل تھی..... نہ ہم اپنی دہلی پتلی حالت سے آگے آئے نہ بیگم پیچھے ہٹیں۔ بلکہ اوپر تلے تین بچوں کی آمد کے بعد تو وہ مستقل ہو گئیں۔ ہر چند انہوں نے ہر حربہ آزما یا کہ ہم ذرا جان پکڑ لیں۔ جیسے ماہ بعد بچوں کو جوڑوں غذا دیتیں، وہ بعد اصرار ہمیں بھی کھلائیں کیونکہ اس سے تو بچے بھی موٹے ہو جاتے تھے، ہم کیا چیز ہیں؟ مگر معاملہ بے سود رہا۔

یہ سلسلہ چھوٹی آنے کے تین سال بعد تک جاری رہا۔ ایک روز ہم اپنی پیاری گپلو سی بیٹی کو اوپر بٹھائے گھوڑا بنے دوڑنے کی کوشش میں بانپ رہے تھے۔ وہ اپنی معصوم آواز میں گاربی تھی "گکڑی کی کانٹھی..... کانٹھی پہ گھوڑا..... گھوڑے کی دم پہ جو مارا ہتھوڑا..... گھوڑا دوڑا..... دم دبا کے دوڑا۔" تو بیگم نے نصی سے اسے پکارا "ننھی اتر جا کیا گھوڑے کو مار کے دم لے گی؟"

تب تھی ہماری پینچ اور ہمارے مونا ہونے کی امید بیگم کے دل سے ہمیشہ کے لیے اتر گئی۔ یوں ہمیں گزشتہ پانچ برس سے بچوں کے پھلکے سینھے بے وقت کھانوں سے نجات ملی۔ ہم نے صد شکر کیا۔ میر نے سنا تو تعجب کیا کہ بھلے مانس اگر اچھے نہیں لگتے تھے تو پہلے

روز کھانے سے انکار کیوں نہ کر دیا بھائی کو؟"

ہم نے بتایا "کیسے کرتا؟ بلکی پھلکی حرمت کو انہوں نے تمہا بل عارفانہ جانا۔ زیادہ ٹکرا اس لیے نہیں کی کہ انتہائی صورت نہ بن جاوے..... کم بخت جاسوس کل کو لوگوں کو یہ نہ کہتا پھرے کہ تاریخ میں ہے، اعزاز الدین بے حد غصیلے اور جھگڑا لوتھے۔ بیگم کے ساتھ ان کا سلوک بے رحمانہ تھا۔ قیاس ہے، شراب پیتے ہوں گے تبھی بیگم سے مار پیٹ بھی کیا کرتے کیونکہ ہتھانگی ہوش و حواس اتنا دلیرانہ اقدام اٹھانے کی کس میں ہمت ہو سکتی ہے؟"

دفتری معاملات میں اس احتیاط کے نقصانات کچھ زیادہ نکلے۔ مثلاً ہمارا چہرہ اسی رفیق رفاقت کم اور مفارقت زیادہ دینے کا قائل تھا یعنی ہر دوسرے روز چھٹی۔ بہانہ کبھی بیوی کی بیماری تو کبھی ساس کا انتقال، کبھی بچے کے اسکول کا مسئلہ تو کبھی خاندان کا کوئی قضیہ۔ اس کا طریقہ واردات کچھ یوں تھا کہ پہلے وہ آپ کو خدا خوفی کا واسطہ دیتا اور پھر اپنی بات کہتا یعنی اگر آپ انکار کرتے تو یہ ثابت ہو جاتا کہ آپ پر لے درجے کے بے رحم اور خدا کے خوف سے بے نیاز شخص ہیں۔

آپ تو سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ یہ بات جاسوس کس انداز میں پیش کرے گا؟ چناں چہ ہم دفتر میں جزوقتی افسر اور کل وقتی چہرہ اسی (اپنے ہی) کے فرائض انجام دیتے۔ ساتھی افسران اور نائبین کا معاملہ بھی کچھ مختلف نہ تھا مگر ہم مستقبل کی بدنامی سے بچنے کے لیے حال کی بد حالی سستے رہے۔ ورنہ یہ خاک یہ سننے کو ملتا "اعزاز الدین کی کچھ خوبیاں بھی رہی ہوں گی مگر حقائق کی چھان پھانک سے پتا چلا ہے کہ مرحوم بے حد تنگ

مزاج، خود غرض اور بد لحاظ مشہور تھے۔ جہاں کام کرتے وہاں کبھی ان سے نالاں تھے۔ کبھی کسی کے کام نہ آتے۔ اپنی عادات و خصائل سے تنگ اسلاف و باعصب عارمانے جاتے تھے۔" بیچھے قصہ ختم!

ان دلخراش معاملات کے باعث دل پر گرائی بڑھتی تو اپنے دوست میر سے بوجھ بانٹ لیتے۔ مگر جب واقعات بڑھنے لگے تو میر کی بھی قوت برداشت جواب دینے لگی۔ اب جو نبی ہم ذکر شروع کرتے وہ اتنا لڈ پڑھ کر منہ پھیر لیتے۔ ایک روز ہم سے ضبط نہ ہوا تو کہہ اٹھے "میر تم اچھے مسیحا ہو ڈا کیوں نہیں دیتے؟"

وہ بولے "اعزاز الدین! تمہارے ننھے سنے "بیچھے" میں یہ بات کیوں بیٹھ گئی ہے کہ تم کوئی عظیم ہستی یا بڑی شخصیت کے نام سے پہچانے جانے والے ہو۔ میرا مطلب ہے بعد از مرگ؟"

ہم نے ٹینک کے پیچھے آنکھیں پھاڑیں "ہائیں بھیا! تاریخ تو عام آدمی کی بھی لکھی ہوئی پڑھی ہے ہم نے۔"

میر نے سر جھٹکا اور قدرے تیزی سے بولے "کس نے کہا؟ کس نے کہا؟ ارے معقول آدمی!..... تاریخ تو خواص کی ہوتی ہے جو بوقت ضرورت فرداً فرداً لکھی جاتی ہے۔ عام آدمی کا تو بس ماضی ہوتا ہے جو کروڑوں افراد کو ایک لفظ 'عوام' میں پرو دیتا ہے۔ یہ کبھی فرداً فرداً نہیں بتائی جاتی..... سمجھے؟"

پھر یہ خیال کر کے کہ شاید ہم نہیں سمجھے مزید تفصیل بیان کرنے لگے "دیکھو نا، اب کسی شامی شادی کی شان و شوکت بیان کرنے والا تاریخ دان خاندان بھر کے لباس، زیورات، آرائش، سوار یوں کی جج دجج راہوں میں بچھے قالین اور لٹائے جانے والی دولت اور جواہر کی

کام کی باتیں

- ☆ رضا مندی کی آنکھ ہو تو کوئی عیب اسے نظر نہیں آتا اور جب ناراض ہو جائے تو اسے صرف برائیاں نظر آتی ہیں۔
- ☆ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا آدمی ہو جو بلند منصب پر فائز ہو کر مست، خواہشات کے پیچھے چل کر در ماندہ اور بدکاروں سے مل کر نام نہ ہو۔
- ☆ ضرورتیں کم کر دے تو راحت پاؤ گے۔
- ☆ جو تمہارے ایسے اوصاف بیان کرے جو تم میں سے نہ ہوں وہ تمہارے ایسے عیوب بھی بیان کرے گا جو تم میں نہیں۔
- ☆ اگر تم اپنے نفس کو حق میں مشغول نہ کرو گے تو وہ تم کو باطل میں مشغول کر دے گا۔
- ☆ سخاوت دنیا اور آخرت کے عیوب کو ڈھانپ لیتی ہے۔
- ☆ چونکہ جاہل کو اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ وہ عالم ہے اس لیے وہ کسی کی بات نہیں مانتا۔
- ☆ جس طرح بصارت کی ایک حد ہوتی ہے اسی طرح عقل کی ایک حد ہوتی ہے جہاں وہ ٹھہر جاتی ہے۔

(امام شافعی)

ظلم کی حد کو چھونے لگا۔ مگر ڈائری میں ہر بات کی نہایت معقول توجیح اور خوبصورت اصطلاحات کی مقدار میں اضافہ ہونے لگا تا رہا۔

یہ سلسلہ شاید ہمیں فرعون ہی بنا دیتا اور ہم درگزر اور تحمل جیسی صفات سے ہانکل تھی دست ہو جاتے اگر ایک روز بدترین ٹریک میں نہ پھنستے۔ شاید کراچی کا وہ بدترین ٹریک جام ہمیں کچھ جتانے کے لیے ہی برپا ہوا تھا۔ ہم جھنجھلا رہے تھے مگر راستہ نہ مل سکا۔ بیزاری اور کوفت میں ادھر دیکھا تو دائیں جانب ایک پلازے کی عین پیشانی پر لکھا نظر آیا "کیا آپ جانتے ہیں کہ اللہ آپ کو دیکھ رہا ہے؟"

یہ پڑھ کر ہم ساکت و جلد رہ گئے۔ کچھ ہی دیر میں ٹریک کھل گئی۔ لوگ گھروں کو چلے گئے مگر ہم گاڑی ایک طرف کھڑی کر سینے پر ہاتھ رکھے سوچنے لگے "یہ کیسی بات تھی جو ہم بھول گئے؟ تاریخ دان کو تو ڈائری، خوبصورت الفاظ و توجیحات سے دھوکا دے لیں گے مگر اس سے..... جو ہمارے دل کے ہر ارادے اور نیوٹوں کی خیر تک رکھتا ہے، ہر جگہ ہمیں دیکھ رہا ہے، اس کے سامنے کس منہ سے جائیں گے؟ ان اعمال سمیت کیا "اسپریشن" بنے گا؟ ہمیں سب بھولے سہتی یاد آگئے۔

اس روز کے بعد ہم نے کچھ کام کیے..... گھر جا کر ڈائری جلائی اور جاسوس کا خوف دل و دماغ سے نکال کر معاملات کو معقولیت سے دیکھا۔ وہ یوں کہ اللہ کی محبت اور ناراضی کی کسوٹی پر زندگی کے فیصلے کرنے لگے۔ اس طرح بقول میر "اب کی نہ تم نے عقل مندوں والی بات!" بیگم بھی بے حد خوش ہیں کہ بالآخر ان کی محنت رنگ لے ہی آئی۔ اب ہم بڈیوں کے پنجرے سے نکل کر خاصے صحت مند ہو چکے۔

بلا کر نہایت جاہلانہ اور جارحانہ انداز سے حکم صادر کیا "اگر اب تو نے سرکاری رخصت کے علاوہ ایک بھی چھٹی کی تو تیری ہمیشہ کے لیے چھٹی۔"

اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ہمیں یقین ہے کہ رفیق نے دفتر میں آگ کی طرح خیر پھیلا دی ہوگی "صاحب کا دماغ الٹ گیا ہے۔" لہذا اس روز دفتری عملہ ہمارے ساتھ کافی محتاط رہا۔

ہم نے گھر پہنچ کر دیکھا کہ بڑا لڑکا درمیانے سے دھینگا مشتی کر رہا ہے۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ پکڑ کر دونوں کو ایک ایک ہاتھ جڑ دیا۔ ساتھ ہی دھاڑ کر بیگم کو پکارا۔ وہ دہل کر بھاگی آئیں کہ یہ کون غنڈا گھر میں گھس آیا؟ کیونکہ ہماری اونچی آواز تو درود پوچھ رہی نہیں پہچانتے تھے وہ تو الگ رہیں۔ مگر ہمارے سخت تہور دیکھ کر پہلے تو حیران ہوئیں پھر پریشان۔ جب کہ بچے الگ منہ میں انگلی دہائے کھڑے تھے۔

ہم نے اپنی پست بہت کو پھر جمع کیا اور چلائے "یہ گھر ہے یا قمار خانہ! جب دیکھو ہنگامہ! جب آؤ فساد۔ خبردار اب آواز بھی نہ سنوں۔" یہ کہہ کر پھر بیٹھنے کمرے کا رخ کیا اور ڈائری کھول کر دن بھر کی روداد لکھ ڈالی۔ آخر میں لکھا کہ رفیق کی اصلاح اور پیشہ دارانہ اصول پسندی کی وجہ سے اس کے ساتھ سخت رویہ اختیار کیا۔ جب کہ بچوں کی تربیت اور گھر کے سکون کے لیے کبھی کبھی جارحانہ انداز اپنانا ضروری ہے۔

بات یہیں تک رہتی تو ٹھیک تھا مگر ہمارا دن بدن یہ حال ہوا کہ جیسے شیر کے منہ خون لگ گیا۔ ضروری سختی دھیرے دھیرے تنگ مزاجی اور اصول پسندی خود پسندی میں بدلنے لگی۔ رویے میں لپک نہ رہی اور وہ

تفصیل لکھے گا۔ مگر لاکھوں ہم تم جیسے لوگ ایک جملے میں سما جائیں گے۔ "عوام خوشحال تھی" یا "بد حال" یا "بے زار تھی، وغیرہ وغیرہ۔"

ہم کچھ کچھ قائل تو ہوئے پھر بھی مدت پرانی سوچ ایک دم تبدیل کب ہو سکتی ہے! لہذا مننا کر بولے "مگر..... مگر..... میر....."

یہاں میر نے ہمیں مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ بولے "ٹھیک ہے..... اس کا حل سوچتے ہیں..... تم..... تم یہ کہو کہ روزانہ ڈائری لکھا کرو۔"

ہم نے غبی سنے کی طرح سوچے بغیر پوچھا "اس سے کیا ہوگا؟" میر ذرا جھنجھلائے پھر بولے "ارے بندہ خدا! تاریخ پر گہری نظر رکھتے ہو، پھر بھی مجھ سے پوچھ رہے ہو؟ دیکھو اگر تمہارے خدشے کے مطابق تم کچھ بن گئے اور تاریخ دان نے تم پر اپنا "قلم" صاف کرنا چاہا تو اسے دو تین سو سال پہلے کی معلومات لینے کے لیے ظاہر ہے تمہارے لواحقین، دفتر والے اور دیگر متعلقہ افراد تو ملیں گے نہیں۔ جو مشہور روایات سینہ بہ سینہ چلی جا رہی ہوں گی، ان کے مقابلے میں دستاویزی ثبوت زیادہ قابل اعتماد لگے گا۔ چنانچہ تمہاری لکھی ڈائری ان کے لیے نعمت سے کم نہیں ہوگی۔ بس تم یہ کرنا کہ وصیت کر جانا، تمہاری اولاد ہر صورت یہ ورثہ (ڈائری) اگلی نسل کو منتقل کرتی رہے اور یہ سلسلہ نہ رکٹے پائے۔ ٹھیک ہے؟"

انہوں نے بے صبری سے میری تائید چاہی۔ بات دل کو لگتی کہہ دی تھی اس لیے میں نے میر کا ہاتھ چوم لیا۔

بس پھر کیا تھا، ہم نے اگلے ہی روز رفیق کی چھٹی والی درخواست گولا بنا روئی کی نوکری میں پھینکی اور اسے

نبی کریم ﷺ اور اہل بیت کے لیے کھجور کے پکھے بناتے اور اپنے ہاتھوں سے آقائے دو عالم سرور عالم ﷺ کو مسجد نبوی میں پکھا جھلا کرتے۔

اس پھل کے طبی اوصاف و فوائد قابل ذکر ہیں۔ طبیب مشرق، مولانا حافظ حکیم عبداللہ جہانیاں والے اس پھل پر مستقل کتابچے لکھ چکے۔ اس پھل میں رزاق حقیقی نے تغذیہ (Nutrition) کی بھرپور خصوصیات رکھی ہیں۔ پناہ چہ یہ اعلیٰ درجے کی غذائی خوبیوں کا حامل پھل ہے۔

شجر کھجور کی تکریم کا لحاظ کرتے ہوئے

سعودی حکمرانوں نے اپنے قومی جھنڈے پر بھی اس نفل حسین کا نقش

جمایا۔ اس پھل کے فوائد بیان کرتے دل

نہیں بھرتا۔ یہ جزو غذا بن

جائے تو انسانی بدن کی حرارت عزیز

کے استحکام سے تمام جسمانی قوتیں نشوونما پاتی ہیں۔ اس طرح ہر عضو اپنے قدرتی افعال کی انجام دہی بخوبی کرتا اور عوارج سے محفوظ رہتا ہے۔

ایک حالیہ تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ عجمہ سلطان (کینسر) میں شافی ہے۔ یہ کھجور کھانے والوں کے جسمانی اعضا میں سوجن پیدا ہونے کا امکان نہیں رہتا۔ کھجور میں پانی برائے نام ہوتا ہے۔ سوکھ جانے پر بھی اس کے وزن اور خصوصیات میں خاص فرق نہیں پڑتا۔ تاہم خشک کھجور میں وٹامن سی کچھ کم ہوتا ہے۔ پانچ

شک ”عجمہ“ جنت کے پھلوں میں سے ایک پھل ہے۔“ صحیح مسلم میں آیا ہے ”جو اپنے دن کی ابتدا عجمہ کی سات کھجوریں کھا کر کرے، وہ زہر اور سحر کے اثر سے دن بھر محفوظ رہے گا۔“

صدیوں سے مدینہ منورہ کی اصل سوغات کھجور چلی آ رہی ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ کے عہد میں منست میں مشہور خرمہ العجمہ، لون اور برنی تصور کی جاتی تھیں۔ آج بھی کھجور عجمہ ہی مدینہ مبارک کا خاص تختہ ہے۔ دیگر اقسام میں الہدی، حلوہ، شلانی (بغیر گھٹلی کے جو نفل کے نام سے بھی مشہور ہے) میردم، انیس،

الرابہ، البرنی، الصغوی، الرومانہ اور العنبر بعد شوق کھائی جاتی ہیں۔

مدینہ طیبہ کی کھجور منڈی میں کم و بیش ڈیڑھ سو اقسام کی کھجوریں ملتی ہیں۔ ان میں اعنبر سب سے زیادہ مہنگی ہے۔ ماضی میں کھجور اقتصاد مدینہ میں ریزہ کی ہڈی سمجھی جاتی۔ اہل مدینہ اس کے بیج، تنے اور ڈالیاں تک استعمال میں لاتے۔ پتوں سے کئی گھریلو اشیاء مثلاً پنائیاں، دتی پکھے، چھوٹے ڈبے، چھابے اور چنگیریں وغیرہ تیار ہوتی۔

کھجور کے تنے اور پتوں سے ایسی اشیاء ابتدا غلام بنایا کرتے تھے۔ اب فراوی قوت باہر سے منگوائی جاتی ہے۔ حضرت سلمان فارسی جو پہلے یہود کے غلام رہ چکے تھے، ہاتھ کے پکھے بنانے میں اپنا شافی نہیں رکھتے تھے۔

کھجور کے تنے اور پتوں سے ایسی اشیاء ابتدا غلام بنایا کرتے تھے۔ اب فراوی قوت باہر سے منگوائی جاتی ہے۔ حضرت سلمان فارسی جو پہلے یہود کے غلام رہ چکے تھے، ہاتھ کے پکھے بنانے میں اپنا شافی نہیں رکھتے تھے۔

غذائیات

قلیل مقدار بھی اس تواضع میں شامل ہوتی۔ صاحب حیثیت شیوخ کے ہاں کھجور کی مختلف انواع زینت دسترخوان بنتی۔ ہر سیاح اور مہمان بھی کھجور کی طلب اور شوق سے دل کو معمور پاتا۔

سرزمین مملکت سعودیہ کھجور کی



جنت کے پھلوں میں سے ایک

کجھور

انسان کو سرطان، قبض، عفونت اور سوجن سے محفوظ رکھنے والا مقدس میوہ

دانش یار

کیلا، انجیر، زیتون، انار اور دیگر میوہ

جات کا قرآن کریم میں تذکرہ پڑھتے مومن کا دل سرور ہوتا لیکن کھجور کا

تصور شیرینی اور خوشبو کی عجب دنیا میں لے جاتا ہے۔ عربی زبان میں اسے ”نفل“ کہتے ہیں۔

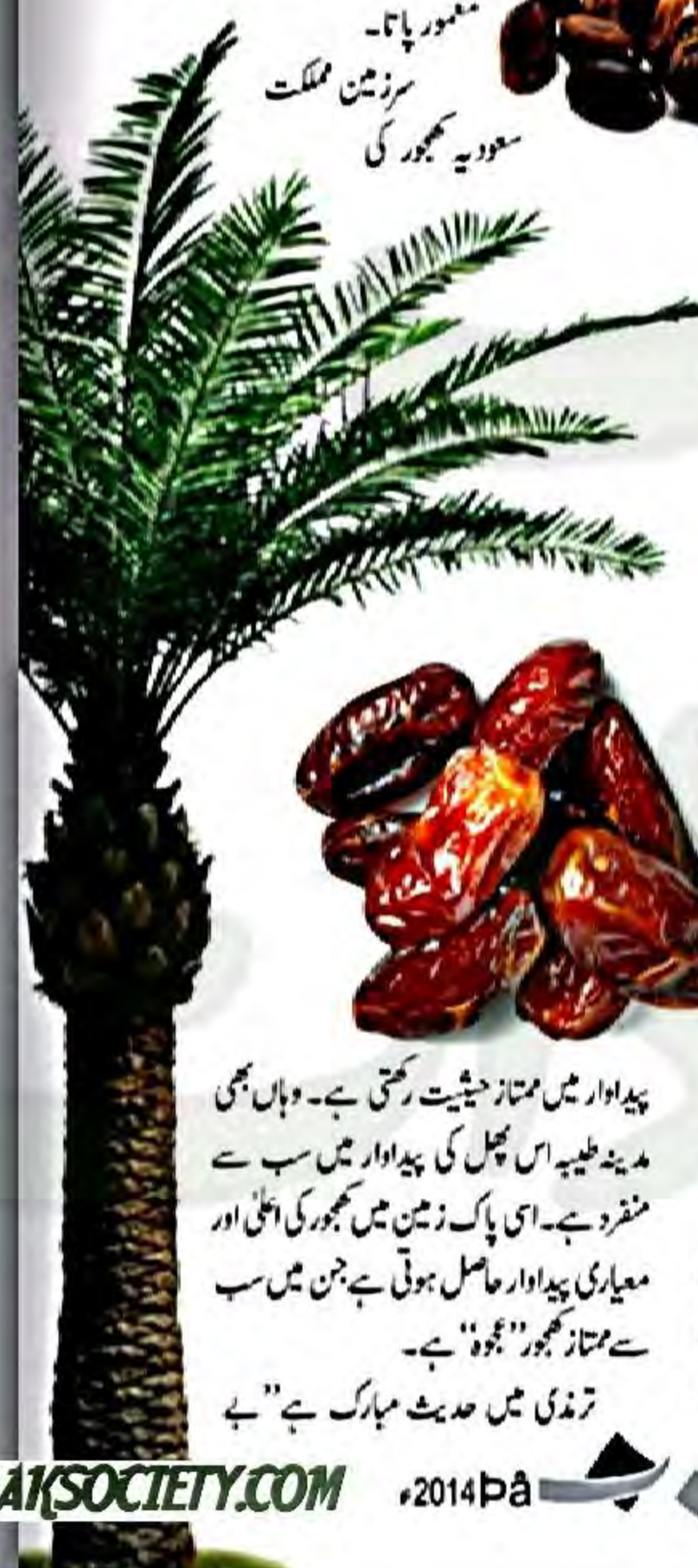
”نخلستان“ کھجوروں کا باغ کہلاتا ہے۔ خیال ہے کہ طور پر جہاں حضرت موسیٰ کو انوار الہی دکھائی دیے، ان کا نظور بھی کھجور کے درخت سے ہوا تھا۔

ماضی کے تھمروں کے سے دیکھیں تو اہل عرب کی روایتی مہمان نوازی کا آغاز کھجور اور عربی قبوے کی چھوٹی پیالی سے ہوا۔ بلکی آج پر نیم پخت لوبیا کے دانوں کی



پیداوار میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ وہاں بھی مدینہ طیبہ اس پھل کی پیداوار میں سب سے منفرد ہے۔ اسی پاک زمین میں کھجور کی اعلیٰ اور معیاری پیداوار حاصل ہوتی ہے جن میں سب سے ممتاز کھجور ”عجمہ“ ہے۔

ترذی میں حدیث مبارک ہے ”بے



کھیل کھلاڑی

محمد اوزل نے ترکی کے ایک چھوٹے سے گاؤں، ہیروفلو میں جنم لیا۔ اس کا باپ معمولی کسان تھا۔ جب محمد اوزل نوجوان ہوا، تو وہ بھی مقامی جاگیردار کی زمین پر کام کرنے لگا۔ مگر وہ اپنی کسپہری اور غربت کی زندگی سے خوش نہ تھا۔

دنیا بے فٹ بال کا مسلمان ہیرو

مسعود اوزل

ترک نژاد جرمن کھلاڑی جس نے اپنے شاندار کھیل ہی نہیں انسان دوستی کی بدولت بھی لاکھوں غیر مسلموں کے دل جیت لیے

بادی علی



ایک دن تعلیم یافتہ دوست کی زبانی اسے معلوم ہوا کہ جرمن حکومت کو کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی ضرورت ہے۔ محمد اوزل نے بھی یہ تو سہ دوست جرمن سفارت خانے کو درخواست دے ڈالی۔ یہ ۱۹۶۹ء کی بات ہے۔

اس زمانے میں بعد از دوسری جنگ عظیم جرمنی تعمیر و ترقی کے مراحل طے کر رہا تھا۔ ملک میں افرادی قوت کی کمی تھی اس لیے جرمن حکومت نے خصوصاً ترکی سے ہزار ہا مزدور و کارکن بلوائے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ماضی میں ترکی جرمن حکومتوں کا حلیف رہا تھا۔

محمد اوزل کی درخواست ویزا منظور ہوئی اور یوں وہ ۱۹۷۱ء میں جرمنی آ پہنچا۔ اسے دھاتیں بنانے والے

قرآن پاک کی باتیں

☆ تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے، کیا تمہارے اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا؟ دیکھو تم خود اس سے گھبن کھاتے ہو۔ (المحجرات)

☆ آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو بُرے القاب سے یاد کرو۔ (المحجرات)

☆ مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں، اپنے دو بھائیوں میں صلح کرادیا کرو اور خدا سے ڈرتے رہا کرو تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔ (المحجرات)

☆ اللہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اور فخر جتاتے ہیں، جو خود بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بخل پر اکساتے ہیں۔ (الحدید)

(اشرف سکندر، ادا کاڑھ)

رطوبتوں کے لیے قدرت کا عطیہ ہے۔ یہی عنصر بدن میں پیدا ہو کر دورہ دل روکنے کے لیے ذہال بن جاتا ہے۔ کھجور کھانے سے حیاتین بی اور کے انجماد خون روک دیتے ہیں۔ یہ خاصیت خطہ عرب کی آب و ہوا میں پلنے والی کھجوروں میں سب سے زیادہ پائی جاتی ہیں۔

کھجور نشوونما کے دوران مختلف مراحل سے گزرتی ہے۔ ابتدا میں اس کا رنگ زرد ہوتا ہے۔ اسے "خلل" کہتے ہیں۔ چند دن بعد ہی پھل ہلکا سیاہ رنگ ہو جاتا ہے۔ یہ "مناصف" کہلاتا ہے۔ چند نفعے بعد کھجور کا دانہ مکمل طور پر پک کر سیاہ ہو جاتا ہے۔ تب یہ "تمر" کہلاتی ہے۔ تمام حالتوں میں کھجور کا ذائقہ مختلف ہوتا ہے۔

سات کھجوریں کھانے سے بیس حرارے حاصل ہوتے ہیں۔ اس میں نشاستہ، ریشہ دار اجزاء، پوناشیم، کبلیشیم اور فولاد کے ساتھ دیگر معدنی اور حیاتین بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ انسانی جسم کی نشوونما اور قوت مدافعت بڑھانے میں جادو اثر ثابت ہوئے ہیں۔

تازہ کھجور میں پھلوں کی شکر اور گلوکوز ملتے ہیں۔ ان سے بدن کی صرف شدہ توانائی فوری بحال ہوتی ہے۔ اسی باعث وقت انتظار کھجور قدیم زمانے سے کھائی جا رہی ہے۔ کھجور قبض کشا ہے۔ شامل خوراک ہو کر آنتوں میں جمع ہو جانے والے فضلات کو زیادہ دیر تک ٹھہرنے نہیں دیتی۔ اگر قبض رفع نہ ہو تو سرطان کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ اس کے نامیاتی اجزاء مختلف جسمانی حصوں کو نقصان دہ جراثیموں سے بچاتے ہیں۔ اندر ہی اندر خون رسنے سے روکتے ہیں۔ یہی تکلیف بڑھ کر خونی ہوا سیر کی شکل بھی اختیار کر سکتی ہے۔

کھجور و نامن اے کا بھر پور خزانہ ہے۔ یہ بدن میں عمل کشید کو روکتی ہے۔ جلد کے نیچے واقع حصوں میں چپچپے مادے کو موزوں و مناسب رکھنے میں کھجور کا کردار طبیبیوں کو مطمئن رکھتا ہے۔ یہ نظر کی کمزوری کو قریب نہیں آنے دیتی۔ منہ، نچلے اور پھیپھڑوں کے سرطان سے بھی محفوظ رکھتی ہے۔ بدن میں عفونت اور گلنے سڑنے کا عمل ختم کرنے میں کھجور کسی نعمت سے کم نہیں۔ خون صالح اور سرخ خلیات کی افزائش اس جنتی میوہ کا ایک اور فائدہ ہے۔

اس میں موجود فولاد کمی خون کا ازالہ کرتا ہے۔ اسی سے خون کے ذروں تک آکسیجن کا سفر بہ سہولت ہونے لگتا ہے۔ یہ افشار خون اور دل کی دھڑکن کو معتدل رکھتی ہے۔ کھجور میں موجود پوناشیم خلیات بدن اور مفید

اوزل ان برازیلی بچوں کے ساتھ
جن کا وہ علاج کر رہا ہے



۱۰۸ میچ کھیلے اور ۱۶ گول کیے۔ فٹ بال سے عدم
واقفیت رکھنے والے تعجب کرتے ہوئے کہیں گے:
"ارے اتنے کم گول؟"

دراصل ایک فٹ بال میچ میں اس کھلاڑی کی بھی
بہت اہمیت ہوتی ہے جس کے پاس پر گول ہو۔
چنانچہ ورور برمن کی طرف سے کھیلتے ہوئے مسعود
کے "۵۵ پاسوں" پر گول بنائے گئے۔ یہ حقیقت بتاتی
ہے کہ مسعود نے بیشتر میچوں میں عمدہ کھیل پیش کیا اور
عام و خاص سے داد پائی۔

فروری ۲۰۰۹ء میں مسعود کے تاج میں ایک اور
کلفی لگی جب اسے جرمن قومی ٹیم میں شامل کر لیا گیا۔
اسی سال ماہ ستمبر میں اس نے جنوبی افریقن ٹیم کے
خلاف کھیلتے ہوئے اپنا پہلا بین الاقوامی گول کیا۔

جون ۲۰۱۰ء میں جب فٹ بال عالمی کپ کا سے

بہترین کھیل نے مسعود کو جرمنی بھر میں مشہور کر
دیا۔ حتیٰ کہ ہر قومی فٹ بال کلب یہ خواہش کرنے لگا
کہ مسعود اس کی ٹیم میں شامل ہو جائے۔ یوں ایک
معمولی ترک مزدور کا پوتا لاکھوں جرمنوں کا پسندیدہ
کھلاڑی بن گیا۔ سچ ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے کہ وہ
کسی کو عزت دیں یا ذلت!

جنوری ۲۰۰۸ء میں مسعود ممتاز جرمن فٹ بال
کلب، ورور برمن (Werder Bremen) کی ٹیم کا
حصہ بن گیا۔ وہاں اس کی سالانہ فیس ۵ لاکھ یورو (تیس
کرور روپے سے زائد) مقرر ہوئی۔ یہ اچھی خاصی رقم
تھی۔ یوں اسے موقع ملا کہ وہ روزمرہ اخراجات سے
بے نیاز ہو کے اپنے کھیل پر توجہ دے سکے۔

مسعود اگست ۲۰۱۰ء تک ورور برمن کا حصہ رہا۔
اسی دوران مسعود اوزل نے کلب کی جانب سے

بچپن ہی سے مسعود ذہین، چست و چالاک اور
اسٹارٹ لڑکا تھا۔ چونکہ فٹ بال دو خصوصیات ذہانت
اور چستی مانگتا ہے لہذا مسعود اس کھیل سے بہت جلد ہم
آہنگ ہو گیا۔ اسے شطرنج کا کھیل بھی پسند تھا، مگر فٹ
بال ہی اس کا پہلا عشق ٹھہرا۔

مصطفیٰ کی آمدن زیادہ نہ تھی، مگر وہ چہیتے بیٹے کی
ہر خواہش پوری کرتا۔ اسی لیے مسعود کی پرورش ناز و نعم
سے ہوئی۔ تاہم لاف پیار نے اس کا دماغ خراب نہیں کیا
اور وہ منکسر المزاج نوجوان بن کر پروان چڑھا۔

مسعود نے اپنے خوبصورت کھیل سے جلد ہی
مقامی ٹیموں پر اپنی دہشت بٹھا دی۔ وہ دبلا پتلا تھا
لیکن ۲۵ میٹر دور تک کک مار کر گیند پہنچا دیتا۔ بھاگنے
کی رفتار بھی ہم عمر کھلاڑیوں سے زیادہ تھی۔ چنانچہ
جلد ہی شیر کے بہترین کلب، شیفران نے اس کی
خدمات حاصل کر لیں۔ یہ مسعود کی ترقی و کامرانی کے
سفر کا پہلا زینہ تھا۔

جرمنی اور سبھی یورپی ممالک میں فٹ بال کلبوں کو
معیاری کھیل کے حساب سے تقسیم کیا جاتا ہے۔
چنانچہ جوں جوں مسعود کا کھیل بہتر ہوا، اس کی
صلاحیتیں نکھری سنوری، وہ ایک سے اگلے معیاری کلب
میں منتقل ہوتا رہا۔

مسعود ڈیفینڈر ہے یعنی وہ دوران کھیل وسط میدان
میں کھڑا ہوتا ہے۔ یہ کھلاڑی مخالف پر حملے کرنے کے
علاوہ دفاع بھی کرتا ہے۔ اسی لیے ڈیفینڈر کے کاندھوں
میں خاصی بھاری ذمے داری ہوتی ہے۔ بعض ڈیفینڈر
بڑھ چڑھ کر حریف پر دھاوا بولتے ہیں۔ مسعود اوزل
بھی ایسا ہی کھلاڑی ہے۔ اور اسی خصوصیت نے اسے
ممتاز بھی بنا دیا۔

ایک کارخانے میں ملازمت ملی۔ وہ مختلی اور دیانت دار
تھا۔ اسلامی تعلیمات سے قربت رکھتا اور باقاعدگی سے
نماز پڑھتا تھا۔ مذہب سے شغف ہی نے اسے بے
داغ کردار کا مالک بنایا۔

محنت اور جدوجہد رنگ لائی اور محمد اوزل کے
حالات بدلنے لگے۔ رقم جمع کر کے اس نے قریبی شہر،
گلن کرشن (Gielsenkirchen) میں ایک فلیٹ خرید
لیا۔ تب تک وہ جرمن شہری بھی بن چکا تھا۔

جب محمد اوزل جرمنی پہنچا، تو اس کے اکلوتے بیٹے،
مصطفیٰ کی عمر صرف دو سال تھی۔ اس نے بیٹے کو تعلیم
دلائی اور یوں اسے جرمن معاشرے میں باعزت مقام
پانے میں مدد دی۔ مگر ابھی اللہ تعالیٰ نے پاک طینت
اور متقی محمد اوزل کو مزید نعمتوں سے نوازا تھا۔

جب مصطفیٰ اوزل نوجوان ہوا، تو اس نے گھر
کے قریب ہی ترکش ریستوران کھول لیا۔ ریستوران
چل پڑا اور یوں وہ بہت جلد اپنے پیروں پر کھڑا ہو
گیا۔ اسی لیے باپ نے جلد ہی بیٹے کی شادی بھی
کر ڈالی۔ اس کی دلہن گلزار مقامی ترک خاندان سے
تعلق رکھتی تھی۔

۱۵ اکتوبر ۱۹۸۸ء کی شب رب کائنات نے ترک
نوجوان جوڑے کو ایک بیٹے سے نوازا جس کا نام مسعود
رکھا گیا۔ تب کسی کو خبر نہ تھی کہ یہ بچے آگے چل کر دنیا کے
فٹ بال میں ستارہ بن کے چمکے گا۔

مسعود اوزل کی خوش قسمتی یہ تھی کہ دادا اور والد،
دونوں فٹ بال کھیل کے عاشق تھے۔ انھوں نے تہنہ کر
لیا کہ وہ مسعود کو عمدہ فٹ بالر بنائیں گے۔ چنانچہ وہ
صرف سات برس کا تھا کہ باپ اور دادا دونوں اسے
فٹ بال کھیلنا سکھانے لگے۔

سندهی کہانی

کے سر جھکے ہوئے اور چہروں پر مصنوعی لوگوں دکھ کے ماسک چڑھے تھے۔ یہ سب ایک جنازے کے پیچھے قبرستان جا رہے تھے۔ ایک نے کہا ”مرحوم بہت ہی اچھا آدمی تھا، بس نکھ اور لوگوں سے پیار کرنے والا.....“

دوسرا بولا ”بھائی! زندگی پر تو کوئی اعتبار ہی نہیں..... ابھی عمر ہی کیا تھی اس بچارے کی.....!“

تیسرے نے منہ کھولا ”بس! موت بتا کر نہیں آتی..... اس کے جانے کا وقت ابھی نہیں آیا تھا۔“

چوتھے نے کہا ”عزرائیل کے آنے کا کوئی وقت مقرر نہیں بھائی! ابھی کل کی بات ہے۔ وہ میری دکان پر سو اسلف لینے آیا تھا اور آج بچارہ چل بسا۔“

پانچواں بولنے لگا ’موت تو برحق ہے۔ مگر یہ ہمیں یاد ہی نہیں رہتی..... اگر یاد ہو تو پھر یہ نظریں جنم نہ لے سکیں۔“

جو لبوں تک نہ آسکی

دل کی بات

ایک جنازے میں جمع انسانوں کا فسانہ،

ان کے لبوں کی باتیں اندرونی

سوچوں سے بالکل مختلف تھیں

غلام مصطفیٰ سولگی



۲۰۱۳ء کا سال مسعود کے لیے دو بڑی خوشیاں لایا۔ اول آرسنیل دنیا کا قدیم ترین فٹ بال ٹورنامنٹ، ایف اے کپ جیتنے میں کامیاب رہا۔ دوم وہ اس جرمن قومی ٹیم میں شامل تھا جس نے عالمی کپ جیتا۔ مسعود نے اپنے عمدہ کھیل کا تسلسل برقرار رکھا اور اپنی نیوں کو عروج تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔

کھلاڑی کی ذاتی خصوصیات

دین دار ترک گھرانے سے تعلق رکھنے کے باعث مسعود اسلامی تعلیمات سے آگاہ ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر بیچ سے قبل نماز ادا کرتا اور قرآنی دعا پڑھتا ہے۔ وہ اپنی کامیابیوں کو اللہ تعالیٰ ہی کا کرم قرار دیتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کی مدد فرمائیں کامیابی و کامرانی اسی کے قدم چومتی ہے۔

ایک اچھے مسلمان کی طرح وہ رحم دل، سخی اور درد مند انسان ہے۔ ان خوبیوں کا مظاہرہ حال ہی میں عالمی کپ کے دوران دیکھنے کو ملا۔ ورلڈ کپ سے قبل مسعود اوزل نے اعلان کیا تھا کہ وہ برازیل میں سرطان (کینسر) کے مریض گیارہ غریب بچوں کا علاج کرائے گا۔ بعد ازاں جب جرمنی فاتح بنا، تو اس نے یہ تعداد گنی کر دی۔

گویا اب موت کی سرحد پر کھڑے ۲۲ غریب برازیلی بچوں کو نئی زندگی مل جائے گی۔ مسعود اوزل ویسے بھی جسمانی بھلائی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا اور انسانیت کی تعمیر و ترقی میں اپنا حصہ ڈالتا ہے۔ مشہور امریکی مدیر، ایرہام لگن نے ایک بار کہا تھا: ”آپ جو بھی ہیں، نیک اور اچھا بننے کی کوشش کیجیے۔“

آیا، تو بہترین کارکردگی کی بنا پر مسعود اوزل کو جرمن قومی ٹیم میں شامل کر لیا گیا۔ یہ عالمی کپ جنوبی افریقا میں منعقد ہوا۔ ارجنٹائن کے خلاف پہلے بیچ میں اس کے ایک خوبصورت پاس پر گول بنا۔ دیگر میچوں میں اس نے عمدہ کھیل دکھایا۔ چنانچہ عالمی کپ ختم ہوا، تو مسعود ان دس بہترین کھلاڑیوں میں شامل تھا جنہیں ”سنہرے بال“ (Golden Ball) کے اعزاز سے نوازا گیا۔

اب تو چوٹی کے فٹ بال کلب..... رئیل میڈرڈ، ہارسلونا اور آرسنیل سعی کرنے لگے کہ یہ ابھرتا ترک نژاد جرمن فٹ بالر ان کی چھتری تلے آجائے۔ آخر کار مسعود نے رئیل میڈرڈ میں جانے کا فیصلہ کیا جو دنیا کا بہترین فٹ بال کلب سمجھا جاتا ہے۔ یہ اگست ۲۰۱۰ء کی بات ہے۔

رئیل میڈرڈ میں بھی مسعود کی کامیابیوں کا سفر جاری رہا۔ اس کے عمدہ کھیل کا راز ”ڈربنگ“ میں پوشیدہ ہے۔ مسعود اتنے خوبصورت انداز میں کھلاڑیوں کو شپ دیتا ہے کہ وہ اس سے گیند چھین نہیں پاتے۔ دوسرے مسعود اگلے کھلاڑیوں کو نہایت عمدہ پاس دیتا ہے۔ یوں گول کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ دنیا بھر کے مشہور کھلاڑی مثلاً وائن رونی، میس، رونالدو وغیرہ انہی خوبیوں کی بنا پر اس کے رطب اللسان رہتے ہیں۔

ستمبر ۲۰۱۳ء میں مسعود مشہور برطانوی فٹ بال کلب، آرسنیل سے وابستہ ہو گیا۔ اب وہ ستمبر ۲۰۱۸ء تک اسی کلب میں کھیلے گا۔ پانچ سال کے دوران اسے ۳۲۰۲ کروڑ پونڈ (تقریباً سات ارب روپے) بطور معاوضہ ملیں گے۔

عبرت نامہ

ضمیر کی کسک کا مارا بول اٹھا

میں بزدل
نہیں ہوںخود فراموشی کی ردا اتار کر ہوش میں
آنے والے ایک باشعور کی سبق آموز کہانی

احسان بن مجید



سائیکل کی رفتار سے کہیں زیادہ تیز زندگی ہے۔۔۔۔۔ اس نے یہ سوچ کر گاڑی کے بریک پیڈل سے پاؤں بنایا اور کار کی رفتار بڑھا دی۔ آئینے میں اسے سائیکل سوار گاڑی کی ٹھوکر سے قلابازیاں کھاتا نظر آیا، اس کی پیشانی سے بہتا خون اور تباہ شدہ سائیکل بھی۔

ہر چند وہ رک کر ڈٹی کو اٹھانا چاہتا تھا۔ اسے اسپتال پہنچانے کی ذمہ داری اپنے سر لیتا، اسے نیا سائیکل بھی لے کر دے دیتا لیکن اس نے سوچا، گاڑی سے باہر آتے ہی وہ مشتعل ہجوم کے دھار میں ہو گا۔ وہ لوگ یہ نہیں دیکھیں گے گاڑی کا کتنا نقصان ہوا ہے بلکہ مغلظات بکتے ہوئے اس پر کھوں، گھونسوں اور لاتوں کی بارش کر دیں گے۔ اس توابع کے بعد پھر گاڑی کی خبر لیں گے۔ ڈٹی وہیں پڑا رہے گا اور وہ سب ایک ایک کر کے کھسک جائیں گے۔

وہ ایک کاروباری تھا اور کاروبار میں مندرے کا قائل لیکن غفلت اس کے نزدیک گھنیا عمل تھا جس کا وہ خود کبھی مرتکب ہوا نہ عملے کو ہونے دیا۔ پچھلے چند ماہ سے مانی گارمنٹس کی مصنوعات مندرے کا شکار تھیں جس کی شکایت اس کا

مکہ اور جیوا

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدت آدم تفریق، ملل حکمتِ افریق کا مقصود اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم ملے نے دیا خاک جیوا کو یہ پیغام جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم! (علامہ محمد اقبال)

وی بھی ہونا تھا۔ لیکن اب ممکن ہی نہیں۔ میرے پسندیدہ ذراے کی آج آخری قسط چلنی تھی۔ ایک زبردست فلم بھی آنا تھی۔ سارا مزد خارت ہو گیا۔ اب تو سارا دن قبرستان میں ضائع ہو گا۔

مسٹر "ق" سوچنے لگا "کل بھی دکان بند تھی اور آج تو بند ہی رہے گی۔ دو تین ہزار روپے کا تو نقصان ہونی جائے گا۔ اس بد بخت کے لیے عزرائیل کو بھی آج ہی آنا تھا۔"

مسٹر "خ" سوچتا ہے "آج کلب میں سول بیج کے اعزاز میں منعقدہ الوداعی پارٹی میں جانا تھا۔ سارا پروگرام تباہ ہو گیا۔ کل مرنا تو کون سا آسان پھٹ جاتا۔ اب تو تین دن برباد ہو گئے۔"

مسٹر "غ" نے سوچا "اب تو بیٹے کی شادی کی تاریخ بھی بدنی پڑے گی اور تو کوئی چارہ ہی نہیں۔۔۔۔۔ اب تو دو ذھائی ماہ تک اس معاملے پر سوچنا ہی فضول ہے۔۔۔۔۔ بیٹے کی شادی کے بعد مرنا تو کیا ہی اچھا ہوتا۔۔۔۔۔ سارے انتظامات دھرے کے دھرے رہ گئے۔"

سب لوگوں کے سر جھکے ہوئے تھے۔ سوچوں میں اکثر لوگوں کی اجتماعی رائے یہ تھی: "مرحوم بڑا ذلیل اور ناہنجار شخص تھا۔"

مجھے نے چشمہ صاف کرتے ہوئے بات کی "زندگی کا کیا اعتبار بھائی! ایک دن ہمیں بھی جانا ہے۔ کون یہاں ہمیشہ رہے گا؟"

مرحوم کے بارے میں سب لوگوں کی اجتماعی رائے تھی: "بہت اچھا اور نیک آدمی تھا۔"

لیکن اسی وقت مسٹر "م" سوچ رہا تھا: "آج تو میری چھٹی ہی ضائع ہو گئی۔۔۔۔۔ نہ ہی لیتا تو اچھا تھا، غلطی ہو گئی، آج اگر یہ نہ مرنا تو میں دس گیارہ بجے اٹھتا۔۔۔۔۔ ٹھیکیدار کے ہاں بھی جانا تھا۔ ان سے اپنا حصہ وصول کرنا تھا۔ یہ افرق کر دیا اس بد بخت نے۔۔۔۔۔ نالائق کہیں کا!"

مسٹر "ک" نے سوچا "ایک ہفتے بعد عید ہونے ہونے والی ہے۔ آج اس لیے دفتر سے چھٹی لی تھی کہ بچوں کو عید کی خریداری کراؤں گا۔ لیکن صبح صبح اس کی موت کی منٹوں خبر سن کر سارا موڈ تباہ ہو گیا۔۔۔۔۔ اس مردود کو آج ہی مرنا تھا۔ بیوی کا رشتہ دار تھا، اس لیے آنا لازمی ٹھہرا۔ ورنہ میں تو اسے گھاس بھی نہ ڈالتا۔"

مسٹر "ش" سوچ رہا تھا "آج شناختی کارڈ جمع کرانا تھا۔ سارا دن تو یہیں ضائع ہو جائے گا۔ دفتر بند ہونے سے پہلے شاید فارغ نہ ہو سکوں۔ مشکل سے جا کر معاملہ طے ہوا تھا پیسوں پر۔ جائز کام کے لیے بھی رشوت دینا پڑتی ہے۔ بس، کوئی پوچھنے والا جو نہیں۔ میں نہ ڈاکو ہوں اور نہ ہی کوئی بد معاش۔۔۔۔۔ سارا کھیل پیسوں کا ہے۔ آج تو بس کام ہونے ہی والا تھا لیکن یہ مکینہ چل بسا۔ سارا کام چوہنٹ ہو گیا۔"

مسٹر "ن" نے سوچا "آج "ط" کو میرے پاس آنا تھا۔ دوستوں سے کہلو کر اسے تیس ہزار پر راضی کیا تھا۔ کیا کریں، اگر یہاں نہ آتے تو لوگ شرمندہ کرتے۔"

مسٹر "ج" بھی اپنی سوچوں میں گم تھا: "آج تو ٹی

مارکیٹنگ فیجر کر چکا تھا۔ اچانک مصروفیات کے باعث وہ اس طرف متوجہ نہ ہو سکا لیکن بھولا بھی نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آج سہ پہر تین بجے اس نے اپنے مارکیٹنگ فیجر اور ڈیزائنر کو میٹنگ پر بلا لیا۔ بحث مندرے کی وجوہ پر ہوتی تھی۔ لیکن آدھ گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد یہ حادثہ پیش آ گیا جس نے اس کی سوچیں منتشر کر ڈالیں۔ ایک بار گھر واپس لوٹ جانے کا خیال آیا لیکن وہ یہ سوچ کر گاڑی چلاتا رہا کہ ان دو آدمیوں کا کیا قصور ہے جنہیں دفتر بلا رکھا ہے۔

تیار شدہ ملبوسات کا یہ دھندہ اس نے برسوں پہلے شروع کیا تھا۔ اس عرصے میں ہر قسم کے رنگ دیکھے..... کئی بار وہ منہ کے بل گرنے کو آیا لیکن ہر بار لگا جیسے ایک کندھا اسے سہارا دے کھڑا کر دیتا۔ کون اس کا مہربان تھا، یہ تو اسے بہت بعد میں معلوم ہوا لیکن جب بھید کھلا تو اس کی چھاتی خوشی سے پھینکنے لگی۔

سچ تو یہ ہے کہ اس نے کچھ کہے سنے بغیر اپنے من کا ماتھا چوم لیا اور کہا تھا، تو وہ تم ہو..... یہ سن کر کالج کھنک گئے۔ ایک چہرہ سرشار ہوا جب کہ دوسرے پر حیرتیں اتر آئیں۔ پتا نہیں کون سے جذبے کا ذوق تھا کہ جھگی نظروں سے زمین بھی گیلی ہو گئی۔ اس پر ممنونیت طاری ہوئی تو مقابل چہرے کی چٹکوں پر آئے موتیوں کو دونوں انگوٹھوں میں جذب کر ڈالا۔

گاڑی کھڑی کرنے کے بعد اس نے ہایاں نڈگاڑا دیکھا جو بیڑھا ہو چکا تھا۔ بونٹ پر بھی واضح خراشیں تھیں۔ آنے والے لمحوں کی تیاری کے لیے تانے ہانے بننا ذہن مصروف ہوا تو وہ چند منٹ کے واسطے کہیں نہیں تھا۔ جب حواس میں لوٹا تو مارکیٹنگ فیجر اور ڈیزائنر اس کے پاس کھڑے تھے۔

”کیا ہوا سر، خیریت تو ہے؟“ دونوں کے چہروں پر استعجاب تھا۔

”کچھ نہیں، گاڑی کی موفلانج کراؤ اور آدھے گھنٹے بعد آؤ۔“ یہ کہہ کر وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اپنے دفتر میں بیٹھا۔ تھوڑے سے وقت میں جہاں اس نے اور بہت کچھ سوچا، یہ خیال بھی آیا، کیوں نہ جولو اور عزیز سے مشورہ کر لیا جائے۔ اس کے تھے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے لیکن اندر بیٹھا انسان پھر بھی مطمئن نہیں تھا۔ اس کی انگلی تھامے جانے کہاں کہاں لیے بھٹکتا پھرا۔ آدھا گھنٹا آخر تیس منٹ ہی کا تو ہوتا ہے، بیت گیا اور پردے کے عقب سے جواں نمودار ہوا۔

”آؤ جواں بیٹھو!“ اس نے سامنے پڑی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

”عزیز نہیں آیا؟“ اس نے چھوٹے ہی جواں سے پوچھ لیا؟

”تم نے میرے منہ کی بات چھین لی یا مجھے کہتے ہوئے دیر ہوئی۔ دراصل چند منٹ پہلے عزیز کے گھر سے فون آیا تھا۔ اس کا بھائی ایک حادثہ میں شدید زخمی ہو گیا ہے۔ کوئی کار والا تھا جو اسے نکر مار کر بھاگ نکلا..... گھٹیا کہیں کا، کینہ، بزدل انسان، مرد ہوتا تو رکتا، چور ہو گا کوئی، گاڑی چوری کر کے بھاگا ہوا، چور کہاں رکتا ہے کوئی زخمی ہو یا مر جائے۔“

”تم اس کا ردالے کی جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟“

دونوں میں آپ جناب کا کلف اس لیے نہیں تھا کہ بچپن میں نات پر ساتھ بیٹھ کر پڑھے تھے۔ کئی ہارٹسے بھی تھے لیکن دوستی پر آج نہیں آئی۔ جب کبھی دونوں میں بچپنا لوٹ آتا تو سنجیدگی دور کھڑی مسکرانے لگتی۔

اس نے اچانک سوال کیا تو جواں کی بات درمیان میں یا کہیں آس پاس رک گئی، بولا ”میں کیا کرتا، فوراً

گاڑی روکتا، دوڑ کر زخمی کے پاس پہنچتا، اسے اٹھا، کپڑے بھارتا، معذرت کرتا اور اپنی گاڑی میں اسپتال مرہم پٹی کرانے لے جاتا۔ حسب توفیق اس کی مالی اعانت بھی کرتا اور جب تک وہ مکمل صحت یاب نہ ہوتا بلاناغہ عیادت کرنے جاتا.....“

”میں تمہیں عرصے سے جانتا ہوں جواں کہ تم کتنے بہادر اور سخی ہو۔ تقریر تو تم اس وقت بھی خوب کرتے تھے جب ضرورت نہ ہوتی!“ اس نے رستے سے جواں کی بات اچک لی۔

”اور اگر تم میری جگہ ہوتے تو یقیناً گاڑی بھاگ لے جاتے، زخمی کو لہو لہاں تر پتے ہوئے چھوڑ کر، کیونکہ تم آج بھی اتنے ہی بزدل ہو جتنے نو جوانی میں تھے۔ تم مشتعل ہجوم سے ڈرتے ہو۔“ یہ کہہ کر جواں کو جیسے سانپ سٹک گیا یا شاید کسی ایسے خیال نے اسے خاموش کر دیا جو ایک لمحہ پہلے اس کے ذہن میں اترا تھا۔ اس کی نظریں یکدم ٹیبلنگ ڈائریکٹر کی کرسی پر بیٹھے شخص کے چہرے سے ہٹ کر اپنی جھولی میں گر گئیں۔

”بولو جواں، میں تمہاری بات سن رہا ہوں!“ اس نے قدرے جھکا سر اٹھا کر جواں کی آنکھوں میں جھانکا۔

”نہیں سر، میں پتا نہیں کیوں بڑ بولا سا ہو گیا۔ مجھے افسوس ہے، میں نے وہ بھی کہہ دیا جو نہیں کہنا چاہیے تھا۔“ اس کے چہرے پر تاسف کی پر جھائیاں واضح تھیں۔

دفتر میں یوں خاموشی چھا گئی جیسے وہاں کوئی ذی روح نہ ہو۔ دونوں اپنی اپنی سوچ میں گم بیٹھے تھے۔ جواں پچھتاوے کی دلدل سے خود کو نکالنے کی سعی میں تھا۔ اس کے احسانات یکے بعد دیگرے جواں کے ذہن کی راہداری سے گزر رہے تھے۔ اس نے اپنے کل کو آج کے سامنے کھڑا کیا تو اسے خود سے کھن سی آنے لگی۔ وہ منظر اس کی

آنکھوں میں محوم گیا جب دونوں اچانک ملے تھے۔ اس نے پوچھ لیا ”آج کل کیا کر رہے ہو؟“

”فارغ ہوں اور سرزکیں تاپتا ہوں۔“ اس نے یہی جواب دیا تھا۔

”میرے پاس کیوں نہیں آئے؟“ اس کے لہجے میں دوستی والا رعب تھا۔

”تمہارے پاس؟ بس یونہی یارا“ اس سے کوئی بات نہ بن پائی۔

”صبح میرے پاس آؤ اور دیکھو ڈھنگ کا لباس پہن کر آنا۔“ دونوں نے اپنی راہ لی لیکن اس نے دیکھا کہ جواں کے چہرے پر اطمینان کی تازگی آگئی۔ پھر آج تک اس کا ہاتھ جواں کے کندھوں پی تھا۔

”گھٹیا کہیں کا، کینہ، بزدل انسان، مرد ہوتا تو رکتا، چور ہو گا کوئی، گاڑی چوری کر کے بھاگا ہوا، چور کہاں رکتا ہے؟ کوئی زخمی ہو یا مر جائے۔“ اس کے دماغ میں جواں کی باتوں کی ہازگشت گونج رہی تھی۔

”نہیں، میں ایسا ہرگز نہیں! وہ زیر لب بڑ بڑایا۔ اس کے چہرے پر پچھتاوے کی لہر آ کر گزر گئی۔ اسے اپنے اندر شکاف پڑتا دکھائی دیا۔

”جواں!“

”جی سر!“

”چلو عزیز کے بھائی کو دیکھ آئیں!“

”سرکل چلیں گے!“

”نہیں ابھی! دیکھو جواں میں گھٹیا نہیں ہوں، بزدل بھی نہیں اور نہ چور!“

”سرا آپ کیوں کہہ رہے ہیں؟“

”اس لیے کہ مجھے یقین ہے، عزیز کا بھائی میری ہی گاڑی سے نکل آیا تھا۔“

وقت باہر لگا آئے تاکہ طبیعت کا جو جھل پن اور مولا بخش کا خوف دور ہو سکے۔ ماسٹر جی کا گھر اسکول سے کافی دور تھا۔ میں بھی اس خیال سے مسرور تھا کہ چلو کچھ وقت تو ملا تازہ ہوا کھانے کو!

جب جماعت سے نکل آیا تو ماسٹر جی کو خیال آیا ”سامان استانی جی کو دینے کا طریقہ تو میں لڑکے کو بتایا نہیں یہ نہ ہو وہ پریشان ہو جائے۔“ چنانچہ چند منٹ بعد انھوں نے ایک اور لڑکے کو میرے پیچھے روانہ کر دیا کہ جاؤ اور سامان جس طریقے سے دیتے ہو، اسی طریقے سے دے آؤ۔ وہ نیا ہے، پریشان ہو گا۔ لڑکا بھی جماعت سے اٹکا اور میرے تعاقب میں روانہ ہو لیا۔

مجھے نکلے چند منٹ ہو چکے تھے، اس لیے لڑکا مجھے راستے میں نہ پکڑ سکا۔ میں مسجد والی گلی میں پہنچ گیا جہاں ماسٹر جی کا مکان تھا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ چند لمحوں تک خاموشی رہی۔ میں نے دوبارہ کھٹکھٹایا۔ چند لمحوں بعد قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کوئی دروازے کی جانب آ رہا تھا۔ آنے والا یا والی دروازے کے قریب رک گئی۔ قدموں کی چاپ ختم ہوئی۔

دروازے کے قریب ہی سینٹ کا گھرا بنا ہوا تھا۔ وہاں پانی کا نل لگا تھا۔ کسی نے پانی کا نلکا ڈنڈے سے تین بار بجایا۔ ڈر اور خاموشی رہی۔ ایک بار پھر نلکے پر ڈنڈے برسائے گئے۔ پھر وہی خاموشی۔ آنے والی بھی خاموش تھی، کوئی نسوانی آواز نہیں آئی۔

آخر میں نے آواز دی ”استانی جی! ماسٹر جی نے سامان بھیجا ہے لے لیں۔“

اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ ایک بار پھر ڈنڈے سے نلکے پر تین بار چوٹ ماری گئی۔ میری سمجھ مسئلہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ میں خاصا پریشان ہو گیا۔ ابھی کسی نتیجے پر نہیں

شریف کی بات سن کر میرے ماموں مسکرا کر رہ گئے۔ چھوٹے بچوں سے لے کر پانچویں جماعت کے طالب علموں تک کسی کو یہ اجازت نہ تھی کہ وہ ماسٹر جی کے مکان میں داخل ہوں۔ ماسٹر جی اگر کوئی چیز گھر بھیجتے تو بچے سے کہہ دیتے ”دروازہ کھٹکھٹانا۔ استانی جی دروازے پر آئیں گی۔ یہ سامان انھیں دے دینا۔“ استانی جی سامان لینے کا طریقہ جانتی تھیں۔ بچے جاتے اور باہر ہی سے سامان دے کر لوٹ آتے۔ مجھے بختس سا تھا کہ سامان لینے کے طریقے سے کیا مراد ہے؟ عام سا طریقہ تو میں بھی جانتا تھا کہ دروازے پر گئے۔ کھڑکی کھڑکائی، استانی جی باہر آئیں دروازہ کھولا سامان لیا اور پھر در بند۔“

میں دل میں سوچتا کہ یہی طریقہ ہو گا، کوئی نئی بات تو ہونے سے رہی۔ دل میں تمنا ضرور تھی کہ کبھی مجھے ماسٹر جی سامان دے کر گھر بھیجیں۔ میں بھی تو دیکھوں، بچوں کے ہاتھ سے سامان لینے کا استانی جی نے کیا طریقہ اپنا رکھا ہے۔

ایک روز میری مراد بر آئی۔ جماعت میں بیٹھے بچوں پر ماسٹر جی نے طائرانہ سی نظر ڈالی۔ پھر مجھے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ میں اٹھا اور ماسٹر جی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ قریب ہی ایک رومال میں کچھ سامان بندھا پڑا تھا۔ ماسٹر شریف نے سامان مجھے دیا اور کہا کہ یہ گھر دے آؤ۔ سامان دینے کا طریقہ کار کیا تھا؟ وہ انھوں نے مجھے نہیں بتایا۔ حالانکہ وہ نئے بچے کو پہلی بار گھر بھیجتے تو اسے ساری بات سمجھا دیتے تھے۔

میں نے سامان لیا اور خوشی خوشی نکل پڑا۔ جماعت میں تمام دن رہنے اور مولا بخش (ڈنڈے) کے خوف سے عموماً فضا تنهن آلود ہو جاتی تھی۔ اس لیے ہر لڑکے کی دلی خواہش ہوتی کہ وہ کسی کام کے بہانے نکل کر کچھ

خاکہ

ایک استاد تھے، ماسٹر شریف! صوم ہمارے صلوٰۃ کے پابند تھے۔ سر پر ہمیشہ جناح ٹوپی پہنے رکھتے۔ چہرے پر چمپک کے ہلکے ہلکے داغ تھے۔ بارش تھے۔ مذہبی امور پر کافی دسترس رکھتے۔ میں اس وقت پرائمری اسکول میں چوتھی جماعت کا طالب علم تھا۔ اردو میرا پسندیدہ مضمون تھا۔ حساب بھی پسند کرتا۔ میں تک پہاڑے اذہر تھے۔ جماعت میں میں قابل طالب علم سمجھا جاتا اس لیے مانیٹر بنا دیا گیا۔

ماسٹر شریف شادی شدہ تھے مگر ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ کرائے کے مکان میں رہتے۔ کچھ عرصے بعد انھوں نے پہلے والا مکان چھوڑا اور مسجد کے قریب ایک گلی میں تھوڑے کرائے پہ نیا گھر لے لیا۔ سفید پوش آدمی اور مذہبی امور کی پابندی کے قائل تھے۔ ان کی شرافت اور رواداری کی سبھی محلے دار تعریف کرتے۔ گلی میں چلتے ہوئے انھوں نے کبھی خواتین پر نگاہ نہیں ڈالی تھی۔ چہرہ ایک طرف کیا اور گزر گئے۔

تاہم ان کی گزر بسر بڑی مشکل سے ہو رہی تھی۔ میرے ماموں جو پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے، انھوں نے ماسٹر شریف سے کہا کہ وہ کوئی کاروبار کر لیں، کپڑے یا سبزی کا۔ یا پھر پرچوں کی دکان کھول لیں۔ ماسٹر شریف نے جواب دیا ”میں ساری زندگی اس قسم کا کاروبار نہیں کروں گا۔“

ماموں نے وجہ پوچھی تو ماسٹر بولے ”دکان داری کے وقت خواتین سودا لینے چلی آتی ہیں۔ سودا دیتے اور رقم لیتے ہوئے ان پر نگاہ پڑتی ہے جسے میں جائز نہیں سمجھتا۔“ ماسٹر

شرم و حیا کی بے نظیر نشانی

زندہ باد استانی جی!

شرافت کی پتلی کوئی بھی گوارا نہ تھا
کہ کوئی غیر مرد اس کی آواز سن لے

بشیر احمد بھٹی



سدا بہار

اللہ کے عطا کردہ انمول تحفے

ماں جیسا کوٹی نہیں

اولاد کی خاطر جان بھی قربان کر دینے والی
ہستی کے حضور جذبات بھرا نذرانہ عقیدت

محمد قاسم رضا



تعالیٰ نے دنیا کا نظام چلانے کے لیے جو
اللہ سب سے خاص اور حیران کن چیز بنائی، وہ
ماں کا پیار ہے۔ یہ نہ ہوتا تو شاید دنیا آگے
ہی نہیں بڑھتی اور ہمارا وجود لاکھوں سال پہلے ختم ہو جاتا۔
ڈرا سوچیے، ماں کے دل میں اولاد کے لیے پیار نہ ہوتا تو وہ
کیوں بچوں کی پرورش کرتی؟ ماں ہی ہے جو سردی، گرمی،
پت جھڑ، دھوپ، چھاؤں
میں اولاد کو سینے سے
لگائے رہتی ہے۔
ماں جتنا پیار دنیا

امامت

تُو نے پُو بھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے
حق تجھے میری طرح صاحب اسرار کرے
ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر زُبح دوست
زندگی تیرے لیے اور بھی دشوار کرے
دے کے احساسِ نیاں تیرا لبو گرما دے
نفر کی سان چڑھا کر تجھے تکوار کرے
فَنَنۡہِ بِلَّتِ بِنَا ہِے امامت اُس کی
جو مسلمان کو سلاطین کا پرستار کرے!
(علامہ محمد اقبال)

وہاں کھڑے رہے۔ پھر میں نے گلی کی کٹڑ پہ جا کے
دروازے کی سمت دیکھا۔ سامان غائب تھا میں استانی جی
کی پردہ داری اور پرہیزگاری سے بہت متاثر ہوا۔ سبحان
اللہ، کیا خاتون تھیں۔ وہ اپنی آواز کسی غیر مرد کی سماعت
تک پہنچانے کی بھی روادار نہ تھیں۔

بعد ازاں ماسٹر جی کی زبانی معلوم ہوا کہ جو خواتین
اپنی آواز اور چہرہ چھپا کے رکھتی ہیں، بہشت میں داخل
ہوں گی۔ میں سوچنے لگا ”جو عورتیں گانے بجانے کا کام
کرتیں اور اپنی سریلی آواز سے لوگوں کا جی لبھاتی ہیں،
مرنے کے بعد ان کا کیا حشر ہوگا؟“

کچھ عرصے بعد ماسٹر جی چھٹیاں گزارنے گاؤں
جانے لگے۔ استانی جی ان کے ہمراہ تھیں۔ انھوں نے
سادہ سا برقع اوڑھ رکھا تھا۔ ہاتھ اور پاؤں بھی نظر نہ
آئے۔ ”کیا بات ہے، استانی جی کی!“ یہ دیکھ کر بے
ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

پہنچا تھا کہ کیا کروں۔ میں اسی لمحے وہ لڑکا گلی کے سرے
پر نمودار ہوا جسے ماسٹر جی نے بیجا تھا۔ اس کا نام رشید تھا۔
وہ تیزی سے قریب آیا اور سامان کا رومال میرے
ہاتھ سے جھپٹ کر بولا ”بیوقوف آدمی، استانی جی
دروازے پر آچکیں۔ یہ سامان انھوں نے ہمارے ہاتھ
سے نہیں لینا نہ ہی وہ کچھ بولیں گی۔ نہ دروازہ کھولیں گی۔
وہ پردے کی پابند ہیں۔ ان کی آواز کسی غیر محرم کے کان
میں پڑے، یہ انھیں پسند نہیں۔“

اس کی آواز بالکل دہنی دہنی سی تھی۔ رشید نے پھر
جلدی سے سامان دروازے کے قریب رکھا اور میرا ہانڈو
پکڑ کر بولا ”چل، یہاں سے اپنی شکل گم کر۔ ہم یہاں
سے جب ہٹ جائیں گے تو استانی جی دروازے کی
جھری سے گلی میں جھانکیں گی۔ جب وہ دیکھ لیں گی کہ
گلی میں کوئی نہیں تو وہ تھوڑا سا دروازہ کھول سامان والا
رومال اٹھالیں گی۔ وہ گلی سے سامان لیتے وقت برقع
میں ہوتی ہیں کہ شاید کوئی گزرتے ہوئے انھیں نہ دیکھ
لے اور بے پردگی ہو جائے۔“

وہ پھر مجھے کھینٹتے ہوئے دوسری گلی میں لے گیا۔
وہاں پہنچنے کے میں نے رشید سے اپنا ہانڈو چھڑایا اور اپنی جگہ
نظمبر گیا۔ رشید بولا ”رک نہ، چلتا رہے۔“

میں نے اسے کہا ”مقل کے اندھے، کچھ دیر رک کر
یہ تو دیکھ لیں کہ آیا استانی جی نے سامان اٹھایا ہے یا
نہیں۔ یہ نہ ہو کہ سامان کوئی اور اٹھالے اور سامان کی
گمشدگی پر ماسٹر جی کے ہاتھوں ہماری پٹائی ہو جائے۔“

رشید بولا ”ایسا کبھی نہیں ہوا۔ استانی جی دروازے
پر آچکی ہیں۔ اب وہ دروازے کی جھری سے گلی میں
دیکھیں گی۔ ہم دونوں کونہ پا کر سامان اٹھالیں گی۔ تو نے
تسلی کرنی ہے تو چند لمحے ہم نظمبر جاتے ہیں۔ ہم کچھ دیر

میں کوئی کسی کو نہیں دے سکتا۔

جب بچہ جنم لے، تو ماں اپنے سارے دکھ درد بھول جاتی ہے۔ اپنی ساری تکلیفیں بھلا کر مسکراتی ہے۔ پھر ایک بچے کو بڑا کرنا بھی ماں ہی کا دل گردہ ہے۔ بچے کو کچھ بھی کر لیں، وہ تاگواری محسوس نہیں کرتی۔ بچہ کھنا دودھ پینا دے تو ماں کے علاوہ سب ناک۔ بسوریں گے لیکن وہ اس کی بلائیں لیتی منہ صاف کرے گی۔ بچہ بیٹھنا شروع کرے تو ماں محلے میں مٹھائی تقسیم کرتی ہے۔ اٹھنے لگے تو مٹھائی ہانتی ہے۔ کھڑا ہوا تو شرینی کھلائی جاتی ہے۔ چل پڑے تو ماں کی خوشی کا ٹھکانہ ہی نہیں۔

دراصل ایک ماں کی دنیا بچوں کے گرد ہی گھومتی ہے۔ دنیا میں چاہے کوئی کتنی ہی ترقی کرے، جتنا بھی بڑا افسر بن بیٹھے، ملک کا سربراہ بن جائے، ماں کے لیے وہ بچہ ہی ہے، اس کا چاند اور لعل!

ایک لمحے کے لیے سوچئے، اگر ماں بچوں کو سردی سے نہ بچاتی، خود گرمی میں رہ کر ہماری حفاظت نہ کرتی، بھوکا رہ کے ہمیں نہ کھاتی، راتوں کو جاگ کر ہمیں نہ سلاتی، تو نسل انسانی شاید آگے نہیں بڑھ پاتی۔ ماں ہی ہے جس کی بدولت ہم چلنے، پھرنے، باتیں کرنے اور کچھ سننے کے قابل ہوتے ہیں۔ جب بچہ دنیا میں آ جائے تو ماں اپنے لیے کچھ نہیں ہانتی، وہ تو بس اولاد کی بھلائی کے واسطے دعا مانگتی ہے۔

اسے اپنی فکر نہیں ہوتی، بچے ہی اس کا مستقبل ہوتے ہیں۔ کچھ کھانا ہو تو اولاد کی فکر، کچھ خریدنا ہو تو اولاد کی چننا، کہیں جانا ہے تو یہی سوچتی ہے، بچے کہاں جائیں گے، کیسے رہیں گے؟ کئی بار ایسا ہوا کہ گھر میں کوئی پھل آیا تو میری ماں نے اپنا حصہ بھی مجھے کھلا دیا۔ اپنا جوڑا لینے گئیں اور میرے لیے کپڑے لے آئیں۔ ماں بچوں سے

اتنا پیار کرتی ہے کہ اسے اعلاہ تحریر میں نہیں لایا جاسکتا۔ کہیں جا رہے ہوں تو ماں نے بس یہی کہنا ہے "اللہ کی سپرد بیٹا۔" دیر ہوئی تو دروازہ کھٹکھٹانے سے پہلے ہی کھل جائے گا اور ماں کے پریشان چہرے پہ اچانک خوشی کی لہر دوڑ جائے گی۔ جب میں اپنی بھالی کوچوں کے ناز نخرے اٹھاتے دیکھوں تو یہی سوچتا ہوں، میری ماں نے بھی کئی پریشانیوں جھیل کر میری پرورش کی ہے۔ جب میری آپلی کی بیٹی ہوئی، تو وہ بہت خوش تھیں۔ میں اسے دیکھنے گیا تو سوچ میں پڑ گیا۔ کہنے لگیں "کیا سوچ رہے ہو؟"

میں نے کہا "آپ بڑی مشکوں سے اس ننھی گڑیا کو مکمل انسان بنائیں گی۔ کتنی ہی دیر آپ اسے اٹھائے اٹھائے پھریں گی۔"

"کیوں نہیں بھئی، یہ میرا حصہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔ اب ساری زندگی اس کی خوشی ہی میں میری خوشی ہو گی۔" وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

ہمارے ہاں ایک کام کرنے والی آتی ہے۔ اسے کوئی بھی چیز دیتے تو وہ نہ کھاتی، بس جاتے ہوئے گھر لے جاتی۔ مجھے یہ عادت بہت بری لگی۔ کئی دن میں یہ عمل دیکھتا رہا۔ آخر نہ رہا۔ کا اور چہ پوچھ ہی لی۔ کہنے لگی "میں بھلا کیسے وہ چیز کھاؤں جو میرے بچوں نے ابھی تک نہ کھائی؟"

میں نے کہا "جب بھوک لگی ہو تب تو کچھ کھالیا کرو۔" کہنے لگی "جب بچے بھوکے ہوں تو اپنی بھوک یاد ہی نہیں رہتی۔"

یہ بے نظیر سچ ہے کہ بچے کو یاد نہ ہو، ماں اس کا خیال ضرور یاد رکھتی ہے۔ ماں تو پیار کا سمندر ہے، ایک بے غرض اور لازوال محبت کرنے والی ہستی!

ایک دن میں نے بیوی سے پوچھا "کیا تم ماں سے زیادہ مجھے محبت کر سکتی ہو؟"

وہ ناراض ہو گئی۔ کہنے لگی "آپ کو مجھ سے زیادہ محبت کوئی دے ہی نہیں سکتا۔"

میں نے کہا "شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔ لیکن ایک بات ہے، ماں آج تک مجھ سے ناراض نہیں ہوئی۔ چاہے میں بڑی سے بڑی لٹپٹی کر دوں۔ ماں کہتی ہے، بیٹا میری طبیعت ٹھیک ہو جائے گی، تم رات کو میری دوائی لینے بازار نہ جاؤ، میرے پاس ہی رہو۔ اور تم کہتی ہو، مجھے نہیں پتا، چاہے رات کے بارہ بجے ہوں، مجھے بیڑا کھانا ہے۔ جہاں سے مرضی لے کر آئیں۔ ماں کہتی ہے، اپنا جوڑا لے آتے، میرا کیوں لائے؟ بیوی کہتی ہے، مجھے نہیں پتا، میں نے دو جوڑے لینے ہیں، جیسے مرضی لاؤ۔"

کئی ماہیں سورج نکلنے سے پہلے اٹھ جاتی ہیں تاکہ بچے وقت پہ اسکول پہنچ سکیں۔ اسکول جاتے ہوئے بچے ہزار نخرے کرتے ہیں مگر ماں سب کچھ برداشت کرتی ہے۔ یہ دیکھتے کہ فائدہ کس کا ہے اور پریشان کون ہوتا ہے؟ بعض دفعہ ننھے بچے چھوٹی سی بات پر ناراض ہو کے ماں کی محبت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے خالی پیٹ اسکول چلے جاتے ہیں۔ تب ماں کھانا اٹھائے پیچھے پیچھے جاتی ہے کہ بچہ بھوکا نہ رہے۔ بچوں کے کھانے کی فکر کرنے والی ماں نے خود پتا نہیں کھانا کھایا ہوتا ہے یا نہیں۔

اما جی بتاتے ہیں، ایک دفعہ وہ اپنی ماں جی سے ناراض ہو کر کھانا کھائے بغیر اسکول چلے گئے۔ اسکول تقریباً تین میل دور تھا اور وہ پیدل ہی جاتے۔ سورج سر پہ تھا کہ ماں جی کھانا اٹھائے اسکول پہنچ گئیں۔ کہنے لگیں "ہنٹر گرمیوں کے دن لمبے ہوتے ہیں۔ میرے لعل، تم سارا دن کیسے گزارو گے؟ چل کھالے کھانا۔"

یہ واقعہ سن کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ذرا تصور کیجئے، گرمی عروج پہ ہے اور ایک ماں کڑی دوپہر میں

ناراض بیٹے کے لیے تین میل کا سفر پیدل کھانا لیے جا رہی ہے۔ یہ ماں ہی ہے جو اولاد کی فکر میں سب کچھ بھول جاتی ہے۔ اس کی محبت کے آگے گرمی سردی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ انسان تو انسان، دنیا کی ہر مخلوق میں مادانہ پیار کا یہ اصول جذبہ پایا جاتا ہے۔ خدا کے دیے ہوئے اسی بیش قیمت جذبے سے شاید دنیا آگے بڑھ رہی ہے۔

میں چھوٹا سا تھا جب ہمارے گھر میں لگے درخت پر ایک بلبل نے بسیرا بنا لیا۔ یہ بڑا خوبصورت پرندہ ہے۔ اس کے اٹھنے سے ایک چھوٹا سا بچہ نکلا۔ جب وہ کھانا ڈھونڈنے جاتی تو موقع پا کر میں بچے سے کھیلنے لگتا۔ آہستہ آہستہ وہ بڑا ہو گیا اور پھر میرے ہاتھ نہ آتا۔ ایک دن میں دوڑتے ہوئے اسے پکڑ رہا تھا کہ ہاتھ زور سے لگا اور وہ لٹکڑا ہو گیا۔ پھر کچھ دن بعد مر گیا۔ اب اس کی ماں کی بے چینی دیکھی نہ جاتی۔ وہ ادھر ادھر اور اس گھومتی رہتی۔ ایسے لگتا جیسے بہت پریشان ہے۔ اس کی پریشانی مجھے بھی اداس کر دیتی کیونکہ میں ہی اس کا قصور وار تھا۔ پھر کچھ دن بعد بلبل بھی نظر نہ آئی۔ شاید وہ اپنے بچے کا دکھ برداشت نہ کر سکی اور جہان فانی سے رخصت ہو گئی۔

انہی دنوں آپلی نے ایک بلی پال رکھی تھی۔ اس کے بچے ہوئے، تو وہ ہر وقت بڑی خوشی سے انہیں ساتھ لے پھرتی۔ بلی کے ہارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو دشمن سے بچانے کے لیے سات گھر بدلتی ہے۔ اور حیرت انگیز امر یہ ہے کہ ان بچوں کا دشمن ان کا باپ ہی ہوتا ہے۔ بلی اگر مجھے یا چار بچوں کو جنم دے اور بے کوان کی جائے پیدائش کا علم ہو جائے، تو وہ بچوں میں سے نر جن جن کر کھا جاتا ہے۔ اسی لیے بلی انہیں بچانے کے لیے چھبیس بدلتی رہتی ہے۔

ایک شام بلی کا بچہ گم ہو گیا۔ ہم سب نے اسے بہت ڈھونڈا لیکن نہ ملا۔ بلی ساری رات روتی کر لاتی رہی۔ وہ

سرگزشت

البرٹز کا بچپن ۱۹۵۰ء کی دہائی میں
کرسٹین جنگ عظیم دوم کی تباہ کاریاں دیکھتے
گزرے۔ وہ لاطینی و یونانی زبان کے
ولندیزی پروفیسر ہانس البرٹز اور ان کی جرمن اہلیہ کی
بٹی ہیں۔ جب کسکس تھیں اور باہر بچوں کے ساتھ کھیلنے
جاتیں، تو والدین انہیں سختی سے منع کرتے۔ اس زمانے
میں دراصل یورپی باشندوں پر ہٹلر کے نازی ازم بھوت
کا خوف سوار تھا۔ خاص طور پر وہ جرمن باشندوں سے
دور بھاگتے تھے۔

جنگ کی تباہ کاریوں سے آشنائی کے باعث کرسٹین
کے روزمرہ کاموں میں باقاعدگی سے خبر نامہ دیکھنا
شامل ہے۔ کئی سال سے وہ بدلتے عالمی حالات و



جنگ کی تباہ کاریوں سے آشنا

ولندیزی خاتون طالبان کی تلاش میں

ہالینڈ کی ایک ٹیچر غریب بچوں کو
پڑھانے پاکستان آئی مگر اُسے جن
شدت پسندوں کا انتظار تھا وہ کہیں نہ مل سکے

رزاق سر بازی

امید

مقابلہ تو زمانے کا ٹوب کرتا ہوں
اگرچہ میں نہ سپاہی ہوں نے امیر جُود
مجھے خبر نہیں یہ شاعری ہے یا کچھ اور
عطا ہوا ہے مجھے ذکر و فکر و جذب و سرود
جہین بندہ حق میں نمود سے جس کی
اسی جلال سے لبریز ہے نصیب و جود
یہ کافر تو نہیں، کافر سے کم بھی نہیں
کہ مرد حق ہو گرفتار حاضر و موجود
غمیں نہ ہو کہ بہت دور ہیں ابھی باقی
نئے ستاروں سے خالی نہیں سپر کبود

غزل

دریا میں موتی، اے موج بے ہاک
ساحل کی سوغات! خار و خس و خاک
میرے شر میں بجلی کے جوہر
لیکن نیساں تیرا ہے نم ناک
تیرا زمانہ، تاثیر تیری
ناداں! نہیں یہ تاثیر افلاک
ایسا بچوں بھی دیکھا ہے میں نے
جس نے سچے ہیں تقدیر کے چاک
کامل وہی ہے بندی کے فن میں
مستی ہے جس کی بے ہمت تاک
رکھتا ہے اب تک سے خانہ شرق
وہ سے کہ جس سے روشن ہو ادراک
اہل نظر ہیں یورپ سے نوامید
ان امتوں کے باطن نہیں پاک
(علامہ اقبال)

اتنی دردناک آواز سے بولتی کہ ہم بھی ساری رات نہ سو
سکے۔ بلی کی پریشانی نے آپنی کو بھی متوحش کر دیا۔ صبح ہوئی
تو بلی کا بچہ بڑے مزے سے چولھے کے نیچے سے انگرائی
لیتا برآمد ہوا۔ بلی سب کچھ بھول بھال نیچے سے لپٹ گئی۔
وہ اسے زبان سے چاٹتی، اس کے گرد گھومتی، شاید پوچھتی
ہو: ”کیوں تم نے اپنی ماں کو پریشان کیا؟“

کچھ دن پہلے میں صبح گھر سے نکلنے لگا تو کتے کا
ایک چھوٹا سا بچہ دروازے سے لگا ٹھنڈا رہا تھا۔ شاید وہ
کبھی پانی میں گر گیا اس لیے بھیگا ہوا بھی تھا۔ میں نے
اسے حقے کے لیے جلائی آگ کے قریب بیٹھا دیا۔
دھوپ نکلنے تک وہ اچھا بھلا ہو گیا۔ اب اس نے شاید
میں رہنے کا ارادہ کر لیا اور میرے آگے پیچھے پھرنے
لگا۔ بچے اس نئے مہمان کی آمد سے بہت خوش ہوئے۔
لیکن کچھ دیر بعد میں نے دیکھا کہ گلی میں بے تاب ماں
اسے ڈھونڈ رہی ہے۔

گلی میں آنکھ دس چکر لگا وہ ہمارے دروازے پہ
کھڑی ہو گئی جیسے اسے پتا ہو، اس کا گم شدہ بچہ نہیں
ہے۔ بچے کو بھی ماں کی آمد کا پتا چل گیا، وہ دوڑتا ہوا
دروازے پر آ پہنچا۔ ماں نے دیکھا تو یقین کیجئے، اتنی
شدت سے اسے پیار کرنے لگی کہ یہ منظر دیکھنے سے تعلق
رکھتا تھا۔

کنکرو کی مثال سب سے بڑھ کر ہے۔ جب تک
اس کا بچہ جوان نہیں ہوتا وہ اسے گود میں بٹھائے پھرتی
ہے۔ مرغی بڑا شریف پرندہ ہے۔ لیکن اگر کوئی بچوں کے
پاس جانے کی کوشش کرے تو وہ اس کی آنکھیں نوج لیتی
ہے۔ جیسے مرغی اپنے بچوں کو پروں میں سمیٹ کر ٹیٹھتی
ہے، اس طرح دنیا کی ہر ماں اپنے بچوں پہ پیار نچھاور
کے ٹیٹھی ہے۔

واقعات خبر نامے میں دیکھتی آرہی ہیں۔ حادثہ نائن ایون کے بعد خبروں میں دو نام بکثرت آنے والے ان کے ذہن میں بیٹھ گئے: طالبان اور پاکستان۔ یہ نام ان کے ذہن میں بچپن کی یادیں تازہ کر دیتے جو جنگ عظیم کی تباہ کاریوں سے جڑی ہیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ کاش بظلم کو دیکھ لیتیں جس نے دنیا کو جس نہیں کر ڈالا تھا۔ اب ان کے پاس موقع تھا، وہ اس ملک (پاکستان) کی سیر کر سکتی تھیں جہاں طالبان بھی بستے ہیں۔

سفارتی اہلکار نے ضروری دستاویزات اور نصابی کتابیں چیک کر کے کچھ رسمی سوال کیے۔ پھر انھیں فوری ویزا جاری کر دیا گیا۔ انھیں پاکستانی ویزا افسر کا مہذب و شائستہ رویہ بہت پسند آیا۔ مگر اس امر نے کرشنین کو پریشان کر دیا کہ سیاسی لحاظ سے اتنے اہم ملک میں جانے کے لیے ویزا لینے والی وہ واحد ولندیزی درخواست گزار تھیں۔

پاکستان کا ناک نقشہ ان کے ذہن میں انڈونیشیا جیسا تھا جو ہالینڈ کی سابق نوآبادی رہا ہے۔ ولندیزیوں کے ساتھ نوآبادیاتی رشتے کی عمدہ کہانی مشہور انڈونیشیائی ادیب، پرمودیہ آندھ طور نے اپنے مقبول ناولوں میں بیان کی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ



کرشنین پاکستانی دوستوں کے ساتھ

پاکستان نے ہالینڈ نہیں برطانوی نوآبادیاتی دنیا کی راکھ سے جنم لیا۔

پاکستان جا کر کچھ عرصہ غریب بچوں کو پڑھائیں گی، اس طرح ایک پختہ دو کالج والا معاملہ ہو جاتا۔ توقع کے مطابق ولندیزی (ڈچ) دفتر خارجہ نے ان کے فیصلے کو پسند نہیں کیا۔ جب کہ اہل خانہ، دوست و احباب انھیں پاگل تصور کرنے لگے۔

ایک عمر رسیدہ رشتہ دار نے کہا "تم وہاں جاری ہو جہاں سانپ، مگر مجھ اور طالبان پائے جاتے ہیں۔ ہم تمہارے حق میں دعا کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔" ہالینڈ کے شہر بیگ میں واقع پاکستانی سفارت خانے کا ویزا آفیسران کی شخصیت سے متاثر ہوا۔ تاہم وہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ کیوں پاکستان جاری ہے؟ "غریب طلبہ کو انگریزی پڑھانے۔" کرشنین الیریز نے جواب دیا۔

انہوں نے اپنے پروفیسر والد کو پاکستان سے پہلی اسی میل میں لکھا: "یہ ایک نوٹی پھونی دنیا ہے۔ بہت کم ایشیا ٹھیک اور تسلی بخش حالت میں ملتی ہیں۔ ٹریفک بے بنام ہے۔ ہر ایک ٹگلت میں اور غصے سے بھرا ہوا گاڑی چلاتا ہے۔ شدید گرمی ہے اور شہر میں بجلی نہ ہونے کی شکایت عام۔ مقامی ٹرانسپورٹ کی گاڑیاں خستہ حال لیکن سواروں سے کھپا کھچ بھری ہوتی ہیں۔"

"ذہل کسین گاڑیاں رعب داب قسم کی شخصیت کا تاثر پیدا کرنے کے لیے پسند کی جاتی ہیں۔ ان کے پچھلے حصے میں مسلح افراد بند قفس لیے بیٹھے ہیں۔ ان گاڑیوں کا رنگ بھی بیشتر اوقات میں نے سیاہ پایا۔ شیشے بھی کالے تاکہ اندر بیٹھے لوگوں کا راہ گیروں پر رعب پڑ سکے۔ شہر کا اولڈ ٹاؤن (پرانا علاقہ) مجھے جگمگ جیسا لگا جہاں برطانوی دور کی عمارت کسی بھی علاقے سے زیادہ ہیں۔ مگر عدم توجہ ان تاریخی عمارت کو قابلِ رحم بنا چکی۔"

کرشنین الیریز موسم گرما کی چھٹیاں پاکستان کے غریب طلبہ کو انگریزی پڑھا کر گزارتا چاہتی تھیں۔ ان کے دورہ پاکستان کا یہی بنیادی مقصد تھا۔ میر پور خاص ان کا دوسرا پڑاؤ بنا جہاں انھیں غریب بچوں کو تعلیم دینی تھی تھا۔

"میر پور خاص چھوٹا سا کاروباری مرکز ہے۔ بظاہر شہر ہے لیکن جا بجا دیہاتی مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ گندگی کے ڈھیر عام ہیں۔ گدھا گاڑیاں بار سے لدی ہیں۔ ساتھ میں ایشیکروں سے بھری نئی ماڈل کی کار بھی چل رہی ہوتی۔ شہر ایسا ہے جیسے کوئی قصبہ، جہاں عام لوگ، رکشے والے، دکاندار کم از کم چہرے سے ایک دوسرے کو ضرور پہچانتے ہیں۔ شہر کے اطراف

رہنے والے بیشتر لوگ شدید غربت کا شکار ہیں۔" کرشنین نے اپنے مشاہدات میں لکھا۔ "لیکن طالبان کہاں ہیں؟..... پاکستان آتے ہوئے طالبان کا جو ٹکس میرے ذہن میں تھا، وہ ان علاقوں میں کہیں نظر نہیں آیا۔ میں گھومتی پھرتی رہی اور دوست راہنمائی کے لیے ساتھ ہوتے۔ طالبان اگر ہیں بھی تو وہ عام لوگ نہیں! گو عام پاکستانیوں کے روزمرہ کاموں میں مذہب کا عمل دخل بہت ہے۔ اس نے ان کی زندگی کو بھی متاثر کیا ہے۔"

کرشنین کہتی ہیں "انٹارہویں، انیسویں صدی میں جب مغربی ممالک سے عیسائی مبلغ ایشیا و افریقا جاتے تو کم خوراک کا شکار مقامی لوگوں کو خوراک دیتے۔ بدلے میں مقامیوں کو دینی صحیفوں میں لکھی باتیں سننا پڑتیں۔ پاکستانی دیہی علاقوں میں بھی یہ مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اخلاقیات کی ذمے داریاں پاکستان میں مذہب انجام دے رہا ہے جو معاشرے کا ستون بن چکا۔"

پاکستان میں کلچر کی تعریف البتہ کرشنین کے لیے معنی بنی رہی۔ وہ اکثر ساتھیوں سے گفتگو کرتے ہوئے کچھ سوچتی اور انگلی سے کٹینی پر چابی کی علامت بنا کر اس سے تالا کھولنے کا مظاہرہ کرتیں۔ وہ کہتی ہیں "پاکستانیوں کو اپنا ذہن کھولنا ہوگا۔ مجھے ہر جگہ پاکستانی کلچر کے احترام کا درس دیا گیا۔ لیکن کیا یہ کسی کی پرائیویسی ختم کرنے اور اپنی محفوظ رکھنے کا بہانہ نہیں؟ مجھے پاکستان آکر یہاں کے کلچر کا احترام کرنا پڑا۔ جو لوگ مراکش و دیگر ملکوں سے ہالینڈ آتے ہیں، وہاں بھی ان کے کلچر کا احترام ہمیں ہی کرنا پڑتا ہے۔ لیکن میرے کلچر کا احترام کون کرے گا؟ کیا احترام کا حق صرف ایک گروہ کو حاصل ہے؟"

ساتھ ایسا برتاؤ کیا جو کسی جیل میں داخلے پہ قیدی کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ میری زندگی میں وہ پہلا لمحہ تھا جب مجھے اپنی قومیت پر شرمندگی محسوس ہوئی۔

بہر حال وہ دن گزر گیا۔ اس کے بعد میں واپس پاکستان نہیں گیا۔ اپنی محبتوں کا وطن چھوڑا اور اپنی ضرورتوں کا نیا جہان بسا لیا۔ میں نے برطانوی شہریت اپنائی۔ بچے بھی وہیں پیدا ہوئے۔ انھیں تعلیم دلوائی۔ ایک بیٹا ڈاکٹر بنا، دوسرا وزارت داخلہ میں ملازم ہو گیا۔ تیسرے بیٹے نے کاروبار شروع کر دیا۔ یوں اللہ تعالیٰ نے مجھے مالامال کر ڈالا۔ تینوں بیٹے میری دولت اور میرا کل سرمایہ بن گئے۔

مجھے پاکستان پکارا کرتا تھا مگر آہستہ آہستہ اس کی آواز میرے کانوں سے بہت دور ہو گئی۔ وہ آواز جس سے میرے دل کی دھڑکنیں جڑی تھیں، اس سے میرا رابطہ ٹوٹ گیا۔ پچھلے تیس سال میں کئی حادثات رونما ہوئے۔ مگر میں پاکستان واپس نہ گیا۔ اس دوران میرے رشتے داروں نے میری زمینوں پر قبضے کر لیے اور رہی سہی محبت کا جنازہ نکال دیا۔ میری والدہ جب فوت ہوئیں تو بیوی پاکستان گئی۔ میں اس وقت بھی نہ جا۔ کا کہ شدید بیماری کی وجہ سے اسپتال داخل تھا۔ یوں میری ماں اسی مٹی کی چھاتی میں اتر گئی جسے میں اپنا کعبہ کہتا تھا۔

ماں کی وفات کے بعد پاکستان سے سب کچھ اٹھ گیا۔ میرے والد تو اسی وقت فوت ہو گئے تھے جب میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔ بیوی جب لونی تو بتایا ”مرحومہ والدہ کی آخری خواہش تھی کہ میرے ایک پوتے کی شادی پاکستان میں کسی عزیز کے گھر ہو جائے۔“

میں نے تینوں بیٹوں کو سامنے بٹھایا اور مرحومہ والدہ کی خواہش ان کے سامنے رکھ دی۔ بڑے بیٹے

برطانیہ میں رہتے ہوئے چالیس سال بیت چکے۔ اس دوران میری زندگی میں دو لمحے بڑے المناک رہے۔ پہلا لمحہ وہ تھا

جب دس سال بعد پہلی بار پاکستان گیا۔ پی آئی اے سے سفر کیا۔ اس وقت برٹش ایئر ویز اور دیگر مغربی کمپنیوں کے طیارے پاکستان جاتے تھے، مگر مجھے اپنے اپنے پرناز تھا۔ قومی جہنڈا اور پاکستانی ہوائی کمپنی میرا فخر ہوا کرتا۔ مجھے یاد ہے، جب پہلی بار اسلام آباد ہوائی اڈے پر اترتا تو میری آنکھوں میں آنسو تھے، جیسے رہائی کے بعد قیدی کی آنکھوں میں جاتے ہیں۔

پاک سرزمین دیکھ کر میری پیاس میں شدت بڑھ گئی۔ پیاسے کو پانی ملے تو وہ اسی کی طرف بے صبری سے لپکتا ہے۔ میں بھی اپنی محبت کی پیاس بجھانے پاکستان کی مٹی چومنا چاہتا تھا۔ یہ انتہائی روحانی تجربہ تھا، میری زندگی کا وہ لمحہ جسے میں کبھی بھولنا نہیں چاہتا۔

مگر جیسے ہی میں کسٹم اور امیگریشن سے گزرا، سب کچھ بدل گیا۔ میرا تعلق ٹونا اور طواف اوجھو راہ گیا۔ پیاس شتم ہو گئی اور آنسو سوکھ گئے۔ تب مجھ سے پہلی بار مضامنی (رشوت) کی مانگ ہوئی۔ کہا گیا کہ میں برطانیہ سے آیا ہوں اور کسٹم والوں کے لیے کچھ نذرانہ پیش کروں ورنہ میرے ساتھ سختی برتی جائے گی۔ میں اپنے حرم میں آیا تھا، اپنے گھر داخل ہو رہا تھا، رشوت دینے جیسے حرام فعل کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میرے انکار پر عظیم ہم وطنوں نے مجھے اس قدر رسوا کر دیا کہ وہ دن نہیں بھولتا۔

میرا حب الوطنی کا سارا بخار اتر گیا۔ مجھے چاہتوں کے اپنے وطن، محبت کی سرزمین میں یوں زد و کوب کیا گیا کہ ہر لمحہ خود سے نفرت محسوس ہوئی۔ عملہ کسٹم نے میری بیوی کے کپڑے باہر نکال کر ان کی پڑتال کی۔ ہمارے

سچا واقعہ

زندگی تہہ و بالا کر دینے والا

تیسرا لمحہ

پاک وطن سے سچی محبت کرنے والے ایک پاکستانی کا ماجرائے غم، وہ دیار غیر میں بھی چین سے نہ رہ سکا

انوار ایوب راجہ



نے مرحومہ دادی کی خواہش کا احترام کیا مجھے بے انتہا خوشی ہوئی ہم سب تیار ہوئے۔ میں نے سامان باندھا۔ یوں میرے اندر پھر پاکستان بیدار ہو گیا۔ میں برصغیر میں اتواری ہوئی اڑے سے جب جہاز پہ سوار ہوا تو مجھے ماضی کے سارے دکھ، غم، دشمنیاں اور ہم وطنوں کا ناروا برتاؤ بھول گیا۔ مجھے اندر سے کسی نے کہا کہ ہاضو ہو جاؤ۔ میرے کانوں میں پھر پاکستان کی آواز گونجنے لگی۔ میری محبتوں کے جہان سے بلند نفعے پورے وجود میں گونجنے لگے۔

ہم اسلام آباد پہنچے، اب میں پہلے جیسا جوان نہیں رہا تھا۔ سو میرا رد عمل بھی ویسا جوشیلا نہیں رہا جیسا تیس سال پہلے تھا۔ مجھ میں بہت سی تبدیلیاں آچکی تھیں مگر پاکستان کے نظام میں کچھ نہ بدلا، سب کچھ ویسا ہی پایا، بلکہ پہلے سے بھی زیادہ بگڑا ہوا۔ آبادی میں اضافہ ہوا اور غلامیوں اور ٹی ہو گئیں مگر میرے عظیم ہم وطنوں کے مزاج پہلے سے بھی زیادہ پست ہو چکے تھے۔ وہی گھنیا ذہنیت تھی اور ذلالت جس کا مجھے تیس سال پہلے سامنا کرنا پڑا۔

میں اپنے گاؤں پہنچا۔ ماں کی قبر کو چوما۔ باپ کی قبر پہ حاضری دی۔ ہم پندرہ دن رہے۔ میرے بیٹے نے ایک رشتے دار کی بیٹی سے شادی کر لی۔ ہم پھر واپس آ گئے۔ کئی صدے اٹھانے کے باوجود تیس سال بعد گاؤں پہنچا، تو وہاں مٹی کی خوشبو بہت بھائی۔ وہ میرے خیر کا حصہ تھی، اس لیے میرے اندر مہکتی رہی اور پھر بیدار ہو گئی۔

برطانیہ آنے کے آٹھ ماہ بعد ہماری بہو بھی آ گئی۔ مجھے لگا، میرا نونا رشتہ بحال ہو رہا ہے۔ سوچا کہ شاید تقدیر میں پھر سے نسبت بدلتی لکھی ہے۔ ہم سب بہت خوش تھے، ہم نے بہو کو بیٹیوں کی طرح گھر میں عزت اور پیار

دیا۔ کچھ دن بعد بیٹے نے بتایا کہ دلہن موہاں فون خریدنے کا تقاضا کر رہی ہے۔ میں نے بیٹے کو بتایا، وقت بدل چکا، اب پاکستان بھی ماڈرن ہو گیا ہے۔ ہو سکتا ہے، اسے سہیلیوں سے بات کرنے کے لیے فون کی ضرورت ہو۔ چنانچہ اسے موہاں فون دے دیا گیا۔

اس کے بعد اکثر ایسے ہوتا کہ بہو کا فون بجاتا تو وہ یہ کہہ کر اپنے کمرے میں چلی جاتی، ”میری سہیلی کا فون ہے۔“ ہم نے کبھی اعتراض نہیں کیا، یہ ایسی بات بھی نہیں تھی۔ میرا بڑا بیٹا ہفتے کے پانچ دن شہر سے باہر جاتا اور جمعہ کی شام کو گھر لوٹ آتا۔ ڈیڑھ سال بعد اللہ نے بیٹے کو نئے فرشتے کا تحفہ دیا۔ یوں خدا نے مجھے مالا مال کیا اور میں دادا بن گیا۔ ہم نے گھر میں جشن منایا۔ ہمیں سکون تھا کہ بہو اب ہمارے گھر کا نظام چلا سکتی ہے۔

ایک روز اس نے مجھے کہا ”ابو! میں کام کرنا چاہتی ہوں۔ گھر میں بوری ہو جاتی ہوں۔“ مجھے یہ مانگ بھی جائز لگی۔ میری اپنی بیٹی ہوتی تو شاید یہی کہتی۔ لہذا جب پوتا آٹھ ماہ کا ہوا تو میری بہو نے انگریزی کا امتحان پاس کیا اور گھر کے قریب کپڑوں کے ایک اسٹور پہ کام کرنے لگی۔ ہمیں اس کے جدید کپڑوں پہ اعتراض تھا اور نہ ہی اس کے کام کرنے پہ بلکہ خوشی تھی کہ وہ برطانوی نظام کو سمجھ کر اس کے سماجی تانے بانے کا حصہ بن رہی ہے۔

ایک روز بیٹے نے شکایت لگائی کہ دن میں جب بھی بیوی کو فون کرے، تو وہ مصروف ہوتا ہے۔ میں نے بیٹے کو سمجھایا کہ یہ ضروری نہیں کہ جب ایک شخص فارغ ہے تو دوسرا بھی اس طرح بیٹھا ملے۔ بہر حال مجھے تھوڑی تشویش ہوئی۔ بیگم سے کہا کہ وہ بہو سے بات کرے۔ بیگم نے تجویز دی کہ یہ بات زیادہ اچھائی نہیں چاہیے۔ ہو سکتا ہے، بہو برا جانے اور اس کے دل

میں ہمارے لیے منفی رجحان جنم لے۔

میں نے بیگم کی بات پر صاف کیا اور خاموش رہا۔ پوتا ایک سال کا ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ اب بہو کو بچے کے ساتھ اپنے والدین سے ملنے جانا چاہیے۔ چنانچہ بیٹے سے چھٹیاں لینے کو کہا۔ انھوں نے پھر ٹکٹ بک کر دالیے۔ اسی دوران بہو کی برطانیہ میں غیر معینہ مدت تک قیام کی درخواست بھی قبول ہو گئی۔

لیکن پاکستان جانے سے ایک ہفتہ پہلے ایسا حادثہ پیش آیا کہ کایا ہی پلٹ گئی۔ وہ فون کالیں جنھیں ہم بہنوں، سہیلیوں اور رشتہ داروں کی سمجھتے تھے، ایک مرد کی لکھیں۔ اس کا شادی سے پہلے بہو سے رابطہ تھا۔ موہاں فون سے کچھ ایسی تصویریں اور پیغامات بھی ملے جنھیں پڑھنے کے بعد میرا سر شرم سے جھک گیا۔

ہماری بہو کو جب علم ہوا کہ اس کا گھر رہ جانے والا موہاں فون پکڑا گیا ہے تو سیدھے پولیس اسٹیشن چلی گئی۔ پولیس کو بیان دیا کہ اسے خاوند سے خطرہ ہے۔ پولیس بچے اور بہو کا سامان لینے گھر آئی تو ہم نے ہا خوشی دے دیا۔ کچھ ہفتوں بعد بہو نے طلاق کی درخواست دے دی۔ معاملہ عدالت میں گیا۔ عدالت نے بچے کے بہترین مفاد میں اسے ہم سے ملنے کی اجازت دے ڈالی۔

یوں میں ایک دم غریب ہو گیا جو دولت مجھے اللہ نے عطا کی تھی، اسے میری بہو لوٹ کر لے گئی۔ ہم عدالتوں کے چکر کاٹنے لگے۔ میرا بیٹا اور دیگر اہل خانہ اس ساری صورت حال میں کبھی دلبرداشتہ ہوتے تو میری والدہ کو کہتے کہ یہ انہی کی خواہش کا شاخسانہ تھا۔ ادھر میں ترستا کہ مجھے پوتے سے ملنے دیا جائے مگر مہینے میں صرف ایک بار اس سے ملاقات ہو پاتی۔

تربیت

زندگی کچھ اور شے ہے، علم ہے کچھ اور شے زندگی سوز جگر ہے، علم ہے سوز دماغ علم میں دولت بھی ہے، قدرت بھی ہے لذت بھی ہے ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ اہل دانش عام ہیں، کم یاب ہیں اہل نظر کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایام! شیخ کتب کے طریقوں سے عقائد دل کہاں کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ (علامہ محمد اقبال)

ایک روز مجھے شاپنگ مال میں پوتا نظر آیا۔ ماں ایک دکان میں خریداری کر رہی تھی۔ میں نے پوتے کو پرانے سے اٹھایا، گلے لگایا اور پیار کیا۔ تبھی بہو آئی، بچہ چھینا اور مجھے دھکا دیا۔ میں زمین پر گر کر، ماتھا کسی اپنی چیز سے ٹکرایا اور میں زخمی ہو گیا۔ سیدھے ہاتھ کی دو انگلیاں بھی ٹوٹ گئیں۔ درد کے مارے میں بے ہوش ہو گیا۔ جب آنکھ کھلی تو اسپتال میں تھا اور پولیس میرے سامنے کھڑی تھی۔ انھوں نے مجھ سے میری بہو کے خلاف بیان لکھوایا۔ آج تین ماہ بعد میں اس کے خلاف عدالت میں گواہی دینے آیا ہوں۔

☆☆☆

محمد نور ولی اپنی کہانی سنا رہے تھے۔ اسی وقت دروازے پر عدالت کے ملازم نے آکر آواز لگائی ”مسٹر ولی! کیا آپ اپنی گواہی دینے کے لیے تیار ہیں؟“ انھوں نے دونوں ہاتھوں سے آنسو پونچھے، جسم کا زور اپنی چھڑی پہ ڈالا اور ملازم کے پیچھے کمرے سے باہر چلے گئے..... یہ ان کی زندگی کا تیسرا المناک لمحہ تھا۔

ہے کہ سود کا لین دین عزت پامال کر دینے سے بھی بڑا گناہ ہے۔ موسیقی سننے کی سزا بھی کانوں میں گرم سیسہ ڈالنے کی شکل میں ملے گی (استغفر اللہ)۔ احتیاطاً ایک دو اور علما سے مشورہ کر کے ان کاموں سے بچنے کے لیے کوئی پکا فیصلہ کرنا ہے۔

ہذا اماں کو سمجھانا ہے کہ خبرنامے کے دوران کوئی غیر اخلاقی اشتہار آئے تو کم از کم چھوٹے بہن بھائیوں کو اٹھا دیا کریں یا بندہ تی وی ہی بند کر دیتا ہے۔ براہ راست بات کرنے کے بجائے خالہ نجمہ کو کہنا ہے کہ وہ معاملہ اٹھائیں۔

ہذا خالہ نجمہ کو یہ بھی کہنا ہے کہ مجھے کپڑے جوتے "گفٹ" کرنے کے بجائے پیسے دے دیا کریں تاکہ میں انھیں اپنے حساب سے خرچ کر سکوں۔ کوشش کرنی ہے کہ آئندہ یہ تحفے نہ ہی لوں۔

ہذا دنیا کے رنگ نرالے..... عرفی انکل کی بیوی کراپیہ دار کے ساتھ مل کر بے چارے شوہر کو گھر سے بے دخل کر چکی۔ یہ انتہائی ظلم ہے۔ انکل کی ہر صورت مدد کرنی ہے۔ (مالی تو ممکن نہیں، قانونی مدد یا مشورہ دیا جاسکتا ہے)

ہذا پنڈی والی بہن نے بتایا ہے کہ ان کی کھلی میں کئی لوگوں نے کپیریسر لگا کر گیس کھینچ لی۔ ان کا چولہا ایک مہینے سے ٹھنڈا ہے۔ محکمہ گیس فون کر کے کم بختوں کو سزا دی ہے کہ غیر قانونی کپیریسر لگانے والے کھلی گیس کھینچ رہے ہیں اور کپیریسر نہ لگانے والوں کے چولہے ٹھنڈے پڑے ہیں۔ یہ کیا اندھیر نگری ہے۔

ہذا کمپیوٹر کو ہر چوتھے دن موت پڑ جاتی ہے۔ نوید بھائی کہتے ہیں کہ ونڈو کی اور کینٹیل سی ڈی پانچ ہزار روپے میں لے لو۔ لیکن یہاں سارے ہی تیس روپے

روپے جمع کیے، کیا ان سے بیمار ماں باپ کے ٹیسٹ کرائے جاسکتے ہیں؟

ہذا بچپن میں حکیم کے غلط انجکشن سے مرنے والے اپنے ان دیکھے بھائی کی قبر ہر عید پر گم ہو جاتی ہے۔ قبر پختہ کرانا گناہ ہے لیکن کوئی کتبہ یا نشانی وغیرہ لگا کر اسے محفوظ بنایا جاسکتا ہے۔ آخر کار وہ میرا بھائی تھا۔

ہذا مسجد کے سامنے والے گھر میں بیوٹی پارلر کا ہونا میرے خیال میں بے ادبی ہے۔ سلیم بھائی اگر خود بات کر لیں تو مناسب ہے۔ مسجد کھیتی کو بھی انھیں آرام سے سمجھانا چاہیے کہ بیوٹی پارلر کے دروازے پر لگے پوسٹر پر انڈین اوکارہ کی تصویر آداب مسجد کے منافی ہے۔ امید ہے، بنالیں گے۔

ہذا خان ہزری والے نے دو دفعہ پھیلے کہہ کر بیٹھے آلو دے دیے، وہ بھی پانچ کلو! قسم کھا کر کہتا تھا کہ انڈین آلو ہیں مگر یہ تو بیٹھے نکلے۔ ایک آلو اہال کر اسے دکھانا ہے کہ جھوٹے، کیا یہ انڈین آلو ہے؟

ہذا ہر دوسرے دن ریڑر سے شیو کرتے ہوئے بال جب نالی میں گریں، تو سنت نبوی کے اس طرح پہ جانے پر دل جلتا ہے۔ کسی بڑے عالم دین سے پوچھنا ہے کہ ڈازھی منڈانا مکروہ ہے، مکروہ تحریمہ یا حرام؟ اگر واقعی اس کے منڈھانے کی سزا سخت ہے تو پھر ڈازھی رکھ لینی چاہیے۔ اب اس کی خاطر آخرت کو داؤ پہ نہیں لگا سکتا۔

ہذا زاہد انکل کے کہنے پر بینک میں ملازمت کی درخواست دی تھی۔ آج تیسرا مہینہ ہونے والا ہے، کوئی جواب نہیں آیا۔ انکل کو دو بارہ فون کر کے پوچھنا ہے کہ درخواست آگے گئی بھی ہے یا ویسے ہی لارا لگا یا ہوا ہے۔

ہذا مولوی صاحب نے اس جمعہ کو صاف صاف کہا

حسن انتخاب



کرنی ہے۔ (بکتے پر بعد میں کراس لگا دیا گیا)

ہذا چھوٹی بہن جو کپڑے پہن رہی ہے، میرے خیال میں نامناسب ہیں۔ مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ بہن نے موبائل فون چھپا کر رکھا ہوا ہے، اس کی خبر امی کو بھی ہے۔ "موت کا منظر مع مرنے کے بعد کیا ہوگا" والی کتاب اور "موبائل فون رحمت نہیں زحمت ہے" والا مضمون فونو کاپی کرا کے ابا، اماں اور بہن میں خاموشی سے تقسیم کرنا ہے۔

ہذا موبائل فون کے میموری کارڈ میں نعتوں کے ساتھ گانوں اور میوزیکل ٹھنڈی کا ایک جگہ ہونا میرے حساب سے غلط ہے۔ سارے گانے اور ڈسکو گھنٹیاں رمضان آتے ہی ڈیلیٹ کر دوں گا۔ ان شاء اللہ

ہذا والدین کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کے ایک ہار سارے ٹیسٹ کرانے چاہئیں۔ سرکاری اسپتال میں تو ذالمت سے ایک دو ٹیسٹ ہی ہوں گے۔ پرائیویٹ اسپتال کا خرچہ کم از کم چار ہزار روپے ہے۔ مولوی صاحب سے مشورہ کرنا ہے کہ قربانی والے جو

آنکھیں کھول دینے والی دستاویز

ایک خودکش حملہ آور کی ڈائری

وہ دکھ و کرب ہوئے بے نقاب جس سے حساس انسان معاشرے میں رہتے بستے گزرتا ہے

شکور راغ

دنوں سے دعائے قنوت ایک جگہ اور چند دعائے جنازہ دو جگہ سے بھول رہا ہوں۔ (استغفر اللہ) اس جمعہ زوال کے بعد کم از کم ۲۰ بار انھیں دہرانا ہے۔

ہذا دودھ والے سے معذرت کرنی ہے کہ بلانے پر بھی مفصل میلا د اور کھانے میں شرکت نہ کر سکا۔ ساتھ یہ بھی پوچھنا ہے کہ جشن میلا د کا دودھ کی قیمت سے کیا تعلق ہے؟ ہر بار جشن میلا د کرا کے وہ دودھ ۲۰ روپے کلو مہنگا کر دیتا ہے۔

ہذا "ٹریٹیک روٹ" والے دن جس پولیس والے نے موٹر سائیکل معمولی سا بڑھانے پر تھپتھپوڑے مارا تھا، اس کا نام پتا معلوم کر کے شیدے کونسلر کے ساتھ تھانے شکایت کرانے جانا ہے۔ اگر قانون میں اس بے عزتی کے لیے کوئی دفعہ وغیرہ ہے تو اسے لگوانے کی پوری کوشش

آخری قسط

چناروں کی قطار

جان اے کریم

پروفیسر محمد فاروق قریشی

اس زمانے کی سبق آموز داستان

جب طاقت کے زعم میں سفید فام سیاہ قاموں پر

بے محابا ظلم ڈھایا کرتے تھے اور قانون بھی مظلوموں کی مدد نہ کر پاتا

2014 Pa

اردو ڈائجسٹ 209

WWW.PAKSOCIETY.COM

2014 Pa

اردو ڈائجسٹ 208

فزل

میلے گا منزل مقصود کا اسی کو سراغ
اندھیری شب میں ہے چپتے کی آنکھ جس کا چراغ
میٹر آتی ہے فرصت فقط غلاموں کو
نہیں ہے بندہ خُر کے لیے جہاں میں فراغ
فروغ مغربیاں عبیرہ کر رہا ہے تجھے
تری نظر کا تمکبیاں ہو صاحب 'مازاغ'
وہ بزم عشق ہے مہمان یک نفس دو نفس
چمک رہے ہیں مثال ستارہ جس کے ایام
کیا ہے تجھ کو کتابوں نے کور ذوق اتنا
صبا سے بھی نہ ملا تجھ کو نئے گل کا سراغ!
(علامہ محمد اقبال)

مسلسل بھونکنے لگتا ہے۔ میں کئی مہینوں سے ذہنی طور پر
پریشان ہوں۔

ہزاروں رات بھراؤچی اور مسلسل آواز میں بھونکنے والے
اس کتے کے ماکان کا گھر معلوم ہو گیا۔ جھگڑا اور
پدمعاش لوگ ہیں لہذا ان سے بات کرنے کا کوئی فائدہ
نہیں، صبر ہی کیا جاسکتا ہے۔

ہزاروں پکھری میں جائز ڈویسائل بناتے ہوئے نہ نہ
کرتے بھی ۸۰۰ روپے رشوت دینی پڑی۔ رشوت دے
کر ملنے والے ڈویسائل سے اگر ملازمت مل گئی تو
خداخواستہ وہ حرام تو نہیں ہوگی؟ یہ بات مولوی صاحب
سے پوچھنی ہے۔ یہ بھی پوچھنا ہے کہ وہ انکم ٹیکس والے
چاپو سے مدرسے کا خرچ کیوں لیتے ہیں؟ حالانکہ مجھے پکا
پتا ہے، وہ وہاں چیز اسی ہے، لیکن تین منزلہ چوبارہ بنا
چکا۔ کیا اس سے چندہ لینا جائز ہے؟

(بشکریہ ماہنامہ نوائے اخلاق، راولپنڈی)



والی دو نمبری ڈی سے کام چلا رہے ہیں۔ اصلی کون لینا
ہے، وہی یعنی ہے۔

ہزاروں پچھلی گلی میں کرایہ داروں کی اینارمل لڑکی اکثر
کریا نہ والے سے بسکٹ چاکلیٹ خریدتی ہے۔ اس کے
گھر والوں کو سمجھانا ہے کہ بے شک وہ اینارمل ہے لیکن
لڑکی ذات ہے، اسے باہر نہ بھیجا کریں۔ خدا معاف
کرے، حالات اچھے نہیں۔

ہزاروں سیزھیاں چڑھتے ہوئے سانس پھول جاتا
ہے۔ پہلی فرصت میں ای سی جی کرائی ہے۔ کمزوری
وغیرہ کے لیے کوئی ٹیسٹ ہوتا ہو تو لکھوا لینا ہے۔
اپنے معمولات بھی درست کرنے ہیں۔ نماز باقاعدہ
پڑھنی ہے۔

ہزاروں مولوی صاحب سے کہنا ہے، اگر مؤذن بزرگ
برانہ مانیں تو میرا ذکر کیے بغیر ان سے کہیں کہ دوران
اذان بلفم زدہ کھانسی سے پرہیز کیا کریں۔ ناگوار
غرضات سے اذان کا سارا لطف نارت ہو جاتا ہے۔

ہزاروں شانی بیچرا جو بچارہ بڑا شریف ہے، اسے بازار
میں سب لوگ چھیڑتے ہیں۔ اسے مشورہ دینا ہے کہ
بینک سے پانچ لاکھ روپے قرضہ لے اور چوڑیوں یا
کپڑوں کی دکان کھول لے۔

ہزاروں میرے کمرے کا دروازہ کھلتے ہی "چراں چراں"
کی آواز آتی ہے۔ اس کے قبضوں میں تیل ڈالنا ہے۔
تھوڑا سا تیل چارپائی کے پچھلے پائے میں بھی ڈالنا ہے۔
پچھلے کے پر بھی گندے ہیں۔ کسی دن سیزھی لگا کر انہیں
صاف کرنا ہے۔

ہزاروں پچھلی گلی والے گھر میں امی کو بھیج کر معلومات
کرنی ہے کہ ایسا کیوں ہے کہ ان کا لاڈلا کتارات ۱۲ بجے
کے بعد جب لوگ نیند یا عبادت میں مشغول ہوتے ہیں،

گزشتہ اساط کی تلخیص

اکتبر سال سیٹھ ہیو برڈ نے چنار کے ایک درخت سے لٹک کر گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال لیا۔ اس نے نہایت عمدہ سیای مائل سوٹ پہن رکھا تھا۔ چونکہ بارش ہو رہی تھی اس لیے وہ کھنٹل طور پر بیجا ہوا تھا۔ وہ خوش مزاج شخص تھا اور اکثر چرچ بھی جاتا تھا۔ اس کی دو سابق بیویاں تھیں جنہوں نے اس سے طلاق لے لی تھی۔ سیٹھ کے دو بچے تھے جو کہیں اور رہتے اور باپ سے بہت کم ملتے تھے۔ سیٹھ ہیو برڈ ایک فارم ہاؤس اور اس کے ارد گرد درختوں سے پُر قطعہ زمین کا مالک تھا اور عمارتی لکڑی کا کامیاب کاروبار کرتا تھا۔ خودکشی سے پہلے سیٹھ نے اپنے ایک ملازم کیلون کو فون کر کے کہہ دیا کہ وہ اسے فلاں جگہ ملے۔ جب وہ وہاں پہنچا تو مسٹر سیٹھ کی گاڑی کھڑی تھی اور ان کی لاش درخت سے لٹک رہی تھی۔ اس نے پولیس کو فون کیا۔ پولیس افسروں نے آکر سیٹھ کی تصویریں لیں اور لاش درخت سے اتار کر ایمبولینس میں رکھی۔ فورڈ کاؤنٹی کا شرف اوزی والز بھی وہاں آ پہنچا۔ وہ سیٹھ ہیو برڈ کو جانتا تھا۔ ایک افسر کیلون کے ساتھ اس کے گھر گیا۔ جہاں اسے ہار جی خانے کے میز پر سیٹھ کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط ملا۔ اس نے لکھا تھا کہ اس نے اپنی جان خود لی ہے اور اس کا پوسٹ مارٹم نہ کیا جائے اور اپنی جھجیز و مٹھن کے بارے میں کچھ ہدایات بھی لکھ دی تھیں۔

فورڈ کاؤنٹی میں جیک بری گینس ایک مشہور اور ٹیک نام وکیل تھا۔ کارل ہیلی کا مشہور مقدمہ جیتنے کے باعث وہ شہرت اور عظمت کی بلندیوں پر پہنچ چکا تھا۔ لیکن اس کے بعد مقدمے کے مخالف دہشت گردوں نے اس کے مکان کو جلا دیا۔ اب وہ کرائے کے معمولی سے مکان میں رہتا تھا۔ مکان کی انشورنس کا معاملہ ابھی تصفیہ طلب تھا۔ چار دہشت گرد اب قید کی سزا بھگت رہے تھے۔ کچھ کہیں اور منتقل ہو چکے تھے۔ اس لیے جیک ہمیشہ ہسپتال ہمارا رکھتا تھا۔ وہ صبح جلدی الٹا اور تیار ہو کر دفتر چلا جاتا۔ اس کی بیوی کارلا اسکول ٹیچر تھی۔ وہ بعد میں تیار ہو کر اپنی بیٹی جتا کو ساتھ لے کر اسکول چلی جاتی تھی۔ جب جیک گھر سے باہر نکلا تو اس نے پولیس افسر لوئی ٹک کو پہلو کہا جسے اوزی والز نے بریگینس جیلی کی حفاظت کے لیے وہاں منتعین کر رکھا تھا۔ وہ جلد اپنی پرانی امریکی گاڑی میں اپنے دفتر کے قریب کھینٹن چوک میں کافی شاپ پر پہنچ گیا۔ کافی پیتے ہوئے اس نے دوستوں سے سیٹھ ہیو برڈ کی خودکشی پر گفتگو کی۔ اس نے سیٹھ کی جائداد اور نکتہ وصیت میں دلچسپی لی کیونکہ اس کا مطلب کسی وکیل کے لیے اچھی خاصی لیس ہوتا ہے۔ جیک حسب معمول کھینٹن چوک میں روزانہ کی چہل قدمی کے بعد اپنے شاندار دفتر میں داخل ہو گیا۔ اس کی سیکرٹری راکسی چلی منزل پر استقبالیہ کمرے میں بیٹھی اور وہ خود بالائی منزل پر بیٹھتا تھا۔ اس روز کی ڈاک میں جیک کو اپنے نام ایک لفافہ ملا جس پر لکھنے والے کا نام سیٹھ ہیو برڈ تحریر تھا۔ اس نے لفافہ احتیاط سے کھولا۔ اس میں سیٹھ ہیو برڈ کا ایک خط برآمد ہوا جس میں اس نے اپنی خودکشی کی اطلاع دی تھی اور اپنی وصیت کے معاملے میں اس کو اپنا وکیل نامزد کیا تھا۔ خط کے ساتھ سیٹھ کی لکھی وصیت بھی تھی جس میں اس نے اپنے دونوں بچوں اور دونوں سابق بیویوں کو جائداد سے یکسر محروم کر دیا تھا اور جائداد کا نوے فیصد حصہ اپنی ملازمہ اور دوست یعنی لینگ کے نام کر دیا تھا جس نے بیماری کے زمانے میں اس کی خدمت کی تھی۔ جیک نے خط اور وصیت کی ایک نقل راکسی کو دی، دو نقل اپنے ڈیبک میں رکھیں اور ایک نقل بینک کے لا کر میں رکھ دی۔ اس کے بعد وہ کاؤنٹی شرف اوزی والز کو ملنے اس کے دفتر گیا۔ دونوں نے تھوڑی دیر سیٹھ ہیو برڈ کی خودکشی اس کی وصیت اور سیاہ فام لیش لینگ کے بارے میں تبادلہ خیال کیا۔

اوزی نے بتایا کہ وہ لیش لینگ کو جانتا ہے۔ وہ ایک چھوٹی آبادی لٹل ڈیلٹا میں رہتی ہے۔ اس کی شادی سائمن لینگ

سے ہوئی ہے جو گھنٹو اور آوارہ ہے اور شراب نوشی کرتا ہے۔ ان کے چار یا پانچ بچے ہیں۔ ایک لڑکا قید خانے میں ہے۔ ایک لڑکی فوج میں ہے۔ لیشی بیٹیا لیس سال کی ہے۔ اس کا تعلق لیمبر ٹیبل سے ہے۔ جیک نے پوچھا کہ کیا آپ سیٹھ ہیو برڈ کو جانتے ہیں۔ اوزی نے کہا کہ اس نے مجھے انتہا ہات میں کامیابی کے لیے دو دفعہ بھوکوں بھوکوں ہزار ڈالر دیے اور ہلے میں کچھ نہیں مانگا۔ وہ کچھ زمین کا مالک تھا اور عمارتی لکڑی کا کاروبار کرتا تھا۔ لیکن ایک ناخوشگوار طلاق میں وہ بہت کچھ کھو بیٹھا تھا۔ اس نے بتایا کہ سیٹھ کی جھجیز و مٹھن کل سہ پہر چار بجے چرچ سے ملحق قبرستان میں ہوگی۔ اس نے فون کر دیا تھا اور اس کے دونوں بچے ہرشل اور ریونا جلد پہنچ جائیں گے۔

ہرشل ہیو برڈ ایک گھنٹے میں مٹھن سے فورڈ کاؤنٹی سیٹھ کے گھر پہنچ گیا۔ پھر اس کی بہن ریونا اور اس کا شوہر آبان ڈیلو بھی پہنچ گئے۔ انہوں نے ایک دوسرے سے رکی تعزیت کی۔ صرف ریونا کافی دیر روتی رہی۔ ہرشل نے اپنے باپ کے بارے میں کوئی جذبات محسوس نہ کیے۔ وہاں ان کی ملاقات سیاہ فام گھریلو ملازمہ لیش لینگ سے ہوئی۔ وہ اس بات پر حیران تھے کہ سیٹھ اس کو پانچ ڈالر فی گھنٹا کے حساب سے معاوضہ ادا کرتا تھا جو کہ بہت زیادہ تھا۔ سیٹھ کے ہمسائے اور چرچ کے دوست خوردنوش کی اشیا کے ساتھ تعزیت کے لیے آ رہے تھے۔ لیشی ان سے کیک اور تعزیت وصول کر رہی تھی کیونکہ سیٹھ کے بچوں نے کسی سے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ جلد ہی انہوں نے سیٹھ کی وصیت اور بینک اکاؤنٹس کے بارے میں سوالات شروع کر دیے۔ دو پولیس افسر آئے اور انہوں نے سیٹھ کی کار واپس کر دی۔ انہوں نے سیٹھ کا وہ خط بھی واپس کیا جو ان کو ڈاکنگ ٹیبل سے ملا تھا اور جس میں سیٹھ نے اپنی جھجیز و مٹھن کی ہدایات دی تھیں۔

ہیری ریکس طلاق کے مقدمات کا ماہر مشہور وکیل تھا۔ وہ طلاق کے مقدمے میں سیٹھ کی دوسری بیوی سائبل کا وکیل تھا۔ اس نے جیک کو بتایا کہ اس مقدمے میں اس نے سیٹھ کا سارا روپیہ لے لیا تھا۔ کافی رقم خوردگی اور باقی موکلہ کو دے دی۔ جیک نے اس سے سیٹھ کی موجودہ جائداد اور مالی حیثیت کے بارے میں استفسار کیا۔ سیٹھ کے وارث گھر کے مٹی سے جھسے میں بیٹھے ہات چیت کر رہے تھے۔ لیشی نے ان کو بچ پیش کیا۔ لیشی نے سنا وہ کہہ رہے تھے جھجیز و مٹھن کے اگلے دن وہ لیشی کو ملازمت سے فارغ کر دیں گے اور گھر کو تالا لگا دیں گے۔

جیک نے اپنے دفتر میں لیشی کو وصیت پڑھنے دی۔ فورڈ کاؤنٹی کے جج ریون ہٹلی نے سیٹھ کی موت کے نو دن بعد اپنی عدالت میں مقدمے کی پہلی سماعت کی۔ کمر عدالت دکلا مدعیان اور ہٹھن سے بھرا ہوا تھا اور سفید فام اور سیاہ فام تماشاخیوں کے دو واضح گروہ نظر آئے۔ جج نے کچھ ضروری معاملات نمٹائے اور سماعت تیس دن کے لیے ملتوی کر دی۔

اسی

دن شام کو جیک، جج ہٹلی سے ملنے اس کے گھر گیا۔ جج نے کہا کہ قصبے میں انواہ پھیل چکی ہوئی ہے کہ جیک ہوٹ ہاؤس خریدنے کی تیاری کر رہا ہے۔ اس نے مشورہ دیا کہ اس وقت صبر کیا جائے ورنہ شکوک پیدا ہوں گے کہ وہ اس مقدمے کی بہتی گنگا میں ہاتھ دھو رہا ہے۔ جج نے یہ بھی کہا

کہ انٹرنل ہیو برڈ کی تلاش جاری رکھی جائے کیونکہ جب تک اس کی موت کی تصدیق نہیں ہوتی، عدالت اسے زندہ تصور کرے گی۔ ۲۰ فروری سوموار کے دن جج ہٹلی نے پیش رفت کا جائزہ لینے کے لیے مقدمے کے تمام دکلا کو کمر عدالت میں بلایا۔ جج نے سب دکلا کو سیٹھ کے اثاثوں کی فہرست

دی اور ان سے کہا کہ اسے خفیہ رکھا جائے۔ اس کے بعد جج نے وکلاء کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ مقدمے سے پہلے فریقین میں سمجھوتے کی تجویز کے بارے میں کیا خیال ہے؟ جج نے تجویز پیش کی کہ اگر ٹیکسوں کی منہائی کے بعد تینوں بڑے دعویداروں ہرشل ریمونا اور لینی میں رقم مساوی بانٹ دی جائے تو ہر ایک کو تقریباً چھتیس لاکھ ڈالر ملیں گے۔ چرچ کو پانچ فیصد حصہ دے دیا جائے اور ہنسل کا پانچ فیصد ٹرسٹ میں محفوظ کر دیا جائے

ہرشل اور ریمونا کے وکلاء نے آمادگی ظاہر کر دی لیکن جیک نے مخالفت کی۔ اس نے کہا کہ وہ ہر قیمت پر سمجھوتے کی وصیت کا دفاع کرے اور کسی سمجھوتے کا حصہ نہیں بنے گا۔ آخر میں جج نے بھی اتفاق کیا کہ اگر جیوری نے یقین کیا کہ مسٹر بیورڈ آخری وقت تک اپنے ہوش و حواس میں تھا تو پھر اسی وصیت پر عمل ہو گا اور اس کے بالغ بچوں کو کچھ نہیں ملے گا۔ جج نے مقدمے کی باقاعدہ کارروائی کے لیے تین اپریل کی تاریخ مقرر کر دی۔ البتہ بیس مارچ کو ایک جائزہ اجلاس منعقد ہو گا۔

اسی رات فورڈ کاؤنٹی کے جنوب میں ایک دلچ کے قریب ایک حادثہ پیش آیا جس میں سائمن لینگ کا ٹرک تیز رفتاری کی وجہ سے ایک نوبونا کار سے ٹکرا گیا۔ حادثے میں بائی اسکول کے دو طالب علم بھائی ہلاک ہو گئے اور سائمن زخمی ہو کر اسپتال پہنچ گیا۔ سائمن مقررہ حد سے زیادہ شراب کے نشے میں ٹرک چلا رہا تھا۔ چنانچہ اس کو طبی امداد کے بعد جیل منتقل کر دیا گیا۔ جیک نے پوریشیا اور لینی کو بتایا کہ اس جرم میں پانچ سے پچیس سال قید ہو سکتی ہے اور جج نکلنے کا کوئی امکان نہیں۔ دونوں خواتین نے اطمینان کا سانس لیا کہ وہ اب لمبا عرصہ ان سے دور رہے گا۔

جیک کا خیال تھا کہ اس مہلک حادثے کے بعد لینگ خاندان فورڈ کاؤنٹی کے تمام افراد کی شدید نفرت کا نشانہ بن جائے گا اور وصیت کے مقدمے میں جیوری بھی جانبدار ہوئے بغیر نہیں رہ سکے گی۔ لینی کے لیے انتہائی ضروری ہو گیا ہے کہ وہ سائمن کے خلاف طلاق کی درخواست دے اور اس کے ساتھ ہر قسم کا تعلق ختم کر دے۔ طلاق کے ماہر وکیل ہیری ریکس نے لینی کو طلاق کی درخواست فائل کرنے کا طریقہ سمجھایا اور کہا کہ سائمن پر ہر ممکن الزام لگا دو۔ وہ جیل میں ہونے کی وجہ سے ویسے بھی دفاع نہیں کر سکے گا۔ اس نے زور دیا کہ طلاق کی تشہیر بھی بڑی پیمانے پر ضروری ہے۔

لینی کو فون پر دھمکیاں ملنا شروع ہو گئی تھیں۔ شریف اوزی والز نے اپنے نائب ولی سسٹنکو کو بھیجا کہ وہ لینی کو تسلی دے اور انھیں تحفظ دینے کے لیے گھر کے قریب رہے۔ لینی نے ولی کو تعزیت اور ہمدردی کا ایک خط دیا جو اس نے ٹرک حادثے میں مرنے والے بھائیوں کے والدین مسٹر اور مسز راسنن کے نام لکھا تھا۔ اس نے درخواست کی کہ وہ خط ان تک پہنچا دیا جائے۔ جمعرات کے دن صبح سویرے سائمن لینگ کو جیل میں بیدار کر کے اسے کاؤنٹی جج کے سامنے پیش کیا گیا۔ جج نے اس پر فرد جرم عائد کر دی جس کا اس نے انکار کیا۔ اس کے وکیل آرتھر ویلٹے نے درخواست ضمانت پیش کی۔ جج نے درخواست منظور کرتے ہوئے بیس لاکھ ڈالر کے عوض ضمانت پر رہا کرنے کا حکم دیا اور زر ضمانت کی ادائیگی تک اس کو جیل بھیج دیا۔

جمعہ کی صبح مسز راسنن جیک کے دفتر پہنچ گئے۔ انھوں نے کہا کہ لینی لینگ ایک شائستہ خاتون ہے۔ اس نے ہمیں تعزیت اور ہمدردی کا خط بھیجا ہے۔ ہم اس کے

شکر گزار ہیں۔ نیز یہ کہ انھوں نے مسج علیہ السلام کی تعلیم کے مطابق سائمن لینگ کو معاف کر دیا ہے کیونکہ یہ نفرت سے بہتر ہے۔ اس نے یہی الفاظ پوریشیا سے بھی کہے۔ پوریشیا نے نمناک آنکھوں سے ان کا شکر یہ ادا کیا۔

ویڈ لیسنر کے تحقیق کنندہ رینڈل کلیپ نے ایک اور معرکہ سر کر لیا جب اس نے فلورڈا کے قریب جار جیا میں ایک انتالیس سالہ مطلقہ پرکشش سیاہ قام عورت جو لینا کنڈ کو ڈھونڈ نکالا۔ وہ جار جیا میں ایک بڑی فرنیچر فیکٹری میں کام کرتی تھی جسے پانچ سال قبل سمیٹھ بیورڈ نے خرید لیا۔ ایک ماہ بعد اسے ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ ایک ہفتہ بعد اس نے سمیٹھ کے خلاف جنسی استحصال کی درخواست دائر کر دی۔ اس کا وکیل کلیپ کو تفصیل بتانے پر آمادہ نہ تھا۔

کلیپ نے جو لینا کو دو سو ڈالر نقد اور لٹچ کی پیشکش کر دی تاکہ وہ اس کے سوالات کا جواب دے۔ اس نے بتایا کہ سمیٹھ نے آتے ہی اس کی تنخواہ میں اضافہ کر دیا اور اپنے دفتر میں ایگزیکٹو سیکرٹری بنا دیا۔ سمیٹھ کی دو فیکٹریاں میکسیکو میں بھی تھی۔ اس نے جو لینا کو اپنے ساتھ میکسیکو جانے کی دعوت دی جسے اس نے قبول کر لیا کیونکہ وہ باہر کی دنیا دیکھنا چاہتی تھی۔ وہاں اس نے سمیٹھ کے ساتھ ایک رات گزار دی اور اگلے دن جب وہ اپنے کام کے لیے باہر نکلا تو وہ پہلی پرواز سے واپس آگئی۔ ایک ہفتے بعد سمیٹھ نے واپس آتے ہی اس کو برطرف کر دیا۔ جواب میں اس نے سمیٹھ کے خلاف جنسی استحصال کا مقدمہ دائر کر دیا۔ لیکن مقدمہ چلنے سے پیشتر ہی وکلاء کی کوششوں سے سمجھوتہ ہو گیا اور سمیٹھ نے اس کو ۱۲۵۰۰۰ ڈالر ادا کیے۔

یہ ویڈ لیسنر کے لیے ایک اور تھک تھا جسے وہ مقدمے کی کارروائی کے دوران جیوری کو متاثر کرنے کے لیے استعمال

کر سکتا تھا۔ سائمن لینگ کے حادثے کے ایک ہفتے بعد فورڈ کاؤنٹی ٹائمز نے پہلے صفحے پر تصادم سے مزین تفصیلی کہانی شائع کی جس کی سرخی تھی ”کاؤنٹی راسنن بھائیوں کی موت کا سوگ منا رہی ہے۔“ اس کے ساتھ دونوں بھائیوں کی بڑی تصاویر، ان کے جنازوں کی تصویریں تھیں۔ نیز گلڈنٹن بائی اسکول کے بچے اپنے ساتھیوں کی یاد میں شمعیں روشن کیے ہوئے دکھائے گئے تھے۔ کہانی میں جیک اور سمیٹھ بیورڈ مقدمے کا کوئی ذکر نہ تھا۔

یہ جیک کی اس دھمکی کا اثر تھا جو اس نے رپورٹر ڈومازلی کو دی تھی کہ اس کا نام سائمن کے ساتھ منسلک نہ کیا جائے کیونکہ وہ اس کا وکیل نہیں۔ جیک نے یہ اخباری کہانی صبح سات بجے پڑھ لی۔ آٹھ بجے اسے سٹل مین رش کا فون آیا کہ ہرشل نے اس کو وکالت سے برطرف کر دیا ہے۔ جیک کو کچھ سکون تو محسوس ہوا لیکن اس کو زیادہ تجربہ کار اور خطرناک ویڈ لیسنر سے حقیقی خطرہ تھا کیونکہ وہ مقدمے کو کوئی بھی رخ دینے کی اہلیت رکھتا تھا۔ لینی تین ماہ سے ہیرا دگرار اور کام کی تلاش میں تھی۔

جیک کا خیال تھا کہ مقدمے کی کارروائی سے پہلے اس کا کام پر ہونا بہت ضروری ہے تاکہ جیوری کے ارکان یہ نہ سمجھیں کہ وہ سمیٹھ کی دولت پر عیش کر رہی ہے۔ اسی لیے جب پوریشیا نے جیک کو بتایا کہ اس کی والدہ کو سمیٹھ ڈسٹ چارج کے اسکول میں صفائی کا کام مل گیا ہے تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

جیک بریکنس مارچ کی ایک خوشگوار سہ پہر جج اسٹبل سے اس کے پورچ میں ملا۔ موقع مناسب جان کر جیک نے جج سے کہا کہ فورڈ کاؤنٹی سے منتخب کیے جانے والے جیوری کے ارکان سب متعصب ہو چکے کیونکہ یہاں ”لینگ“ ناپسندیدہ نام بن چکا ہے۔ اس لیے یہاں

یعنی کو انصاف نہیں مل سکتا۔ جج نے اپنے تحفظات کا اظہار کیا۔ لیکن بالآخر جیک سے کہا کہ وہ مقدمے کی جگہ کی تبدیلی کے لیے درخواست دے اور وہ اس پر سنجیدگی سے غور کرے گا۔

یعنی کو اپنے حقیقی والدین کا علم نہ تھا۔ اس کو تیس سال کی عمر میں پتا چلا کہ سائپرس اور اس کے شوہر نے اس کو لے پالک کے طور پر پالا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کا تعلق رنڈز خاندان سے ہے جو فورڈ کاؤنٹی میں زمینوں کے مالک تھے۔ اس خاندان کے لوگ پچاس سال قبل فورڈ کاؤنٹی سے فلورڈا منتقل ہوئے تھے اور سرکاری طور پر ان کا کوئی ریکارڈ دستیاب نہیں تھا۔ پورٹیا اور لیوسین یعنی کے شجرہ نسب کو دریافت کرنے پر سنجیدگی سے کام کر رہے تھے اور وہ اس سلسلے میں رنڈز خاندان کے کئی افراد سے رابطہ قائم کر چکے تھے لیکن ابھی تک انھیں یقینی طور پر کوئی ثبوت ذیل نکالا تھا۔

جیک اور کارلا کے چلائے گئے گھر کے معاوضے کا معاملہ ابھی تک انشورنس کمپنی کے ساتھ الجھا ہوا تھا اور جیک کے لیے سخت پریشانی کا باعث تھا۔ انشورنس کمپنی ایک لاکھ ڈالر ادا کرنے کو تیار تھی جب کہ جیک ڈیڑھ لاکھ پر مصر تھا۔ ہیری ریکس نے بغیر کسی فیس کے ان کا معاملہ ایک لاکھ پینتیس ہزار ڈالر پر طے کر دیا جس پر جیک اس کا بے حد ممنون ہوا۔ ہیری کا مشورہ تھا کہ اب اسے ہوٹل پاؤس خرید لینا چاہیے۔ جیک بھی یہی چاہتا تھا لیکن کافی رقم نہ ہونے کے باعث خاموش تھا۔

۲۰ مارچ کی تاریخ مقدمے سے قبل کانفرنس کے لیے مخصوص کی گئی تھی۔ اس دن جج ہٹلی نے کمر عدالت میں وکلا سے پوچھا کہ کیا وہ تین اپریل کو مقدمے کے ہاتھ آواز کے لیے تیار ہیں؟ سب نے اتفاق کیا۔ جج

نے ستانوں ناموں پر مشتمل جیوری کی فہرست دکلائی تقسیم کی اور انھیں ہدایت کی کہ وہ اس کو خفیہ رکھتے ہوئے ناموں کا جائزہ لیں لیکن کسی بھی فرد کو متاثر کرنے، قائل کرنے یا دھمکانے کے لیے کوئی براہ راست رابطہ نہ کیا جائے۔ بڑے مقدمات میں جیوری کو منتخب کرنے کے لیے ماہر مشیر اہمیت اختیار کر چکے تھے۔ چنانچہ کانفرنس سے فارغ ہوتے ہی وکلا نے اپنے اپنے مشیروں کو جیوری کی فہرست تھما دی اور جیوری کے ممکنہ ارکان کے بارے میں تحقیق اور معلومات جمع کرنے کا کام زور شور سے شروع ہو گیا۔

الاسکا کے شہر جونو کے ایک سے خانے میں ایک بحری جہاز کے روٹی عملے نے نشے میں بنگامہ کھڑا کر دیا۔ مالک کی عدم موجودگی میں لونی کلارک کاروبار اور نظم و نسق کا ذمہ دار تھا۔ جب ان شرابیوں نے بدتمیزی اور ہلڑ پازی کی انتہا کر دی تو لونی نے مداخلت کی لیکن ان میں سے کسی ایک نے اس کے سر پر کسی بھاری چیز سے وار کر دیا۔ لونی گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ وہ دو دن اسپتال میں بے ہوش گزارا رہا۔ اس کا سر پھٹ چکا تھا۔ جب پولیس نے تحقیق شروع کی تو سے خانے کا مالک لونی کی شناخت کے سلسلے میں کوئی دستاویزی ثبوت پیش کرنے سے قاصر رہا۔ جب اس کی رہائش گاہ کی تلاش لی گئی تو وہاں سے مختلف ناموں پر ایک جعلی ڈرائیونگ لائسنس، دو جعلی پاسپورٹ، ایک چوری شدہ ڈرائیونگ لائسنس اور ایک ہینسل ایف ہیورڈ کا ۱۹۵۵ء کا جاری کردہ بحریہ سے سبکدوشی کا خط ملا۔ علاوہ ازیں پلاسٹک کے ایک بگ میں دو ہزار ڈالر نقد اور تیس گلو کوئین کا ایک ڈھانچا جس کی مارکیٹ میں قیمت پندرہ لاکھ ڈالر تھی۔ جب لونی ہوش میں آیا تو پولیس نے اس سے اس کی شناخت کے بارے میں سوالات کرنا شروع کیے

لیکن اس نے کسی سوال کا بھی تسلی بخش جواب نہ دیا۔ جج ہٹلی کی منظوری سے الہبرٹ مزے کئی ماہ سے ہینسل ہیورڈ کو تلاش کرنے پر مامور تھا۔ اب اچانک اس نے جیک کو خبر دی کہ الاسکا میں ہینسل ہیورڈ کا پتا چلا ہے لیکن وہاں وہ لونی کلارک کے نام سے کام کر رہا ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ چھیا سٹھ برس کا ہے اور منشیات کے کاروبار میں بھی ملوث ہے۔ جب لیوسین کو یہ معلومات ملیں تو وہ فوراً ایک پرواز سے شکاگو، دوسری سے سپٹل اور تیسری سے الاسکا پہنچ گیا۔ اسپتال پہنچ کر لیوسین نے ہینسل ہیورڈ کو اس کا ماضی یاد دلایا لیکن اس نے کوئی جواب دینے سے احتراز کیا۔

جیک اپنے دفتر میں فون پر بے حد مصروف تھا۔ وہ ویڈیو کے پیش کردہ گواہان کے ساتھ رابطہ کرنے کی کوششیں کر رہا تھا۔ اس دوران ہیری ریکس اندر داخل ہوا۔ اس نے ایک لفافہ جیک کی طرف بڑھایا "یہ تمہاری انشورنس کمپنی کی طرف سے ایک لاکھ پینتیس ہزار ڈالر کا چیک ہے۔ اس کے لیے وکیل کی کوئی فیس نہیں لہذا تم مجھے کسی وقت کھانے کی دعوت دو گے۔"

"شکر ہے" جیک نے کہا۔ جیک کو اپنے پرانے مکان کے جانے کا تم تھا اور تصفیہ ہو جانے کی خوشی بھی۔ گروی کی رقم ادا کرنے کے بعد ان کو تقریباً چالیس ہزار ڈالر نقد بیج جائیں گے۔ اسی رات جیک اور کارلا نے ونی کے ساتھ دو لاکھ پچاس ہزار ڈالر میں ہوٹل ہاؤس خریدنے کا سودا طے کر لیا۔ اگلے تین ماہ میں دستاویزات مکمل ہونے کے بعد وہ مکان کے مالک بن جائیں گے۔

تین اپریل کی صبح تمام وکلا، موکلین اور جیوری ارکان کمر عدالت میں جمع تھے۔ جج ہٹلی نے ستانوں میں سے پہلے پچاس کو ترتیب سے بنھایا۔ باقیوں کو فی الحال

فارغ کر دیا۔ کچھ ارکان کو جائزہ جوہ کی بنا پر جیوری ڈیوٹی سے مستثنیٰ کر دیا۔ باقی ارکان سے انفرادی طور پر کچھ سوالات کیے گئے جن کا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ کیا وہ اس مقدمے کے بارے میں پہلے سے کچھ جانتے ہیں، کوئی اپنی رائے رکھتے ہیں اور مقدمے کے فریقین سے ذاتی تعلق رکھتے ہیں؟ جن کے بارے میں یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ وہ غیر جانبدار نہیں رہ سکیں گے۔ ان کو جیوری ڈیوٹی سے فارغ کر دیا گیا۔

آخر میں جج ہٹلی نے جیک اور ویڈیو سے دریافت کیا کہ وہ موجودہ افراد میں سے کس کس کو جیوری میں رکھنا پسند کریں گے؟ دونوں وکلا کی کانت چھانٹ کے بعد بالآخر ہارہ افراد کو حتمی طور پر منتخب کر لیا گیا۔ ان میں دس سفید فام اور دو سیاہ فام، یہ کل آٹھ خواتین اور چار مرد تھے۔ ان کے علاوہ دو متبادل ارکان بھی منتخب کیے گئے۔ عدالت کا یہ پہلا اجلاس صبح نو بجے سے شام سات بجے تک جاری رہا۔

الاسکا سے لیوسین نے اطلاع دی کہ اسپتال میں پڑا زخمی لونی کلارک ہی اصل میں ہینسل ہیورڈ ہے۔ لیکن اس کی حالت سفر کرنے کی کے قابل نہیں۔ نیز اس پر کوئین رکھنے کا الزام ہے اس لیے وہ پولیس کو مطلوب ہے۔ وہ اسے جیل لے جانے کے لیے تیار ہیں۔ جیک اور اس کے ساتھیوں کا خیال تھا کہ اس مرحلے پر ہینسل ہیورڈ کی موجودگی کی خبر مقدمے کی کارروائی پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتی۔ اس لیے بھی کہ عدالت کے سامنے اصل مسئلہ سیتھ کی وصیت کا ہے، ہینسل کا نہیں۔

مقدمے کی کارروائی کے دوسرے دن یعنی بروز منگل جیک پریکٹس نے بحث کا آغاز کیا۔ اس نے جیوری ارکان کو مخاطب کرتے ہوئے مختصراً سیتھ ہیورڈ کی صحت

سے کمائی ہوئی دولت، اس کی اذیت ناک بیماری، خودکشی اور ہاتھ سے لکھی آخری وصیت پر روشنی ڈالی۔ اس نے کہا کہ سیتھ آخری وقت تک صحیح دماغی حالت میں تھا اور اس نے اپنی خودکشی سمیت ہر کام طے کر دیا منصوبے کے مطابق انجام دیے۔ اس نے واضح کیا کہ جیوری کا کام سیتھ ہیورڈ کے چوبیس ملین ڈالر کو اس کے نامزد کردہ وارثان میں تقسیم کرنا نہیں بلکہ انھوں نے صرف یہ فیصلہ کرنا ہے کہ کیا وصیت لکھتے وقت سیتھ ہیورڈ اپنے مکمل ہوش و حواس میں تھا اور وہ جانتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے؟ اس لیے جیوری کے فاضل ارکان اس بات پر توجہ مرکوز رکھیں کہ متوفی اپنے آخری ایام میں مکمل دماغی صحت کا مالک تھا یا نہیں اور یہ کہ کیا اس نے اپنی مرضی سے اپنی وصیت سے اپنے بچوں کو خارج اور بڑا حصہ اپنی خدمتگار لینی لینگ کے نام کیا یا اس نے یہ فیصلہ کسی شخص یا دہاؤ کے زیر اثر کیا۔

جیک کے بعد ویڈیو نے جیوری ارکان سے خطاب کیا۔ اس نے کہا کہ سیتھ نے اپنی خودکشی سے ایک سال پہلے ایک وصیت ایک قانونی فرم سٹل مین رش لاکھنی سے تیار کروائی تھی جس میں اس نے اپنی جائداد اپنے دونوں بچوں اور ان کے بچوں میں تقسیم کی تھی۔ یہی وصیت کا مقبول طریقہ ہے اور جائداد مرحوم کے خاندان میں تقسیم ہونی چاہیے۔ لیکن سیتھ ہیورڈ نے اپنی خودکشی سے ایک دن پہلے اپنے ہاتھ سے ایک نئی وصیت لکھی جس میں اس نے اپنے حقیقی بچوں کو وصیت سے خارج کر دیا اور جائداد کا نوے فیصد حصہ گھر کی دیکھ بھال اور اس کی خدمت کرنے والی لینی لینگ کے نام کر دیا۔

اس نے دعویٰ کیا کہ سیتھ نے یہ اقدام اپنی آزادانہ سوچ کے ساتھ نہیں بلکہ لینی لینگ کے زیر اثر کیا کیونکہ وصیت کی تحریر کے وقت بھی وہ اس کے پاس موجود تھی اور

دونوں گھنٹوں تک تھلے میں تھے۔ اس لیے جیوری کے ارکان کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ سیتھ نے اپنے بچوں کو جائداد سے محروم کیوں کیا؟ اور کیا وہ ایسا کسی نامناسب اثر کے بغیر کر سکتا تھا؟

اس کے بعد جیک نے شریف اوزی والز کو گواہ کے طور پر بلایا اور اس سے سیتھ کی موت کے بارے میں سوالات کیے۔ اوزی والز نے جوابات دیے اور ثبوت کے طور پر سیتھ کی خودکشی کی تصاویر پیش کیں اور کیلون کے نام سیتھ کا لکھا ہوا نوٹ بھی پیش کیا۔ یہ چیزیں جیوری ارکان کو دکھائی گئیں۔ بعد ازاں جیک نے اپنے نام لکھا ہوا سیتھ کا اصل خط تجزیہ و تکفین کی ہدایات اور وصیت کے کاغذات پیش کیے۔ یہ دستاویزات تمام حاضرین کو اسکرین پر بڑی کر کے دکھائی گئیں اور تمام جیوری ارکان کو ان کی نقول فراہم کی گئیں۔ جج نے تمام ارکان کو ان دستاویزات کا مطالعہ کرنے کے لیے وقت دیا۔ عدالت نے بارہ بج کر تیس منٹ پر کارروائی میں ڈیڑھ گھنٹے کا وقفہ دیا۔

کارروائی دوبارہ شروع ہوئی تو جیک نے آئرش روڈ کرچین چرچ جانے والے سیتھ کے شناسا مرد و خواتین کو ہاری ہاری گواہ کے طور پر بلایا۔ ان سب نے تصدیق کی کہ سیتھ نے اپنی خودکشی سے چند گھنٹے پہلے اتوار کے دن چرچ سروس میں شرکت کی۔ اس نے معمول کے مطابق سب سے بات چیت کی۔ اس نے چرچ کو پانچ سو ڈالر کا چند بھی دیا۔ اس کا رویہ دوستانہ اور معقول تھا۔ ان کے بعد میڈیکل سنٹر نو پیلو کے ڈاکٹر نالبرٹ نے سیتھ کو کینسر اور اس کے علاج کے بارے میں بتایا۔ اس نے کہا کہ وہ آخر وقت تک چاقو چوبند اور پر عزم تھا۔

ویڈیو نے ڈاکٹر سے سوالات کیے اور ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اگر درد دور کرنے والی دوا ڈیمیرال (Demerol) کی دن میں سو ملی گرام کی جتنے سے آٹھ خوراکیں لی جائیں تو مریض کو اہم فیصلے کرنے میں رقت ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر کے بعد جیک نے سیتھ کی دفتری سیکرٹری آر لین کو بلایا۔ اس نے تصدیق کی کہ سیتھ اپنی زندگی کے آخری ہفتے میں باقاعدگی سے دفتر آتا رہا۔ وہ اپنی معمول کی سرگرمیوں میں مصروف رہتا اور اکثر فون کرتا تھا۔ البتہ دوپہر کو صوفے پر آرام کرتا وہ زیادہ کھاتا پیتا نہیں تھا لیکن تمباکو نوشی کرتا۔ سیتھ نے دفتر میں اپنے آخری دن بھی اپنی کچھ زمینیں فروخت کیں اور معاہدے پر دستخط بھی کیے۔

ایٹلس ہیورڈ مکمل کی صبح تک اسپتال میں پولیس کی نگرانی میں تھا۔ لیوسین نے اس دن الاسکا کے پہاڑی مناظر سے لطف اندوز ہونے کا فیصلہ کیا۔ وہ ایٹلس کی مسلسل بیماری سے تنگ آ چکا تھا۔ اس نے اگلے دن واپسی کا ارادہ کر لیا تاکہ مقدمے کی کارروائی دیکھ سکے۔ شام کو وہ اپنے ہوٹل کی لابی میں سے نوشی کر رہا تھا جب اچانک ایٹلس نمودار ہوا اور اس کے سامنے میز پر آ بیٹھا۔ لیوسین اس کو سامنے دیکھ کر بڑبڑا گیا۔ صبح تک تو وہ اسپتال میں بیہوش پڑا تھا۔ ایٹلس نے اسے بتایا کہ وہ اسپتال سے تنگ آ گیا تھا۔ اس لیے جب کوئی ارد گرد نہیں تھا تو وہاں سے کھسک گیا۔ نیچے ت خانے میں اس نے کپڑے تبدیل کیے اور باہر نکل آیا۔

”یہ چھوٹا سا قصبہ ہے تم یہاں زیادہ دیر تک چھپ نہیں سکتے۔“ لیوسین نے کہا۔

”میرے یہاں کچھ دوست ہیں میں ان کے ہاں چھپ سکتا ہوں۔“

بدھ کی صبح مقدمے کی کارروائی کے آغاز پر جیک نے لینی لینگ کو اہم گواہ کے طور پر بلایا۔ لینی نے اپنے خاندان اپنے شوہر اپنے کام اور سیتھ ہیورڈ کے بارے میں جیک کے سوالات کے جوابات بڑے اطمینان اور تحمل سے دیے اور حاضرین نے توجہ سے سنا۔ اس نے تصدیق کی کہ مسٹر ہیورڈ خودکشی سے ایک دن پہلے ٹھیک ٹھاک دماغی حالت میں تھے اور ہر چیز ان کی مکمل گرفت میں تھی۔

ویڈیو نے اپنی جرح شروع کی اور لینی سے اس کے سابق آجروں کے بارے میں پوچھا۔ اس نے گزشتہ بیس سال کے دوران مختلف خاندانوں کا نام لیا جہاں وہ کام کر چکی تھی لیکن اس نے مسز پکرنگ کا ذکر نہ کیا۔ اس پر ویڈیو نے جج کی اجازت سے فرنٹ پکرنگ کو گواہ کے طور پر بلایا جس نے تصدیق کی کہ لینی لینگ نے کچھ عرصہ اس کی والدہ مسز پکرنگ کے ہاں کام کیا تھا لیکن جب مسز پکرنگ بیمار ہو گئیں تو فرنٹ اور اس کی بہن کو گھر سے مسز پکرنگ کی ہاتھ سے لکھی ہوئی ایک وصیت ملی جس میں لینی لینگ کے نام پچاس ہزار ڈالر چھوڑے گئے تھے۔

فرنٹ اور اس کی بہن نے وہ وصیت لینی کو دکھائی تو اس نے مکمل لاعلمی کا اظہار کیا۔ تاہم انھوں نے لینی کو کام سے فوری طور پر فارغ کر دیا۔ لینی اس گواہی کے دوران خاموش رہی اور اس کا سر جھکا رہا۔ جیک نے فرنٹ پر جرح کے دوران ثابت کیا کہ اس نے یہ گواہی سات ہزار پانچ سو ڈالر کے عوض دی ہے۔ اور ان کے درمیان یہ معاملہ ایک ماہ پہلے طے ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کی والدہ کی وصیت کی نقل اس کے پاس محفوظ تھی جبکہ حقیقت میں وہ اسے گناہ

خط کے طور پر ملی تھی۔

لیوسین نے ایک وکیل کے دفتر میں اینٹسل ہیو برڈ کے بیان طغنی کو ریکارڈ کرنے کا انتظام کیا۔ ایک عدالتی رپورٹ اور فونو گرافرنے اس کے طویل بیان کو مکمل طور پر ریکارڈ کر لیا۔ اس کے بعد لیوسین نے واپسی کے لیے ہوائی اڈے کا رخ کیا اور اینٹسل نے لیوسین کے ہوٹل کی راہ لی جہاں ایک پولیس والا اس کا منتظر تھا۔

وقفے کے بعد عدالتی کارروائی شروع ہوئی تو ویڈیو نے برشل ہیو برڈ اور ریوٹا ہیو برڈ ڈیفنڈ کو گواہی کے لیے ہاری ہاری پیش کیا۔ دونوں نے سوالات کے رٹنے رٹائے جوابات دیے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ اور ان کے بچے سیتھ ہیو برڈ کے بہت قریب تھے اور ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ تاہم جیک کی جرح کے دوران یہ واضح ہو گیا کہ وہ جھوٹ بول رہے تھے۔ جیوری ارکان بھی ان سے زیادہ متاثر نہیں ہوئے۔

وقفے میں یعنی لینک نے جیک سے کہا کہ اس کا مسز پکریگ کی وصیت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ کارروائی کے آخر میں ویڈیو نے جو لینا کڈ کو گواہی کے لیے بلایا۔ جو لینا ایک سیاہ فام عورت تھی جو سیتھ ہیو برڈ کی ایک فیکٹری میں کام کرتی تھی۔ اس نے بیان دیا کہ اس نے پیسوں کے عوض سیتھ کے ساتھ قربت کی تھی۔ جب اس نے یہ عمل جاری رکھنے سے انکار کیا تو سیتھ نے اسے ملازمت سے برطرف کر دیا۔ جواب میں اس نے سیتھ پر مقدمہ دائر کیا اور سیتھ نے کچھ رقم ادا کر کے اس کے ساتھ تصفیہ کر لیا۔ لیونر اس گواہ کے ذریعے یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ سیتھ ہیو برڈ رنگ کے امتیاز کے بغیر اپنی ملازم عورتوں سے تعلق قائم کرنے کا

شائق تھا۔ بدھ کے دن کی کارروائی میں ویڈیو نے دو زور دار حملے کیے جن سے یعنی لینک کی پوزیشن کو نقصان پہنچا اور جیک سخت مایوسی کا شکار ہوا۔

جمعرات کے دن ویڈیو نے دو اکڑ ایک ٹیکس وکیل ایک لینڈ بروکر اور سیتھ کی بیوی لبر کھنی کے نائب صدر کو بطور گواہ پیش کیا۔ ان سب نے تصدیق کی کہ سیتھ اپنی شدید بیماری اور دواؤں کے زیر اثر زندگی کے آخری ایام میں اچھی طرح سوچنے سمجھنے کی اہلیت سے محروم ہو چکا تھا اور اس کی یادداشت بھی متاثر تھی۔

جمعہ کی صبح عدالت کے وقت سے پہلے لیوسین الا سکا سے واپس کھینٹن پہنچ گیا اور اپنے ساتھ اینٹسل ہیو برڈ کے نوٹری پبلک کے سامنے ریکارڈ شدہ بیان کی کیسٹ لایا۔ جیک اور بیوری ریکس نے دفتر میں وہ کیسٹ سنی اور فیصلہ کیا کہ اس سلسلے میں جج اینٹلی سے بات کرنی چاہیے۔ خوش قسمتی سے جج نے کیسٹ سننے کے بعد کہا کہ اس کا تعلق ہیو برڈ اور اینٹلی کے خاندانوں کی تاریخ سے ہے اور اس سے سیتھ ہیو برڈ کے ارادے کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ چنانچہ کرا عدالت میں بڑی اسکرین پر وہ کیسٹ جیوری کو سنوائی گئی۔ اینٹسل ہیو برڈ نے اپنے بیان میں کہا:

”تیرہ سال کی عمر میں میں نے گھر چھوڑ دیا اور بحری فوج میں شمولیت اختیار کر لی۔ میں نے ہر جگہ ڈیوٹی انجام دی۔ جنگ میں بھی حصہ لیا۔ فوج سے فراغت کے بعد میں جاپان سری لنکا ٹریڈنگ اور بہت سی دوسری جگہوں پر رہا۔ میں نے دنیا دیکھی۔ میں نے جہاز دان کمپنیوں میں بھی کام کیا۔ جہاں دل چاہا ڈیرا لگا لیا۔ سیتھ، میرا بھائی مجھ سے پانچ سال بڑا تھا۔ ہمارا باپ کلی اون ہیو برڈ بڑا ظالم اور جاہل شخص تھا۔ وہ

ہم سے کھیتوں پر سخت مشقت لیتا اور اکثر مارتا تھا۔ وہ ہماری والدہ کو بھی مارتا۔ ہماری زندگی مشکل اور مصائب سے بھر پور تھی۔

”ہمارے پاس اسی ایکڑ کا خاندانی فارم تھا۔ وہ ہیں ہم ایک پرانے گھر میں رہتے جو میرے دادا نے تعمیر کروایا تھا۔ ہمارے فارم کے ساتھ رنڈز خاندان کا اسی ایکڑ کا فارم تھا۔ رنڈز فارم کا مالک سلوسٹر رنڈز تھا۔ اس کا خاندان وہاں کئی برس سے آباد تھا۔ میں اور سیتھ اپنے باپ سے چھپ کر رنڈز لڑکوں کے ساتھ کھیلنے جاتے تھے۔ ہیو برڈ خاندان کے لوگ سمجھتے تھے کہ اس زمین پر ان کا حق ہے۔ میرے باپ اور سلوسٹر کے درمیان مقدمہ بازی بھی ہوئی لیکن سلوسٹر کا قبضہ برقرار رہا۔ اس سے کلی اون ہیو برڈ پیش میں آ گیا۔ وہ یہ برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ ان آزاد سیاہ فام غلاموں کی جائداد اس کے برابر ہو۔ وہ ختم مزاج کینڈ اور نفرت کرنے والا شخص تھا۔ ہم اس سے ہمیشہ دہشت زدہ رہتے تھے۔

”ایک دن کلی اون ہیو برڈ نے تین چار ٹرکوں میں آدمی بلائے۔ یہ غالباً اگست ۱۹۳۰ء کی بات ہے۔ پہلے انھوں نے سلوسٹر رنڈز کو زمین پر گرایا اور اس کو خوب زد و کوب کیا۔ پھر اس کو اٹھا کر ایک کھلے ٹرک کے اوپر پھینکا اور ایک رسہ اس کے گلے میں کس کر باندھ دیا۔ کچھ آدمیوں نے دوسرا سراجھار کے ایک درخت کی بلند اور موٹی شاخ کے اوپر سے گزار کر کھینچا۔ اس کے پاؤں ٹرک کو چھو رہے تھے۔ پھر انھوں نے ٹرک کو حرکت دی اور سلوسٹر رنڈز اس سے لنگ گیا۔ اس نے تڑپنا شروع کر دیا۔ جلد ہی اس کا جسم ساکت ہو گیا۔

”اس کی بیوی، گھسٹرا اپنے گھر کے سامنے چنچ پکار

کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ چھوٹی بچی تھی جس کے جسم پر کپڑا تھا نہ پاؤں میں جوتی۔ اگلے دن کلی اون ہیو برڈ دو بار وہاں گیا۔ اس نے گھسٹرا کو چند ڈالر دیے اور اسی ایکڑ اراضی کے بیچ نامے پر دستخط کروا لیے۔ پھر اس کے آدمیوں نے رنڈز خاندان کے مکانات نذر آتش کر دیے اور مکینوں کو وہاں سے بے دخل کر دیا۔ تمام رنڈز وہاں سے منتشر ہو گئے۔ ہمیں بعد میں پتا چلا کہ سلوسٹر رنڈز کی ایک ہی اولاد تھی اور اس کا نام لونی رنڈز تھا۔ ہم نے یہ خوفناک منظر درختوں میں چھپ کر دیکھا۔ ہم گھر آ کر روتے رہے۔ ہم نے اپنے باپ کے خوف سے کسی کو نہیں بتایا۔ میں جب سے گھر سے بھاگا۔ تو پھر کبھی واپس نہیں گیا۔ نہ میرا کسی سے رابطہ رہا۔ میں اب تک بھاگ رہا ہوں۔ یہ میری کہانی ہے۔“

اینٹسل ہیو برڈ کی کہانی سننے کے بعد یکدم عدالت کا ماحول تبدیل ہو گیا۔ جیوری ارکان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ سیتھ نے ایسا کیوں کیا؟ یہ معنی حل ہو گیا۔ سب جان گئے کہ سیتھ نے اس ظلم و زیادتی کی تلافی کرنے کی کوشش کی جو اس کے باپ نے یعنی کے آہا اجداد کے ساتھ کی تھی۔ جیوری ارکان نے متفقہ طور پر سیتھ کی ہاتھ سے لکھی وصیت کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ جتنے کی صبح تک یعنی لینک مقدمہ ہار رہی تھی لیکن اینٹسل کی گواہی نے نقشہ مکمل طور پر تبدیل کر دیا۔ یعنی بہت جلد فورڈ کاؤنٹی میں امیر ترین سیاہ فام عورت بننے والی تھی۔ وہ اپنے آبائی فارم کی مالک بنے گی جہاں اس کا اپنا گھر ہوگا۔ ساری زندگی کرائے کے گھروں میں رہنے اور دوسروں کے گھروں کی دیکھ بھال کرنے والی لینی اب اپنے فارم میں اطمینان اور آسودگی سے بقیہ زندگی گزارے گی۔ (ختم شد) ◆◆◆

میں ہر سال ایک نمائش ہوا کرتی تھی۔ اس میں میرٹھ کے کہاب پرائیوٹوں کا ایک اسٹال ہوا کرتا۔ اس سے کہاب پرائیوٹ کھانا بھی لڑکوں کی روایت تھا۔ اس نمائش سے متعلق بھی لوگوں نے افسانے گڑھ لیے لیکن وہ بھی سراسر من گھڑت تھے۔ اول تو اس میں لڑکے اور لڑکیوں کے جانے کے اوقات مختلف تھے۔ پرائیوٹیل مانیٹر خیال رکھتے کہ اوقات کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے تاکہ "تصادف" نہ ہو۔ اس میں تھوڑی سی چوری ہو جایا کرتی کہ جانے والیوں کے قدم سست ہوتے اور آنے والوں کے قدم کچھ تیز پڑنے لگتے۔ بس اسی عرصہ میں کچھ "کئی ونی" ہوتی، وہ بھی شرافت کے دائرے میں! مثال یہ ہے کہ چوڑیوں کی ایک دکان پر کچھ لڑکیاں کھڑی تھیں کہ چھپے کچھ "اسمارٹ" لڑکے آکر کھڑے ہو گئے۔ دکاندار سے کہنے لگے "بھئی فلاں چوڑیوں کا ایک جوڑا بنا دو۔" اس نے بنا دیا۔

اب بڑھ کر ایک لڑکی نے وہی جوڑا پسند کیا اور اسے دوسری کو پہنا دیا۔ تین چار بار ایسے ہی ہوتا۔ جب دکاندار نے لڑکیوں سے پیسے مانگے تو بولیں "جس نے آرڈر دیا پیسے اسی سے لو۔" یہ کہہ کر وہ تو کھسک گئیں اور لڑکوں کو پیسے بھرنے پڑے۔ یہ تھا مذاق اور صاف ستھرا اور شریفانہ ماحول..... جسے دوبارہ پیدا کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

اسی رومانیت کا شاعرانہ انداز آپ کو سناؤں۔ جب "فردوس زمیں" چھوڑنے کا وقت قریب آتا، تو مادر علمی چھوڑنے کے غم سے دل پر عالم حسرت ویاس چھا جاتا۔ شاعر المیہ اشعار کہہ کر اظہار جذبات کرتے۔ ایک بار اسٹوڈنٹس یونین ہال میں جلسہ تھا۔ جاں نثار اختر بھی مع بیاض کے پہنچے۔ ان کی باری آئی تو دل تھام کے کھڑے ہوئے۔ سامعین بھی ان کے انداز سے بھانپ گئے کہ بڑی جذباتی کیفیت میں ہیں۔ یکا یک ارشاد ارشاد کا شور

نہیں کرتی یعنی اس "گٹھری" کی قائل نہیں۔ کچھ عرصہ قبل ایک اسکول میں پوزیشن لینے والے میٹرک کے طلبہ میں کاسیکل اردو ناول تقسیم کیے گئے۔ ان ناولوں اور کہانیوں میں کچھ رومانوی عنصر بھی تھا۔ چند بچوں کے والدین نے اسکول والوں سے شکایت کر دی۔ ان کا خیال تھا کہ اس قسم کی فضول باتیں دل و دماغ میں رکھنے سے بچوں کا کیریئر تباہ ہو جائے گا۔ بس تفریح کی خاطر نیڈی پتلون پہن نیزھی کمر کر کے کسی گریڈ اسکول یا کالج کے سامنے کھڑے رہنا کافی ہے۔

جب کہ ملیگڑھ کے لڑکوں کی حد یہ تھی کہ میرٹھ روڈ چلے گئے۔ اگر وہاں بنات العیش نظر پڑی تو قدم خود بخود تیز ہو گئے۔ محسوس ہونے لگا کہ ہم بھی آسمان کے تارے بن چکے۔ اگر چلتے چلتے کسی کی نظر نلہ انداز ہم پر پڑی تو معراج پالی اور بس۔ اسی رومان کو بعض لوگوں نے بڑھا چڑھا کر ایسا رنگ دے دیا جو ملیگڑھ کی روح کے بالکل خلاف تھا۔ یہ ان لوگوں کا کارنامہ ہے جو اس عظیم درگاہ سے ہیر رکھتے یا ملیگڑھ کی روح (اسپرٹ) سے ناواقف تھے۔

ملیگڑھ کا ماحول صاف ستھرا رکھنے کے لیے وہاں "کوآپریشن" یعنی لڑکے لڑکیوں کا ساتھ پڑھنا ممنوع تھا۔ البتہ ایم اے کی کلاس لینے کے لیے لڑکیوں کو یونیورسٹی آنا پڑتا۔ اُسے بھی ہم "کو" نہیں کہہ سکتے کیونکہ جماعت کے پچھلے حصے میں ایک دروازہ خواتین کے لیے مخصوص تھا۔ اس رخ پر پردہ تان دیا جاتا۔ لڑکیاں پردہ پوش تانگے میں ادھر ہی سے آتی تھیں۔ پردے کے اندر بیٹھ کر ٹیچرس اور ادھر ہی سے واپس چلی جاتیں۔

یہ اور بات ہے کہ کوئی لڑکا جملہ یا فقرہ کس دے لیکن اس میں بھی شائستگی قائم رکھنا لازم تھا۔ ملیگڑھ یونیورسٹی میں غیر شائستگی اور فحش گوئی غیر علیحدہ سمجھی جاتی۔ یونیورسٹی

تعلیم و تربیت



تہذیب و تمدن کے اعلیٰ مرکز

علی گڑھ یونیورسٹی کی سنہری یادیں

اس درس گاہ میں بیٹے سہانے وقت کے اوراق زریں جس نے مسلمانان ہند کو تعلیمی، سیاسی و معاشی پستی سے نکالنے میں اہم کردار ادا کیا

احسن مرزا علیگ

بھی۔ لیکن جو لڑکیاں "ڈے اسکالرز" یعنی اپنے گھروں میں مقیم تھیں، انھیں کالج لے جانے کے لیے لاری (بس) استعمال ہوتی تھی۔ اس نظم میں اسی منظر کو رومانی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

یہ رومانوی انداز کس طرح کا تھا، آج کی نئی نسل کو سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اس لیے کہ اب دنیا "پریکٹیکل" ہو چکی۔ وہ رومان جیسی بے مقصد اور بے نتیجہ باتوں پر یقین

نصف صدی سے قبل کا قصہ ہے کہ مشہور شاعر جان نثار اختر ملیگڑھ یونیورسٹی کے طالب علم بنے۔ وہاں کی رومانوی فضا نے ایسا متاثر کیا کہ انھوں نے ایک نظم لکھ ڈالی جس کا عنوان تھا "گریڈ کالج کی لاری"۔ دراصل تب یونیورسٹی میں لڑکے لڑکیاں اکٹھے زیر تعلیم نہیں تھے یونیورسٹی سے دور میرٹھ۔ روڈ نامی سڑک پر لڑکیوں کا کالج تھا اور ہوسٹل

بلند ہوا۔ یہ نعرہ لگانے میں لڑکے لڑکیاں، دونوں شامل تھے۔ لڑکیاں دوسری منزل پہ چلن کے پیچھے بیٹھی تھیں۔ جاں نثار صاحب نے اپنی نظم کا آغاز کیا۔ افسوس مجھے عنوان یاد ہے نہ پوری نظم، صرف چند اشعار ذہن میں ہیں جو دلوں پر نوک نشتر کا کام دیتے۔ معذرت کے ساتھ اشعار عرض ہیں۔۔۔۔۔ اگر اجازت دیں تو عنوان اس طرح ہو سکتا ہے۔

”بے گائے ہوئے گیت“
نقد سرائی یوں شروع ہوئی:

کبھی ہنگام زینت کچھ کہے گا تم سے آئینہ نظر آنے لگے گا یک یک اک عکس دھندلا سا تمہیں اس وقت اک بھولا نسانہ یاد آئے گا کبھی تک کر کسی ناول کا کونا موڑتی ہو گی کبھی شغلا کسی کے خط کے پرزے جوڑتی ہو گی تمہیں اس وقت اک بھولا نسانہ یاد آئے گا کبھی جب ریل میں گزر دوں علیگزہ سے تمہیں مسوس ہو گا، رہ چکی ہو تم یہاں جیسے تمہیں اس وقت اک بھولا نسانہ یاد آئے گا

ہمارے اساتذہ

علیگزہ یونیورسٹی کو پام عروج تک پہنچانے میں پروفیسر صاحبان کا بڑا ہاتھ ہے۔ وہ پیسا کمانے سے دلچسپی نہیں رکھتے تھے بلکہ انہیں پڑھنے اور پڑھانے سے عشق تھا۔ پروفیسر حبیب شعبہ تاریخ کے سربراہ تھے۔ جب وہ لیکچر دینے آتے، جماعت میں سنانا چھا جاتا۔ لڑکے چاہتے تھے کہ وہ بولے جائیں اور ان کے لیکچر کا ایک ایک لفظ اپنے ذہن میں اتار لیں۔ لیکچر ختم کرتے ہی وہ بغلی کمرے میں چلے جاتے۔ خاکسار اتنے تھے کہ خود کوئی کتاب نہیں لکھی۔ لوگ وجہ پوچھتے تو

کہہ دیتے کہ میں اس قابل نہیں۔ ان کی شادی بھی علم دوستی کی بدولت ہوئی۔ بمبئی میں ایک خاتون رہتی تھیں۔ انہوں نے اخبار میں چھپوایا کہ جو فلاں موضوع پر سب سے اچھا مضمون لکھے گا، میں اسی سے شادی کروں گی۔ پروفیسر حبیب کو ان کی علم دوستی ایسی پسند آئی کہ اس موضوع پر مضمون لکھ ڈالا۔ فیصلے کے لیے جو بورڈ مقرر ہوا تھا، اسے پروفیسر صاحب کا مضمون ایسا بھایا کہ انہیں ”فاتح“ قرار دیا۔۔۔۔۔ یوں سہرے کے پھول کھل گئے۔

ایک اور پروفیسر صاحب تھے، ڈاکٹر ہادی حسن! یوں تو وہ شعبہ فارسی کے سربراہ تھے لیکن انہوں نے معلوم نہیں کتنے مضامین میں پی ایچ ڈی کر رکھی تھی۔ علیگزہ کا ایک ”نریڈیشن“ یہ تھا کہ سال میں کم از کم ایک دفعہ کسی عظیم شخصیت کو مدعو کیا جاتا۔ ہال میں ان کی تقریر ہوتی۔ ایک بار ماہر سنسکرت اور بنارس یونیورسٹی میں شعبہ سنسکرت کے سربراہ تشریف لائے۔ ان کے لیکچر کا موضوع کا مشہور ڈراما ”گھنٹنلا“ تھا۔

پنڈت جی اپنی تقریر جاری رکھے ہوئے تھے کہ ڈاکٹر ہادی حسن اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہیں کوئی نکتہ نہ بھایا اور اس پر کچھ ناگواری کا اظہار کیا۔ پنڈت جی کو برا محسوس ہوا تو ڈاکٹر صاحب نے وضاحت کی اجازت چاہی۔ پنڈت جی نے اجازت دے دی۔ ڈاکٹر صاحب کھڑے ہوئے اور دو گھنٹے ”گھنٹنلا“ پر بولتے چلے گئے۔ پنڈت جی ان کی اس قابلیت پر حیرت کا پتا بنے بیٹھے رہے اور اپنی کوتاہی کا اعتراف کر لیا۔

ڈاکٹر ہادی حسن کی شادی بھی عجیب انداز میں ہوئی۔ بیمار پڑے تو علاج کے لیے بمبئی گئے۔ ایک پرائیویٹ وارڈ میں مقیم تھے۔ جب صحت یاب ہوئے تو

نرس سے کہا ”تم نے بڑے خلوص اور محنت سے میری تیمارداری کی، اس لیے چاہتا ہوں کہ تمہیں تمہے دوں۔ مگر یہ تمہے تمہاری مرضی اور پسند کا ہو گا۔ تم مانگو تو میں دوں۔“ نرس نے کہا ”کیا جو مانگو سو پاؤں؟“ انہوں نے کہا ”ہاں، بھئی، جو مانگو گی وہی دوں گا۔“ ”تو پھر میں آپ سے آپ ہی کو مانگی ہوں۔“ ڈاکٹر صاحب اس غیر متوقع ”مانگ“ پر حیران رہ گئے۔ مگر وعدہ کر چکے تھے، بولے ”ٹھیک ہے۔“ یوں وہ نرس ان کی شریک حیات بن گئیں۔

ڈاکٹر صاحب کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ کوئی بھی مضمون ہو، وہ طلبہ کے سوالات کا جواب دینے کے لیے تیار رہتے۔ ایک دفعہ دیکھا کہ فرسٹ ایئر کے لڑکے کو نہایت ہمدردی کے ساتھ ٹیپتے ہوئے نصاب سمجھاتے جاتے ہیں۔ لڑکا آسام سے آیا تھا۔ علیگزہ کے عالمانہ ماحول سے کتابیں پڑھنے کا دلدادہ ہو گیا۔ ابھی ”کپے“ دماغ کا تھا لہذا ایک سوال نے

اس کا دماغ ماؤف کر دیا۔ وہ ہر ایک سے بحث کرنے لگا کہ وقت لافانی ہے اور اللہ بھی لافانی۔ لہذا وقت ہی خدا ہے اور خدا ہی وقت۔ لیکن جوں جوں اسے سمجھاتے، اس کے وہم میں اضافہ ہونے لگتا۔ یہاں تک کہ اس کی دماغی حالت خطرناک حد تک پہنچ گئی۔ اس نے کہنا شروع کر دیا ”اگر یہ معرہ حل نہ ہو تو میں خودکشی کر لوں گا۔“

اب لڑکے اس کی نگرانی کرنے لگے۔ وہ وی۔ ایم ہال ہوسٹل میں رہتا تھا۔ ایک رات نظر نہ آیا تو لڑکوں کو تشویش ہوئی۔ ہوسٹل کا ایک ایک کمرہ چھنڈ مارا۔ سوئی بھی ہوتی تو مل جاتی مگر اس کا کوئی نشان نہ پایا۔ ہوسٹل کے پیچھے سے

ریل کی ہنزی گزرتی تھی۔ وقت ریل کے گزرنے کا تھا۔ لڑکوں کے دل میں کھٹکا پیدا ہوا، ہونہ ہو وہ خودکشی کرنے گیا ہے۔ یہ خیال آتے ہی لڑکے ہنزی کی طرف بھاگے۔ ان کا خیال صحیح ثابت ہوا۔۔۔۔۔ وہ صاحبزادے آنکھیں بند کیے ہنزی کو تکیہ بنائے ریل کا انتظار کر رہے تھے کہ شاید جو جمعہ یونیورسٹی کے پروفیسر حل نہ کر سکے، وہ ریلوے انجن کا ڈرائیور حل کر دے۔ عین موقع پر لڑکوں کی نظر پڑ گئی اور اس تلاش حق کے متوالے کو ریل کی زد میں آنے سے بچا لیا۔ اس کے والد کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ اسے گھر لے گئے۔

ایک اور ڈاکٹر صاحب (نام یاد نہیں) شعبہ عربی کے سربراہ تھے۔ ان کا معمول تھا کہ نماز مغرب کے بعد گھر سے نکلتے اور ہوسٹل کے درمیان سے گزرتے۔ لڑکوں کو اگر کچھ دریافت کرنا ہوتا، تو کھڑے ہو جاتے۔ جب تک لڑکے مطمئن نہ ہوتے، وہ آگے نہ بڑھتے۔ یہ روزانہ کا معمول تھا۔ اس قدر اچھے انسان

علیگزہ کی ایک روایت یہ بھی تھی کہ لڑکوں کو کچھ دریافت کرنا ہوتا تو استاد کے گھر چلے جاتے اور بے تکلف سوال کرتے۔ اساتذہ بھی انکار نہ کرتے۔

تھے کہ اللہ نے انہیں وقت سے پہلے بلا لیا۔ ان کی نیگم کو جو یورپی خاتون تھیں، جدائی برداشت نہ ہو سکی۔ انہوں نے زہر کھا لیا۔ لیکن اللہ نے اس وقت انہیں بلانا مناسب نہ سمجھا اور دنیا میں رہنے کی تھوڑی اور مہلت دے دی۔ اساتذہ کے دلوں میں شاگردوں کے لیے اتنا خلوص تھا کہ وہ کبھی کبھی طنز و مزاح سے بھی کام لیتے۔ علیگزہ کی ایک روایت یہ بھی تھی کہ لڑکوں کو کچھ دریافت کرنا ہوتا تو استاد کے گھر چلے جاتے اور بے تکلف سوال کرتے۔ اساتذہ بھی انکار نہ کرتے۔ آدہ کیا دنیا تھی جو چھوٹ گئی۔۔۔۔۔ علیگزہ یونیورسٹی میں

سر سید ماننے والے کہاں تھے، دھرتا دے کر دروازے کے سامنے بیٹھ گئے کہ چندہ لے کر ہی جاؤں گا۔ ہر چند انھوں نے ڈرایا دھمکا یا کہ چلے جاؤ، مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ یہاں تک کہ ان صاحب کو غصہ آ گیا۔ کہنے لگے ”لاؤ ہاتھ، میں چندہ دیتا ہوں۔“ سر سید نے ہاتھ پھیلا یا۔ انھوں نے منہ بھر کے تھوک دیا۔

سر سید ہتھیلی پر وہ تھوک لیے شہر کے مرکزی چوک پر جا کھڑے ہوئے اور مسلمانوں سے پکار کر کہا ”گو میں من صاحب سے چندہ لے آیا ہوں۔ اب اپنی شرط پوری کرو۔“ لوگ اس قدر متاثر ہوئے کہ سر سید کی جمہولی نونوں سے بھردی۔ سر سید کا یہی خلوص اور استقلال رنگ لایا۔ علی گڑھ اسکول پہلے کانٹ بنا اور پھر یونیورسٹی کا روپ دھار کر ہندوستان کے مسلمانوں کی پہچان بن گیا۔

اس کے بعد دوسرا دیدہ دینا پیدا ہوا جس نے علی گڑھ یونیورسٹی کو اسلامی مملکت کے حصول کا براہ اول دستہ بنا لیا۔ مسلم لیگ شباب پر آگئی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے علیحدہ مملکت کا مطالبہ اپنے عروج پر پہنچا، تو قائد اعظم کی مصروفیت اس قدر بڑھ گئی کہ کسی کو ملاقات کا وقت دینا بڑا مسئلہ بن گیا۔ لیکن تب بھی ان کا حکم تھا، علی گڑھ یونیورسٹی کا کوئی لڑکا مجھ سے ملے آئے تو بغیر روک ٹوک ملاقات کرائی جائے۔

ایک دن قائد اعظم کی آمد کی خبر سن کر سیکڑوں لڑکے ریلوے اسٹیشن پر جمع ہو گئے۔ قائد کو یونیورسٹی لے جانے کے لیے دو گھوڑوں کی ہتھی سجائی گئی۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ راستہ بھر کہیں تل دھرنے کی جگہ نہیں، ہتھی چلے گی کیسے؟ لڑکوں نے نعرہ لگایا ”گھول دو گھوڑے، ہم کندھوں پر رکھ کر ہتھی لے جائیں گے۔“ محبت اور احترام کا یہی لافانی جذبہ تھا جس نے مسٹر محمد علی جناح کو قائد اعظم بنا دیا۔

ساتھ ساتھ دین و اخلاق بھی سیکھنے کا موقع ملا۔ ان تینوں خصوصیات کے بغیر انسان کی شخصیت مکمل نہیں ہوتی۔

۱۸۵۷ء میں جب اسلامی حکومت ختم ہوئی تو سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کا ہوا۔ دیگر اقوام نے بدلے حالات کے مطابق جدید تعلیم کو اختیار کر لیا اور انگریزوں کی نوازشوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ مسلمان سب سے پیچھے رہنے لگے۔ تب ایک دیدہ دینا حالات بھانپ گئے۔ انھوں نے مسلمانوں کو آگے لانے کا علاج یہ تجویز کیا کہ ان کو بھی جدید تعلیم سے بہرہ ور کیا جائے۔ لیکن بعض جذباتی مسلمان غم ٹھونک کر باہر نکل آئے اور عام مسلمانوں سے کہا کہ سر سید تمہارے بچوں کو ”عیسائی“ بنانا چاہتے ہیں۔ سر سید بھی دھن کے کپکے نکلے۔ بقول حانی کے۔

وہ بھلا کب کس کی مانیں ہیں
بھائی سید تو بس دوآنے ہیں
کم ہی لوگ جانتے ہیں کہ سر سید دلی میں مدرسہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ لیکن سخت مخالفت ہوئی تو کہیں اور جگہ تلاش کرنے لگے۔ علی گڑھ کے کچھ مخیر اور قوم کا درد رکھنے والوں نے ان کی مدد کی۔ چنانچہ وہ اسی شہر میں ایک مدرسہ بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

اب سوال اخراجات کا آیا تو سر سید نے قوم سے چندے کی اپیل کی۔ اس راستے میں بھی لوگوں نے روڑے اٹکائے۔ سر سید یونپنی کے ایک شیر چندہ مانگنے گئے۔ وہاں مسلمانوں نے کہا کہ آپ کو یہاں سے پھوٹی کوڑی نہیں ملے گی۔ ہاں اگر آپ فلاں صاحب سے چندہ لینے میں کامیاب ہو جائیں تو تمام مسلمان آپ کو چندہ دیں گے کیونکہ وہ انہی کے کہنے پر چلتے ہیں۔

سر سید فوراً ان صاحب کے پاس حاضر ہوئے اور چندے کا سوال کیا۔ انھوں نے ٹکا سا جواب دیا۔ مگر

ہوسٹل کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کے کمرے ”سنگل“ تھے۔ یعنی ایک کمرے میں ایک ہی لڑکا رہتا۔ مگر یہ صرف ”فرسٹ ڈویژن“ والوں کو ملتا تھا تاکہ وہ سکون سے اپنی پڑھائی میں منہمک رہ سکیں۔

ایک لیکچرار قاری محمود کہلاتے تھے۔ وہ شیکسپیر (شیخ پیر) کے ڈرامے پڑھاتے۔ جب میں یونیورسٹی پہنچا اور ان کی ہاٹ معلوم ہوا، تو اپنے ایک دوست سے کہا ”ارے یہ حافظ ہیں، مگر شیکسپیر کے ڈرامے پڑھاتے ہیں۔ تعجب ہے؟“ وہ ہنسا اور کہا ”وہ حافظ قرآن تھوڑی ہیں۔“

میں نے تعجب سے پوچھا ”پھر“
بولاً ”وہ شیکسپیر کے ڈراموں کے قاری ہیں۔“
میرے منہ سے بے ساختہ نکلا ”اوہ۔“

جب میں نے ان کی جماعت لی تو معلوم ہوا کہ انھیں یہ لقب کیوں ملا۔ جب وہ پڑھاتے تو ڈراما میں کھو جاتے۔ کبھی کرسی سے اٹھ کر میز پر بیٹھتے، پھر آدھے لیٹ جاتے۔ اتنے محو ہوتے کہ عموماً سگریٹ جوتے کے بجائے پتلون سے بجھاتے۔

علی گڑھ میں اخلاقی اور دینی اقدار کا خاص خیال رکھا جاتا۔ جو اہم شخصیات مدعو کی جاتی تھیں، ان میں علما بھی شامل ہوتے۔ ایک مرتبہ نواب بہادر یار جنگ تشریف لائے اور زبردست تقریر کی۔ لڑکے بہت متاثر ہوئے۔ خاص بات یہ تھی کہ انھوں نے طلبہ کو دیکھ کر کہا ”آپ لوگ سیرۃ النبی ضرور پڑھیں اور اپنی زندگی کو اس سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کریں۔“

یونیورسٹی کی طرف سے اس سلسلے میں ایک اور عمدہ انتظام اور تھا۔ وہ یہ کہ مرکزی جامع مسجد کے علاوہ ہر ہوسٹل میں ایک کمرانماز کے لیے مخصوص ہوتا۔ نیز ایک لڑکا نماز مانیٹر مقرر کیا جاتا۔ اس طرح لڑکوں کو علم کے

بیٹے وقت کی یادیں اکثر دل کو تڑپاتی ہیں۔ سب سے زیادہ افسوس یہ ہے کہ اس سر کو علم و فن کو میں نے اتنی جلد کیوں چھوڑ دیا؟ میں نے ”فن“ کا لفظ یوں استعمال کیا کہ اس ماور در ساہ میں علم کے ساتھ شعبہ زندگی کو پروان چڑھانے کی صلاحیتیں اور مواقع بدرجہ اتم موجود تھے۔ انسان وہاں رہ جاتا تو کندن بن کے نکلتا۔ مگر یہ منزل پانے کے لیے چار سال کا عرصہ ناکافی تھا۔

یونیورسٹی طالب علم کی شخصیت کو تیار درخت بنا دیتی لیکن اس میں پھول آتا اور پھل لگنا چار سال بعد شروع ہوتا۔ کئی لوگ تو اس سے بھی سیر نہیں ہوتے۔ پھل کھانے کے بعد ان کی بھوک بڑھ جاتی۔ وہ بہانے بنا بنا کر اس منہرے دور کو بڑھاتے رہتے۔ جن لوگوں کو اللہ نے معاش کے معاملے میں غنی رکھا تھا، امتحان سے دو مہینا پہلے ان پر پڑھائی کا بھوت سوار ہوتا۔ وہ گھروں کا رخ کرتے اور سال شروع ہونے پر پھر آجاتے..... یہ لوگ ”لارڈ“ کہلاتے تھے۔

میں نے پڑھائی کا بھوت سوار ہونا اس لیے لکھا کہ جب امتحان ہونے میں مہینا ڈیڑھ مہینا رہ جاتا تو اسے پاس کرنے کا فیصلہ کرنے والے لڑکے اپنے کمرے کا فریجچر ایک طرف رکھتے، بستر زمین پر بچھاتے اور ان پر کتابیں و نوٹس پھیلا دیتے۔ اب تین چار کا گروہ احتکاف میں بیٹھ جاتا۔ پڑھتے پڑھتے تھک جاتے تو ہاری ہاری ایک ایک لڑکا کمرے ہی میں چائے بنا تا اور سب کو پلاتا۔ یوں کہہ لیں کہ کتابوں کی شامت آجاتی۔ یہاں تک کہ شیو بھی اسی دن کرتے جب پرچہ دینے امتحان ہال جاتے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ پڑھائی میں بھی کسی سے پیچھے نہ رہتے۔

یہ حال تو ”ارڈیگولر“ رہنے والوں کا تھا۔ لیکن بڑی تعداد اور گولر پڑھنے والوں کی بھی تھی۔ ایسے ”پڑھا کو“ طلبہ کے لیے یونیورسٹی میں ایک اور انتظام تھا۔ آنتاب نامی

دوڑتے نظر آتے ہیں۔ تیز و تند گرم ہواؤں کے جھکڑ ہر دم چلتے رہتے ہیں۔ اکثر اوقات سڑکوں اور دور دور تک پھیلے میدانوں میں گیدڑوں کے غول و کار کی تلاش میں بھٹکتے دکھائی دیتے ہیں۔ گرد و پیش کی پہاڑیوں میں لگڑ بھگڑ بھی ہیں۔ وہاں سے رخصت ہونے والے جرمنوں کے گھر ریتلے طوفانوں کے باعث آہستہ آہستہ ریت میں دفن ہو رہے ہیں۔

ڈائمنڈ کوسٹ سے نکالے جانے والے ہیروں کی تراش خراش کا عمل اربوں سالوں پر محیط ہے۔ خیال ہے کہ اس علاقے میں سوئیل کی گہرائی میں ایک نرم چٹان تلے کاربن کا وسیع ذخیرہ انتہائی دہاؤ کے ساتھ گرم ہوا اور مسلسل دہاؤ اور حرارت کے زیر اثر ہیروں میں تبدیل ہو گیا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فی صدی کاربن ایک انچ کے حساب سے آگے سرکتا رہا یہاں تک کہ کروڑوں سال بعد ایک زبردست آتش فشانی انفجار نے اسے دریائے اورنج میں دھکیل دیا۔ اگلے ستر کروڑ سال تک یہ سمندر میں لڑھکتا رہا۔ پھر پے در پے برپا ہونے والے زبردست سمندری طوفانوں نے اسے ساحل پر لا پٹھا جہاں وہ نکلے نکلے ہو گیا اور یہ نکلے نکلے ریت کی تہوں میں دبے چلے گئے۔ انہی نکلوں نے ہیروں کی شکل اختیار کر لی۔

علاقہ غیر میں

رہائشی علاقے سے خاصی دوری پر ایک عظیم ریتلے ٹیلے کے گرد چکر لگائیں، تو ایک اور باز آتی ہے۔ یہ پہلی روک پر بنی قدرے نیچی باز سے خاصی مختلف ہے۔ اور اس کا مطلب ہے کہ یہاں کام ہو رہا ہے۔ وہاں بلند تیز دھار دو متوازی تھریں صحرا کی پھیلی مختلف سمتوں میں جا کر نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ ان کے درمیان "علاقہ

ہیں۔ پھر دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی ہیروں کی کانیں دریافت ہوئیں۔ بھارت میں بھی گوکنڈہ کی کانوں سے عرصہ دراز تک ہیروے نکلتے رہے۔ اب سب سے زیادہ ہیروے جنوبی افریقا اور نمیبیا میں نکل رہے ہیں یعنی اس علاقے میں جو جنوب مغربی افریقا کہلاتا ہے۔

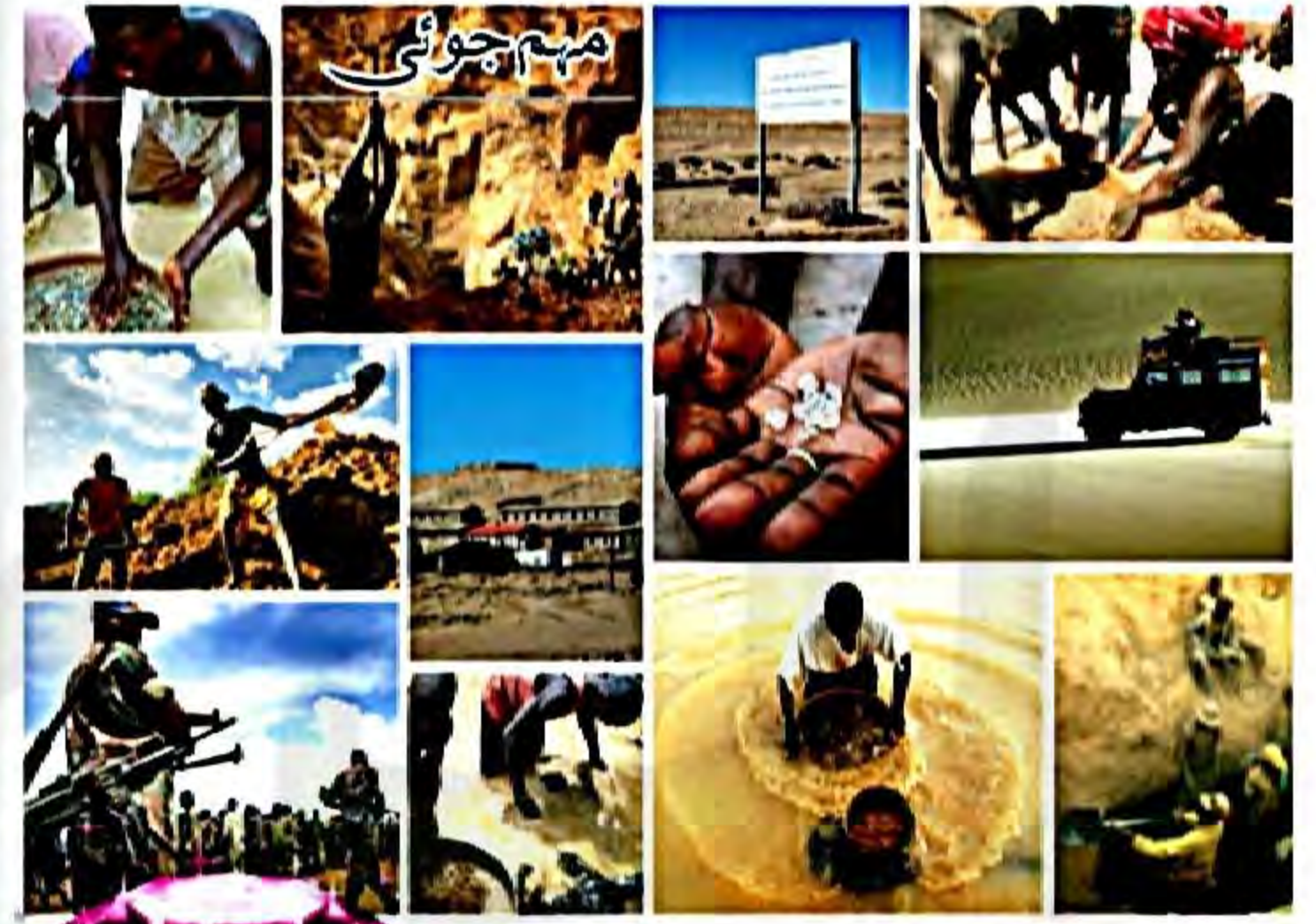
علاقے میں ہیروں کا دریافت ہونا بھی یادگار لمحہ تھا۔ یہ ۱۹۰۸ء کا سال تھا اور اس زمانے میں سارا جنوب مغربی افریقا جرمن نو آبادی تھا۔ ایک ٹرک ڈرائیور کو سڑک کنارے کچھ چمکتے ہوئے پتھر دکھائی دیے۔ اس نے جب انھیں ہاتھ میں لیتے ہوئے بغور دیکھا تو سمجھ گیا کہ وہ ہیروے ہیں! اصلی ہیروے! اس انتہائی قیمتی اور حیرت ناک دریافت کی اطلاع برلن بھجوا دی گئی جہاں سے فوراً اس علاقے کو "علاقہ ممنوعہ" قرار دے جانے کا حکم آ گیا۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد اس علاقے میں کان کنی کے حقوق ڈی بیئرز گروپ نے خرید لیے۔ اب سیکورٹی والے اس تمام علاقے میں دور دور تک اونٹوں پر گشت کرتے پھرتے اور علاقے سے باہر نکلنے والے ہر شخص کی خوب اچھی طرح تلاشی لیتے ہیں۔ آج ڈی بیئرز اور حکومت نمیبیا کی پارٹنرشپ "میمڈب" کے زیر اہتمام "ڈائمنڈ کوسٹ" نامی علاقے سے ہیروے نکالے جا رہے ہیں اور حفاظتی انتظامات پہلے سے بھی زیادہ سخت ہو چکے۔

ہیروے کی تاریخ

اس علاقے میں واقع قبیلے اور نموند میں چار ہزار کارکن اور ان کے خاندان سفید بنگلوں میں رہائش پذیر ہیں۔ اس کے چاروں طرف خاردار تاروں کی باز لگی ہے اور جا بجا چار زبانوں میں بورڈ لگے ہیں: "بغیر اجازت داخلہ منع ہے....."

قبیلے کی سڑکوں پر پک اپ ٹرک اور شتر مرغ باہموم



جنوب مغربی افریقا کے ساحل پر پھیلا

ہیروں کا نرالا دیس

بیش قیمت پتھروں والے انتہائی قیمتی علاقے کی داستان عجب

جہاں اتنی سخت سیکورٹی ہے کہ پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا

ہونے کا رعب اور تاثر دل میں جاگزیں ہو جاتا ہے۔

فرزانہ نگہت

ہیرا واقعی اس ذات یکتا کی کارگیری صناعی اور اس کی قدرت کا ایک شاندار حسین ترین نمونہ اور شاہکار ہے۔ آج تک جتنے بھی نقلی ہیروے بنائے گئے ہیں وہ کسی بھی لحاظ سے اصلی ہیروں کے پاسنگ نہیں نہ ہی وہ ایسی قدر و قیمت پاتے ہیں۔

گزشتہ صدیوں میں بے شمار ملکوں سے ہیروے نکالے گئے۔ ان میں چین اور لاطینی امریکا کے ممالک قابل ذکر

نے جو ہیروں کی دکانوں پر ہیروے دیکھے ہوں گے: حسین تراشیدہ رنگا رنگ اور حیرت انگیز آب و تاب والے ہیروے ہر سائز و صورت کے۔ گول، ٹکونے، چکوز، مستطیل، ہشت پہلو تراشیدہ ہیروے۔ جنہیں دیکھ کر بے ساختہ منہ سے سبحان اللہ نکلتا اور اللہ تعالیٰ کے عظیم صنایع

غیر جو سوگز چوزا ہے اسے مسلسل ہموار کیا جاتا رہا ہے تاکہ اس پر قدموں کے نشانات مثبت ہو سکیں۔ اس علاقے میں دن رات انفرارڈ کیمرے نقل و حرکت نوٹ کرنے کے آلات ریزار اور مسلح حشمتی دستے مصروف کار رہتے ہیں۔

اسی باز کے اندر ہاسٹل میل لمبی اور تین میل چوڑی ساحلی پٹی واقع ہے۔ یہ مانیٹنگ ایریا (کان کنی) نمبر ایک ہے۔ یہاں بیروں کی تلاش کا کام ہوتا ہے۔ یہیں کنٹرول کی بنی ہوئی عمارت میں پڑتالی چوکی واقع ہے۔ اندر داخل ہونے والوں کی سختی سے تلاشی لی جاتی ہے اور کسی کو کیمرا ساتھ لے جانے کی بھی اجازت نہیں کہ وہ ان میں کہیں ہیرے ڈال لیں۔ اس ممنوعہ علاقے میں اگر کوئی گاڑی داخل ہو جائے تو وہ وہیں ریت میں دھنستی رہے گی کیونکہ اس میں چوری شدہ ہیرے تلاش کرنے کا کام انتہائی مہنگا پڑتا ہے۔

جب کوئی ایجنسی ڈائمنڈ ایریا نمبر ون میں داخل ہو تو وہ وہاں کھدائی کرنے والی دیوہیکر مشینوں چینیٹے چنگھارتے انجنوں آکھوں کو چندھیا دینے والی روشنیوں مصری ابراہموں جیسے ریت کے دیوہیکل ٹیلوں اور ان کے نیچے پتھروں کی توڑ پھوڑ اور گرد و غبار کے مہیب بادلوں کا نظارہ کرتا ہے۔

اس ویرانے میں بیروں کی تلاش معجزہ ہی ہے۔ ایک ایک ہیرا انتہائی محنت جانکاری اور مدتوں کی تلاش کے بعد ہی دستیاب ہوتا ہے۔ ایک کارکن کے بقول "ان بارہ سالوں میں میں نے کبھی ایسا ہیرا نہیں دیکھا جو پہلے ہی کسی کے ہاتھ لگ چکا ہو۔"

اعلیٰ معیار کے ہیرے جب ڈائمنڈ کوسٹ پہلی مرتبہ دریافت ہوا تو مزدوروں کی قطاریں ہاتھوں میں فولادی چمٹیاں لیے

پہیٹ کے بل ریختی ہیرے اکٹھے کرتی نظر آنے لگیں۔ سب مزدوروں کے منہ میں کپڑے ٹھنسنے ہوتے تاکہ وہ ہیرے اپنی پشت پر بندھے تھیلے میں ڈالنے کے بجائے اپنے منہ میں نہ ڈال لیں۔

وہ دن اب عرصہ ہوا گزر چکا۔ اب ہیرے کھردری چٹائی سطح کو ڈھانپنے والی بجری سے چھ سات فٹ نیچے تلاش کیے جاتے ہیں۔ لیکن یہ بجری بھی ساتھ فٹ گہری نرم ریتلی قید سے ڈھکی ہوئی ہے۔ اس ریت کو ہٹا کر بجری تک پہنچنا مشکل ترین اور جان جوکھوں کا کام ہے۔ یہی ریت سمندر کو اس سختی چٹان (Bed rock) کی طرف چڑھ آنے سے بچانے کے لیے بطور پشت استعمال ہوتی ہے۔

روزانہ قریباً ساڑھے تین صد بوجھ بردار ٹرک کھدائی کرنے والی مشین بلڈوزر گریڈرز اور چٹانیں توڑنے والی مشینیں ڈیڑھ لاکھ ٹن ریت اس سختی چٹان پر سے ہناتی ہیں۔ یہ ریت ایک میدان میں ڈھیر کی جاتی ہے۔ ایک ہی سال میں یہ ڈھیر ڈھائی میل کی بلندی تک جا پہنچتا ہے۔ اس عرصہ میں تیس ملین ٹن بجری کھودی اور ٹرکوں پر لا کر کرشنگ کے لیے بھجوا دی جاتی ہے۔

ڈائمنڈ کوسٹ دنیا کی کسی بھی کان کے مقابلے میں پست درجہ رکھتی ہے۔ وہاں ہر ایک سو ٹن بجری ہٹانے پر محض ۳۰ قیراط ہیرے نکلتے ہیں۔ لیکن یہ اعلیٰ معیار کے ہیرے ہوتے ہیں جن کی قیمت فی قیراط ساڑھے تین سو ڈالر ہے۔ یعنی ان کا تقابل آسٹریلیا میں ارگائل کے مقام سے نکلنے والے ہیروں سے کیا جاسکتا ہے۔ ارگائل دنیا میں سب سے بڑی ہیرے کی کان ہے۔

ہیرے شروع ہی سے لوگوں کو چوری کرنے پر اکساتے چلے آ رہے ہیں۔ ایک ماہس کی ڈبیا بھر

ہیرے کسی کو کروڑ پتی بنانے کے لیے کافی ہیں۔ ڈائمنڈ کوسٹ میں لوگوں نے انھیں حاصل کرنے کے لیے جھوٹ بولے دھوکا بازی کی۔ حتیٰ کہ قتل بھی کیے۔ آج قریباً ڈھائی سو ملین مرد اور عورتیں بیروں کی ممکنہ چوری کو روکنے کے لیے وہاں تعینات ہیں۔

ہیروں کی چوری سالہا سال سے جاری ہے۔ اس پر قابو پانے کے لیے حکومت نیپیا جدید ترین طریقوں پر سالانہ تین کروڑ ڈالر خرچ کر رہی ہے جس کا مثبت نتیجہ سامنے آیا ہے۔

اس علاقہ ممنوعہ میں چار صد کے لگ بھگ جاسوس کیمبرے نصب ہیں۔ ان کیمبروں سے ہر مزدور کی نقل و حرکت اسکرین پر دکھی جاسکتی ہے۔ آپریٹروں کو مشکوک حرکات و سکنات پر کھنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص نے کیمبرے کی طرف پشت کر رکھی ہو یا وہ کن اگھبوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا ہو تو وہ مشکوک قرار پاتا ہے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ایک ٹرک یونٹی کیمبروں کے سامنے آکھڑا ہوا جس سے وہ منظر چھپ جہاں چند مزدور ہاتھوں میں ہیرے لیے ہوئے تھے۔ انھیں معلوم نہیں تھا کہ دوسرے زاویے پر نصب کیمرا ان کی تمام نقل و حرکت دیکھ رہا تھا۔

حد تو یہ ہے کہ گمرانوں کی بھی "جاسوس کیمبروں" کے ذریعے گمرانی کی جاتی ہے یہ دیکھنے کے لیے کہ مہادا انھیں چشم پوشی کے لیے رشوت تو نہیں دی گئی۔ خفیہ مقامات پر متعین گمران گمرانوں پر نظر رکھتے ہیں اور خود ان پر بھی نظر رکھی جاتی ہے۔

دودلچسپ واقعات

ہیرے چوری کرنے کے لیے ہر قسم کے ممکنہ قابل تصور طریقے آزمائے جاتے۔ ایک ہارٹائن نیل نامی

چالیس سالہ سکھ روٹی انسر اپنے دفتر کے باہر کھڑا تھا جب اس نے ایک کبوتر کو تھکی ہاری حالت میں چھت پر پھڑ پھڑاتے دیکھا۔ اس نے جب اسے پکڑنے کی کوشش کی تو وہ انتہائی ست انداز میں اڑ کر دوسری چھت پر جا بیٹھا۔ گمرانوں نے اس کا تعاقب کیا اور اسے اور گھنڈ کے ایک گھر کی چھت پر بنے کمرے کے کھلے دروازے میں داخل ہوتے دیکھ لیا۔ جب وہ اس کمرے میں داخل ہوئے تو کبوتر ایک الماری پر بیٹھا تھا۔ اس کی پشت پر چھوٹی سی تھیلی بندھی تھی جس میں سے ہیرے نکل آئے!

سب سے زیادہ اعصاب شکن کہانی ان دو چوروں کی تھی جنھوں نے باز میں سے اپنا راستہ بنایا اور ریت کے طوفان میں غائب ہو گئے۔ گمرانوں کو کوشش کے باوجود ان کا سراغ نہ مل سکا۔ اگلے دن دوسرے جاسوسوں نے اپنی گاڑیوں میں ان کی تلاش میں تیس میل تک کا علاقہ کھوج ڈالا لیکن انھیں بھی کوئی سراغ نہ ملا۔ وہ ابھی ماہی کے عالم میں تھے کہ قریب ہی ایک جگہ سے یکدم دونوں چور ریت سے برآمد ہوئے۔ انھوں نے چوروں پر کپڑا لپیٹ کر خود کو ریت میں دفن کر رکھا تھا۔ جب لینڈ روور کی آواز ان کے کانوں میں گونجی تو اس خوف سے "مردے" باہر نکل آئے کہ کہیں وہ پہیوں تلے کچلے نہ جائیں۔

کان سے باہر نکلنے والے ہر شخص کا سر تا پا ایکس رے لیا جاتا ہے۔ ایکس رے میں ہیرے سیاہ دھبوں کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ یہ شیونگ برش، مینڈ میجر چابیوں کے گچھوں وغیرہ میں چھپائے جاسکتے ہیں۔ انھیں رنگ کر رنگین موتیوں کی شکل دے تسبیح یا اسی قسم کی کوئی چیز بھی بنائی جاتی ہے۔ انھیں نگلا اور جسم کے مختلف حصوں میں

حیا ایمان کا حصہ ہے۔ (الحديث)



حجاب اپنائے

وقار

کفایت

اور

خوبصورتی

کے ساتھ

بس عبا ئی کسی بلفار کے خلاف فروغ عجاب کی
ہمدرد میں شرکت کیجئے.....

دلکش، دیدہ زیب اور معیاری قباب مصنوعات گھر گھر پہنچانے
کی ہم میں ہمارے دست و پا زوبن!

خواتین کی مصنوعات سے متعلقہ کانگریزات، اسلامی سب کے تاجران
سکول، کالج، یونیورسٹی، مدارس، قرآن کلام، درس قرآن کے منتظمین
اور فروغ قباب میں دلچسپی رکھنے والے خواتین و حضرات
ایجنسی / ڈیلر شپ حاصل کرنے کیلئے رابطہ فرمائیں۔

Hijabunisa
GARMENTS

Lahore - Pakistan

0333-4279638

www.hijabunisa.com /hijabunisa

• اسکارف • چادر • معری اسکارف • گاڈن / برقعہ • جگ گارمنٹس • بچکان اسکارف



ان ہیروں کو پھر بھاری بھر کم فیکٹروں میں مہربند حالت
میں سنٹرل ریکوری پلانٹ بھیج دیا جاتا ہے۔

تیز چمکتی ستاروں کی قطاروں سے پرے کیروں کی
آنکھوں کے سامنے لگے طاقتور ترین مقناطیسی بلاک ہر
کھینچی جانے والی چیز کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ جو کچھ
بچ رہے اس پر ایکس رے شعاعیں ڈالی جاتی ہیں جن
سے ہیرے اور کچھ دوسرے اجزا ڈسکوروشنیوں کی طرح
چمکنے لگتے ہیں۔ تب ایک آلہ ہوا مار کر ان ہیروں کو
دوسرے خانے میں منتقل کر دیتا ہے۔

انٹارہ انجی موٹی دیواروں سے بنے ہوئے تہرے
متنقل دروازوں سے گزرنے کے بعد ایک کمر آتا ہے
جس میں تین سیکیورٹی گارڈ چوکنا استادہ ہوتے ہیں۔ ان
میں سیاہ اور سرخ وردیوں میں ملبوس نو عورتیں بھی ہوتی
ہیں۔ اس کمرے میں آنکھوں کو چند حیا دینے والی تیز
طرار روشنیاں اور لمبی لمبی مرمریں میزیں بھی نظر آتی ہیں
جن پر شیشے کے بنے سیکڑوں ڈبے رکھے ہوتے ہیں۔

انہی ڈبوں کی تہ میں چمکدار روپہلی نفیس تراشیدہ
ہیرے رکھے ہوتے ہیں۔ ان ہیروں کو کتنی انگلیوں سے نہیں
چھوا جاتا بلکہ ہستانے پہن کر چمٹی کی مدد سے اٹھایا جاتا
ہے۔ دو ہزار چار سو قیراط ہیروں کی قیمت ساڑھے سات
لاکھ ڈالر بنتی ہے۔ یہ ہیرے ایسٹریڈیم اینیورپ تیویارک اور
ہیرو کے دارالحکومت لیما میں فروخت ہوتے ہیں۔

اس علاقے کی سیاحت کرنے والوں کی نہ صرف
جامہ تلاشی لی جاتی ہے بلکہ منہ کھول کر بھی دیکھے جاتے
ہیں کہ کہیں وہ زبان کے نیچے یا دانتوں کے خلا میں
ہیرے تو نہیں چھپا کر لے جا رہے۔ ایسے کڑے حفاظتی
انتظامات نے وہاں ہیروں کی چوری کو قریب قریب
ناممکن بنا دیا ہے۔



چھپا بھی لیا جاتا ہے۔ ایسے ہی ایک اسمگلر کی نشاندہی ہوں
ہوئی کہ اس کے لڑکے کے استاد نے اسے یہ دکھانے کی
خاطر کہ ریت سے ہیرے کیسے نکالے جاتے ہیں
رنگارنگ پتھروں کو ریت میں دبا دیا۔ اس پر وہ لڑکا کہنے لگا
”یہ ہیرے نہیں..... میں انہیں پہچانتا ہوں۔ میرے پاپا
اصلی ہیرے لاتے ہیں۔“

تختی چٹان پر سے بگری بنانا شعبہ کان کنی کا حساس
ترین مرحلہ ہے۔ ریتلے بند کے عقب میں تختی چٹان کا
پھیلاؤ ہتھوڑوں کی طرح ضروری مارتی موجوں کی سطح
سے ساٹھ فٹ نیچے ہوتا ہے۔ اس جگہ سیر کرنے والوں کو
وہاں ایک نرک بھتنے ویکیم کلیئر پانچ ٹن وزنی ڈسٹ
بیگ جن میں بڑے بڑے تالے لگے ہوتے ہیں اور
درکشی کے بڑے بڑے پائپ بکھرے دکھائی دیتے ہیں۔
ہر پائپ کے سرے پر دو آدمی ہوتے ہیں جنہیں
بیڈراک کلیئر کہتے ہیں یعنی تختی چٹان کا عملہ صفائی۔ وہ
ادنی کنٹنپوں اور نیلے کونوں میں ملبوس ہوتے اور بیلچوں
آنکڑوں اور عام گھریلو جھاڑوؤں کی مدد سے بگری صاف
کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں اگر کسی کا کنٹیکٹ لینز
بھی گم ہو جائے تو وہ ضرور مل جائے گا۔

اس جگہ سے دو سو گز کی دوری پر ایک بڑا ٹرائی پوڈ
کیمر انصب ہے جس کی مدد سے جاسوس ہر آدمی کی نقل و
حرکت کا جائزہ لیتے رہتے ہیں۔ مشکوک فوراً ہی دھر لیا
جاتا ہے۔

تختی چٹان سے نکلنے والی بگری کو دیوہیکل ہسٹو
مشینوں میں ڈالا جاتا ہے۔ ان میں چھلنیاں اور تیزی
سے گھومنے والے پلڑے نصب ہوتے ہیں۔ بگری کا
ننانوے فی صد حصہ جو قدرے موٹا ہوتا ہے فوراً الگ ہو
جاتا ہے۔ بقیہ میں سے ہیرے تلاش کیے جاتے ہیں۔

قصہ کوئز ۱

دنیا کے اسلام کا نامور طبیب، شہرہ آفاق سائنسدان، جامع العلوم فلسفی، ریاضی دان اور ماہر فلکیات، ملقب بہ الفیخ الرئیس، بخارا کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ ۶ سال کی عمر میں اس نے تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ اس کا باپ اسماعیلی فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کو بھی اسی مسلک کی تعلیم کی طرف راغب کرنا چاہا، لیکن ہونہار پروانے ۱۰ برس میں قرآن، فقہ اور ادب کا مطالعہ کر لیا اور پھر دیگر علوم کی طرف مائل ہوا۔ ابو عبد اللہ ان سنی سے اس نے منطق، فلسفہ اور ریاضی کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد خود ہی طب اور طبیعیات کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اس نے فلسفہ، منطق، ریاضی اور سائنس کے موضوعات پر بہت سی کتابیں لکھیں۔ علم طب میں اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب یہ علم نہیں تھا تو بقراط نے اسے جنم دیا، جب یہ مر گیا تو جانینوں نے حیات بخشی، جب یہ بکھر گیا تو ارازی نے سینا لیکن یہ ناقص تھا تو اس عظیم شخص نے اس کی تکمیل کی۔

(الف) اس عظیم شخصیت کا نام بتائیں؟

(ب) علم طب کے حوالے سے کبھی گئی اس کی کسی کتاب کا نام بتائیں؟

قصہ کوئز ۲

دو ایک امریکن خلاہاز پاکٹ اور امریکن یونیورسٹی میں پروفیسر تھا۔ ۵ سال کی عمر میں اس نے اپنا پہلا ہوائی سفر ۲۰ جولائی ۱۹۳۶ء کو کیا۔ خلاہاز بننے سے پہلے وہ امریکن نیوی میں آفیسر تھا اور اس نے کوریا کی جنگ میں ۱۵ جنوری ۱۹۵۱ء میں حصہ لیا۔ جنگ کے بعد اس نے پرووے یونیورسٹی (Purdue University) سے ۱۹۵۵ء میں ایئر وناٹیکل انجینئرنگ میں گریجویشن کی۔ وہ

اپنے خاندان کا دوسرا آدمی تھا جو تعلیم حاصل کرنے کے لیے کالج تک پہنچا۔ اس نے اپنا پہلا خلائی سفر بطور کمانڈر پائلٹ کیا۔ وہ ناسا کا پہلا سول خلاہاز تھا۔ ۱۹۷۸ء میں اسے امریکی صدر رچرڈ نکسن نے صدارتی تمغہ برائے آزادی سے نوازا۔ اس نے ۸۲ سال کی عمر پائی اور ۲۵ اگست ۲۰۱۲ء میں وفات پائی۔

(الف) اس خلاہاز کا نام بتائیں؟

(ب) اس نے اپنا پہلا خلائی سفر جس جہاز کے ذریعے کیا اس کا نام بتائیں؟

قصہ کوئز ۳

۱۸ جولائی ۱۹۱۸ء کو پیدا ہونے والا یہ شخص جنوبی افریقہ کا پہلا جمہوری صدر بنا۔ ۱۹۶۲ء میں اسے سفید فام اقلیت کے خلاف کام کرنے پر مختلف الزامات کی وجہ سے گرفتار کیا گیا اور عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ ان کو نسلی امتیاز کے خلاف جدوجہد کی وجہ سے پوری دنیا میں شہرت حاصل ہوئی۔ ۱۵ اگست ۱۹۶۲ء میں اسے ۷۱ ماہ تک مفرور رہنے کے بعد گرفتار کر لیا گیا اور جوہانس برگ قلعہ میں قید کر دیا گیا۔ ۱۱ فروری ۱۹۹۰ء میں ۲۷ سال بعد اسے رہا کر دیا گیا۔ ۲۵۰ سے زائد انعامات وصول کیے اور ۱۹۹۳ء میں نوبل انعام بھی حاصل کیا۔ اپنے خاندان کا پہلا شخص تھا جس نے ہاتھ و تعلیم حاصل کرنے کے لیے سکول کا رخ کیا۔ اس نے ۳ شادیاں کیں۔ اس کی اولاد میں ۳ لڑکیاں اور ۲ لڑکے شامل ہیں۔ اسے اپنی اہلیہ کی بے وفائی کا دم سہنا پڑا۔ اس نے اپنی مقبولیت کے دنوں میں ملک کی صدارت سے دست بردار ہو کر ایک انوکھی مثال قائم کر کے دنیا بھر میں عزت پائی۔

(الف) ہم کس شخصیت کا ذکر کر رہے ہیں؟

(ب) اس شخصیت کی سیاسی پارٹی کا نام بتائیں؟

قصہ کوئز رسائل اور جرائد، مضمون سے اپنے دلچسپ قصوں کا انتخاب ہے، ان کا مطالعہ پڑھنے والوں کو ۱۰ سے ۱۰۰ سالوں کے مابین ہر آگے اور آگے کی کہانیاں ملنے کا شہرہ حاصل کرتا ہے۔ دلچسپ، معلوماتی اور تفریحی مضمون لکھنے والے ہر ماہ میں اور ہر گزرتے گزرتے آپ کے ۲۰ سال سے اپنی ذہانت کو بڑھانے کے لیے درست جواب لکھیں۔ درست جواب دینے والے زیادہ سے زیادہ نوائے نیشنوں کو "اردو انسٹ" کے ۵ ٹیوشن کی دعوتی، اعزازی ترسیل کے علاوہ نشریات کی 2 نمونہ کاپیاں دی جائیں گی۔

جوابات بھیجئے کا پتہ: **مدیر ماہنامہ اردو ڈائجسٹ G-III-325، جوہر ٹاؤن لاہور**

ماہ اکتوبر میں دیے گئے قصہ کوئز کے صحیح جوابات

قصہ کوئز 1- (الف) اگست ۱۹۳۱ء، عظیم گڑھ یوپی (ب) نشان امتیاز (ملٹری)، ستارہ بسالت (ملٹری)

قصہ کوئز 2- (الف) ۱۹۳۹ء، سیالکوٹ (ب) خطاکال

قصہ کوئز 3- (الف) اگست ۱۹۲۳ء

درست جوابات دینے والوں کے نام

عبد السلام انصاری (حیدرآباد)، عبدالرشید انصاری (حیدرآباد)، ولی حسین (حیدرآباد)، آصف کریم (حیدرآباد)، منیر احمد (حیدرآباد)، محمد احمد (کراچی)، مرزا ہادی بیگ (حیدرآباد)، ظہیر حسین (حیدرآباد)، نائل کوب (لاہور)، مہمان محمد اویس مظہر (لاہور)، محمود منظور خان (سرگودھا)، حمزہ شمشاد خان (سرگودھا)، محمد تنزیل عباس جنجوعہ (سرگودھا)، محمد فکیل عباس جنجوعہ (سرگودھا)، علی زریب (قصور)، ندیم امتیاز (جہلم)، منظور احمد بھنگو (نواب شاہ)، حمزہ غلام حسین (حیدرآباد)، اویس حبیب (فیصل آباد)، محمد یوسف قریشی (حیدرآباد)، حمیم اختر (فیصل آباد)، کماظہر (ر) محمد سلیمان (انک)، ڈاکٹر خالد سیف اللہ خان (لاہور)، محمد یاسین راندوری (حیدرآباد)، مرزا مسرت بیگ (حیدرآباد)، مرزا اسرار بیگ (حیدرآباد)، آق ب محمود بٹ (راولپنڈی)



انجمن کوئز
عسلام سجاد

دلچسپی، معلومات اور کچھ کھڑکھڑانے کا جذبہ
یہی ہے اس کوئز کا اصل مقصد

یہی ہے

قصہ کوئز

درست جوابات پر انعامات آپ کے منتظر ہیں

- قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام
- ندیم امتیاز (جہلم)
- محمد یاسین راندوری (حیدرآباد)

آپ کو 6 ماہ تک اردو ڈائجسٹ کے بارے بطور تمغہ ملے

نوٹ: تمام کارکن اپنا مکمل نام و پتہ اور موبائل پتہ اپنی ٹی سی ایل نمبر لکھنا ہرگز نہ بھولیں۔ اس کے بغیر کوریئر سروس کا نمائندہ آپ تک نہیں پہنچتا۔ (ایڈیٹر)

خواہصورت اور معیاری کتب، کم قیمت اعلیٰ معیار
042-35434909
042-35425356
منصورہ، ملتان روڈ لاہور

انعامات کے لیے تعاون
منشورات

پکن خیال



قارئین کے تبصروں، مشوروں اور باتوں سے سب کا کام

جاوید ہاشمی کا انٹرویو

شمارہ اکتوبر میں جاوید ہاشمی صاحب کا انٹرویو پڑھا۔ اس میں انھیں ڈرامائی طور پر جمہوریت کا نجات دہندہ بنا کر پیش کیا گیا۔ مگر انھوں نے جنرل ضیا کے دور میں جمہوریت کا جھنڈا کیوں بلند نہ کیا؟ شاید اس لیے کہ تب وہ وزیر تھے۔ گزارش ہے کہ شاہ محمود قریشی یا اسد عمر سے انٹرویو لیا جائے تاکہ پی ٹی آئی کا نقطہ نظر بھی سامنے آسکے۔ (فیصل سعید، لاہور)

☆☆

جناب جاوید ہاشمی کا انٹرویو بہت معلومات افروز تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انھوں نے وطن عزیز میں جمہوریت کو مستحکم کرنے کی خاطر بہت قربانیاں دی ہیں۔ (انعام الحسن، کراچی)

☆☆

میں جاوید ہاشمی کو اصول پسند شخصیت سمجھتی ہوں۔ میرا خیال ہے، انہوں اور جھوٹے الزامات کی بنیاد پر

پی ٹی آئی چھوڑنا ایک غلطی ہے۔ بیشتر سیاست دانوں کے برعکس ان کے دامن پر کوئی دھبہ نہیں۔ اس لیے انھیں سیاست میں ضرور رہنا چاہیے۔

(عالیہ شیخ، ملتان)

☆☆

انٹرویو میں دوسرے رہنماؤں پر الزامات کی بھرمار ہے۔ جب کہ خود کو پاک صاف رکھنے کی سعی ہوئی۔ ہاشمی صاحب نے جن لوگوں پر الزام دھرے ہیں، انھیں بھی صفائی دینے کا موقع ملنا چاہیے۔ (عمار نذیر، لاہور)

☆☆

شمارہ اکتوبر نظر نواز ہوا۔ چند غلطیوں کی نشان دہی کرنا چاہتا ہوں۔ ”اصل خطرہ“ (کچھ اپنی زبان میں) صفحہ ۱۵ سطر ۱۱ میں درج ہے کہ مفتی نعیم کے فرزند، مسعود بیگ نامعلوم افراد کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ مگر مرحوم مفتی نعیم کے فرزند نہیں داماد تھے۔

جاوید ہاشمی کے انٹرویو میں صفحہ ۳۸ کی آخری سطر میں

کاروان علم فاؤنڈیشن پاکستان
19th Annual Conference
2014

بے وسیلہ جو ہر قابل کو اپنائے
قوم کا مستقبل تابناک بنائے

الحمد للہ

ہر سال سینکڑوں کم وسیلہ پاکستانی طلباء و طالبات مختلف شعبہ جات میں اعلیٰ پیشہ وارانہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں آپ ایک بے وسیلہ، باصلاحیت طالب علم کے اخراجات اپنے ذمے لے کر زندگی سازی کے اس عظیم قومی منصوبے میں شریک ہو سکتے ہیں

268 مزید کم وسیلہ باصلاحیت طلباء و طالبات کی درخواستیں سال 2013-14 کے لئے مندرجہ ذیل شعبوں میں زیر غور ہیں

ایک بی بی ایس	68	بی ایس ایگریکلچر	110	بی ایس آئی آر (انٹرنیشنل)	3	ایک اے	2	ایس ایس سی	8
ڈاکٹر آف آرٹس	2	ایچ ایس ایگریکلچر	1	بی ایس ای (ایچ ایس ای)	11	ایک کام	2	ایچ ایس ای	1
ڈاکٹر آف فزکس	2	بی ایس آنرز	32	بی ایس ای	2	ایس ای	1	ایس ای	1
ڈاکٹر آف میڈیسن	10	بی ایس آئی آر (سائنس)	7	بی ایس آنرز	2	ایچ ایس ای	1	ایس ای	1

کم وسیلہ باصلاحیت پاکستانی طلبہ کی اعلیٰ تعلیم کے لئے عطیات، صدقات اور زکوٰۃ کی فراہمی

• مذہبی فرض کی ادائیگی • صدقہ جاریہ • قومی ترقی میں اہم کردار

میرزاں بینک سن آڈیو لاہور پاکستان	اکاؤنٹ نمبر	0240 0100882859
بینک آف پنجاب سن آڈیو لاہور پاکستان	اکاؤنٹ نمبر	0110 002 000424 0003
بینک آف پنجاب شاہراہ فیصل کراچی پاکستان	اکاؤنٹ نمبر	0247 002 000827 0003

usa account: 'karwan-e-ilm foundation' a/c # 601215082 habib American bank
1585 oak tree road, islin nj 08830

لاہور 19/21 کراچی 19/21 اسلام آباد 19/21
فون: 042-37522741-42، گیس: 042-37552576
آفس سٹاک: 0321-8461122, 0333-8461122, 0345-8461122
ای میل: info@kif.com.pk

کراچی آفس: 3/1-5-6، ایم ایس ایچ ایس، کراچی فون: 021-34382303، گیس: 021-34532420، آفس: 0300-9280487
اسلام آباد آفس: 5/5، ایس ایچ ایس، اسلام آباد فون: 011-8117044، گیس: 051-2220933، آفس: 0321-5587250

مغربی تعلیم اسلامی نظام تعلیم و علم سے بالکل مختلف ہے اور یہی اختلاف بنیادی وجہ نزاع بن چکا۔

اسلامی نظام تعلیم کا بنیادی وصف طالب علم کو نیک، ہاشور اور تمام اخلاقی خوبیوں سے متصف باخلاق انسان بنانا ہے۔ جب کہ مغربی نظام تعلیم میں اخلاقیات کا شعبہ تقریباً غنقا ہے۔ بعض اسلامی ممالک مثلاً پاکستان میں دینیات یا اسلامیات کی درسی کتب شامل کر کے یہ کی دور کی گئی۔ اس مغربی نظام تعلیم کا بنیادی وصف طالب علم کو روزگار حاصل کرنے کے قابل بنانا ہے۔ یعنی بڑھ لکھ کر وہ پيسا کمانے کے قابل ہو سکے۔

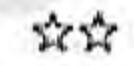
انگریز کی آمد سے قبل ہندوستان میں اسلامی نظام تعلیم مروج تھا۔ اسی کے زیر اثر عام ہندوستانی مسلمانوں میں سادگی، بھائی چارہ، رواداری، رحم دلی وغیرہ جیسی خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ لیکن جب انگریز ہندوستان پر قابض ہوئے، تو انھوں نے ملک پر کامل قبضے کی خاطر اپنا نظام تعلیم لاگو کر دیا۔ اس ضمن میں پہلا قدم ۱۸۳۵ء میں "انگلش ایجوکیشن ایکٹ" نافذ کر کے اٹھایا گیا۔ اس قانون کے ذریعے حکومت اور انتظامیہ کی زبان انگریزی بن گئی۔ گویا اب سرکاری ملازمت پانے کے لیے فارسی، عربی یا سنسکرت نہیں انگریزی جانا ضروری ہو گیا۔

انگریز دراصل اس حقیقت سے واقف تھے کہ اپنا نظام تعلیم ہندوستانیوں پر ٹھونس کر وہ ان کی زبان، تہذیب اور ثقافت تک بدل سکتے ہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ چونکہ سائنس و ٹیکنالوجی کی ساری ترقی انگریزی میں ہوئی، لہذا وہ آنے والی صدیوں میں اہم ترین زبان بن گئی۔ اسے اپنا کر ہندوستانی مسلمانوں نے بھی ترقی کی مگر اس عمل میں مغربی تہذیب و تمدن کی بہت سی منفی خصوصیات ان کی بود و باش کا حصہ بن گئیں۔

اور یس صاحب اس وقت پنجاب اسٹوڈنٹس یونین پنجاب یونیورسٹی کے منتخب صدر تھے۔ حافظ صاحب کے مد مقابل جہانگیر بدر تھے جو فکست سے دوچار ہوئے۔ شاہد محمود ندیم نیشنل اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے امیدوار تھے، وہ بھی جیت نہ سکے۔

بعد ازاں نئے الیکشن ہوئے۔ اس بار حفیظ خان صدر اور جاوید ہاشمی سیکرٹری جنرل کے عہدوں کے لیے امیدوار تھے۔ اس دفعہ بھی مد مقابل جہانگیر بدر تھے، جنہیں پھر فکست ہوئی۔ یہ تفصیل بیان کرنے کا مدعا یہ ہے کہ وہ دوسرے الیکشن تھے پہلے نہیں!

(خوبہ امتیاز احمد، گوجرانوالہ)



ملالہ کا نوبل انعام

۱۰ اکتوبر کو سترہ سالہ ملالہ یوسف زئی نے امن کا نوبل انعام پایا۔ تب یہ حیثیت پاکستانی پوری دنیا میں اپنے وطن کا نام روشن ہوتے دیکھ کر قدرتا خوشی ہوئی۔ ملالہ کو یہ انعام اس لیے ملا کہ وہ خصوصاً لڑکیوں میں تعلیم کا فروغ چاہتی ہے۔ مگر کئی پاکستانیوں نے نوبل انعام ملنے کو مغرب کی سازش قرار دیا۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ملالہ مغربی حکومتوں کی ایجنٹ ہے اور وہ اس کے ذریعے پاکستان میں اپنی تہذیب و تمدن پھیلانا چاہتے ہیں۔

ہمارے دین نے علم و تعلیم، دونوں کو نہایت اہمیت دی ہے۔ ایک واضح ثبوت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ پر جو پہلی آیات نازل فرمائیں وہ علم سے متعلق تھیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ بہت سے پاکستانی ملالہ کے مخالف ہو گئے جو لڑکیوں کو تعلیم یافتہ بنانا چاہتی ہے؟ دراصل یہ پاکستانی ملالہ نہیں اس مغربی تعلیم کے مخالف ہیں جو مغرب عالم اسلام پر ٹھونسا چاہتا ہے۔ یہ

شمارہ اکتوبر میں جناب جاوید ہاشمی کا انٹرویو شائع کرنے کے بعد ہمیں تنقیدی اور ستائشی، دونوں قسم کے خطوط و پیغامات موصول ہوئے۔ پہلی بات یہ ہے کہ ہمارا کسی سیاسی جماعت سے تعلق نہیں اور ہمیشہ ہماری سلی ہوتی ہے کہ ہر معاملے میں غیر جانب دارانہ اور بے لاگ رائے اپنائی جائے۔

جناب جاوید ہاشمی سے اس لیے انٹرویو لیا گیا کہ ان کا واضح لفظ نظر قوم کے سامنے آسکے اور ابہام دور ہوں۔ موجودہ شمارے میں جناب نسیم نورانی نے اپنے خیالات و نظریات پیش کیے ہیں جو پاکستان تحریک انصاف کی مرکزی کمیٹی کے رکن ہیں۔

اردو ڈائجسٹ نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ ہر مسئلے پر فریقین کا استدلال نمایاں ہو، وطن عزیز میں تنقید برداشت کرنے کا کلمہ پروان چڑھے اور لوگ اس قابل ہو جائیں کہ خندہ پیشانی سے اختلاف رائے کو قبول کریں۔ ایک زندہ قوم یہی خصوصیات رکھتی ہے۔

پاکستان میں اعلیٰ سیاسی اقدار یونہی جنم لیں گی اور جمہوریت کا پورا مستحکم ہوگا کہ ایک دوسرے کی بات صبر و تحمل سے سنی اور ملک و قوم کی بہتری نظر میں رکھی جائے۔ اس منزل کا حصول ہی اردو ڈائجسٹ کا مشن ہے۔ (ادارہ)

جب پنجاب یونیورسٹی میں پہلا ساتھیوں ہوا تو گوجرانوالہ سے کچھ جمعیت کے کارکن کرنے کی مدد کرنے لاہور آئے جن میں، میں بھی شامل تھا۔ حافظ اور یس صاحب صدر، حفیظ خان سیکرٹری جنرل، تنویر عباس تائب نائب صدر کے عہدوں کے لیے امیدوار تھے۔ حفیظ خان کا الیکشن نتیجہ کسی مسئلے کی وجہ سے رک گیا۔ حافظ اور یس اور کچھ طالب علم و انس چانسلر علامہ علاؤ الدین صدیقی کے گھر گئے۔ وہاں نعرے بازی کے بعد کچھ توڑ پھوڑ ہو گئی اور کارکن حافظ اور یس کے قابو میں نہ آئے۔ تب مارشل لا کے تحت گرفتاریاں ہوئیں۔

اسلامی جمعیت طلبہ نے اپنے طور انکوائری کرائی۔ پھر ڈاکٹر کمال سابق ناظم اعلیٰ، حافظ اور یس اور کچھ دوسرے لوگوں کو جمعیت سے نکال دیا گیا۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ آپ جن طلبہ کو جلوس کی شکل لے کر گئے، انھیں کنٹرول نہیں کر سکے۔ یہ ڈسپلن کی اعلیٰ روایت عمران خان اور طاہر القادری کے لیے مثال ہے۔ حالانکہ حافظ

جنس وحید الدین کا ذکر ہے۔ محترم جنس وحید الدین کو وفات پانے کافی عرصہ بیت چکا۔ جب وہ بھنومرحوم کا کیس سن رہے تھے تب ہی بے ہوش ہو گئے۔ اسی حالت میں اللہ کو پیارے ہوئے۔ ان کے بیٹے جنس وحید الدین تحریک انصاف میں ہیں۔ یہ بھی اپنے والد کی طرح چیف جسٹس بائی کورٹ اور پھر بعد میں سپریم کورٹ کے جج رہے ہیں۔ لفظی سے ان کی جگہ والد کا نام آ گیا۔

میں ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۳ء تک اسلامی جمعیت طلبہ گوجرانوالہ کا ناظم رہا ہوں۔ انہی دنوں ہاشمی صاحب جمعیت میں وارد ہوئے۔ حافظ اور یس لاہور جمعیت کے ناظم تھے۔ صحافت کے محاذ میں ہمارے سرخیل الطاف حسن قریشی صاحب تھے۔ جسارت، زندگی اور اردو ڈائجسٹ کے ذریعے ان کی جدوجہد نمایاں تھی۔ مجیب الرحمان شامی، سجاد میر، مولانا صلاح الدین احمد اور عبدالکریم خاں کے ساتھ تھے۔

خالق بن سبکیں۔

(ذیشان حسن، مائل ناؤن لاہور)

بند کی مٹی چرائی گئی

دریائے جہلم ہمارے قریب سے گزرتا ہے۔ حال ہی میں اس سے پانچ لاکھ کیوسک کا سیلابی ریلا گزرتے دیکھا۔ سیلاب کی صورت قدرتی آفت جہاں تباہ کاریاں دکھاتی ہے، وہیں انسان بھی اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھودتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہمارے علاقے میں واقع موضع گھوگیاٹ میں بنے بند کی مٹی لوگوں نے اٹھالی۔ چنانچہ باقی ماندہ بند سیلابی پانی کا دباؤ برداشت نہ کر سکا اور ٹوٹ گیا۔ سیلاب نے پھر پورے علاقے میں زبردست تباہی مچائی جس کے ذمے دار انسان بھی تھے۔ مزید برآں ہر سال حکومت شجرکاری کا ڈھنڈورا پیٹتی ہے، لیکن سمجھ نہیں آتا کہ درخت کہاں لگائے جاتے ہیں۔ آج تک میانی کے آس پاس کوئی شجرکاری نہیں ہوئی۔

(محمود منور خان ایڈووکیٹ، میانی ضلع سرگودھا)

پاکستانی پانی کی چوری

بھارتی صوبہ پنجاب میں پاک بھارت سرحد کے ساتھ ساتھ ہزار ہا نیوب ویل نصب ہیں۔ ان کی تنصیب بددعا شای اور بد نیتی پر مبنی ہے کیونکہ یوں پاک سرزمین کا پانی اندرون خانہ چرایا جا رہا ہے۔

آج بھارتی پنجاب میں دور دور تک لہلاتے کھیت نظر آتے ہیں اور وہ اتانج کی پیداوار میں خود کفیل ہے۔ جب کہ پاکستانی صوبہ پنجاب میں ہزار ہا ایکڑ زمین بخر پڑی ہے۔ یہ خرابی دشمن کی مکاری اور اپنوں کی نااہلی کے باعث ہی پیدا ہوئی۔ (فریدہ افتخار، اسلام آباد)

وزیراعظم ”ماموں“ بن گئے

گزشتہ دنوں میں اپنے سسرال میانوالی گیا۔ واپسی پہ پتا چلا کہ شیر شاہ پل بچانے کی خاطر مختلف بند توڑنے کے باعث ملتان، مظفر گڑھ روڈ بند ہو چکا۔ اس لیے سرگودھا، فیصل آباد کی طرف سے آنا پڑا۔ اس دوران سیلاب زدگان مشکل حالات سے گزرتے اور کھانے کے لیے ایک دوسرے پر جھپٹتے دیکھے۔ یہ مناظر انتہائی تکلیف دہ تھے۔ مگر میں یہاں جس واقعہ کا ذکر کرنا چاہ رہا ہوں، بڑا افسوسناک اور دردناک ہے۔

وزیراعظم نواز شریف ایک سیلاب زدہ علاقے کے دورے پر تھے۔ انتظامیہ نے سیلاب زدہ غریب لوگوں کو کھانا کھانے کے لیے دیگوں وغیرہ کا انتظام کیا۔ انتظار صرف وزیراعظم کی تقریر ختم ہونے اور ان کے جانے کا تھا۔ میاں نواز شریف جیسے ہی مختصر تقریر کے بعد گئے تو بھوک کی شدت میں بیٹھے لوگ اس انتظار میں تھے کہ اب انھیں کھانا ملے گا۔ جب کہ حقیقتاً وہ بھی دیکیں خالی تھیں۔ انھیں مختلف کپڑوں سے ڈھانپ کر انتظامیہ نے وزیراعظم کو ”ماموں“ بنا دیا۔

ہمارے سابق وزیراعظم بھی اسی بیورو کریسی کے ہاتھوں ”ماموں“ بنے رہے۔ دکھ اور تکلیف وہ بات یہ ہے کہ ان بھوکے لوگوں کی امید ٹوٹ گئی جو اس آس پر بیٹھے تھے کہ ابھی انھیں کھانا ملے گا۔ کیا ہماری بیورو کریسی یا ہاؤ کریسی یہ بھول چکی کہ ایک دن قبر میں جانا ہے؟ اس سے زیادہ سخت لفظ اور کیا لکھوں؟

جناب الطاف حسن قریشی نے آسان صحافت، مجید نظامی کے ہارے میں زبردست مضمون لکھا۔ یہ حقیقت

ہے کہ جو قومیں اپنے خاموش محسنوں کی قدر نہیں کرتیں اور ان کے انکار و نظریات سے مدد نہیں لیتیں، وہ بالآخر مٹ جاتی ہیں۔ ”دور جدید کا رمضان“ دعوت فکر دیتی اچھوتی تحریر تھی۔ (رانا محمد شاہد، پورے والا)

قاریمین کے تبصرے

میں اردو ڈائجسٹ کا باقاعدہ قاری ہوں۔ یہ رسالہ ترتیب دینے میں ادارتی ٹیم کی کاوشیں قابل قدر ہیں۔ شمارہ ستمبر میں مجھے کئی تحریریں پسند آئیں جن میں جنرل (ر) احسان الحق کا انٹرویو، پلٹن پانچ کی بغاوت، فرد جرم، موت سے دوہو مقابلہ قابل ذکر ہیں۔ درخواست ہے کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا انٹرویو بھی شائع کیجیے۔

(انجینئر محمد سعید اقبال بھٹی، راک ویل گروپ، لاہور)

میں اردو ڈائجسٹ کی پرستار ہوں۔ تاہم اس میں خواتین کے موضوعات سے متعلق مزید تحریریں دیجیے۔ بچوں کے صفحات بھی ہو سکتے تو دوبارہ دینا شروع کریں۔ کہانیوں کی وجہ سے بچے بھی اردو ڈائجسٹ پڑھ لیتے تھے۔ (ف ہاشمی، میانوالی)

اردو ڈائجسٹ کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ شمارہ اگست میں سائبرو صلاح الدین کی تحریر ”دیرینہ دوست کے نام خط“ ایک چشم کشا تحریر تھی۔ بشرطیکہ ہمارے چشم سب کچھ گنوانے سے پہلے کھل جائیں، اردو ڈائجسٹ میں اردو سندھی اور غیر ملکی ادب سے انتخاب شائع کیا جائے۔

(بختاور بلوچ، سبیلہ، بلوچستان)

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رٹریوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

WWW.PAKSOCIETY.COM

2014 Pa

اردو ڈائجسٹ 240

ایک مقابلہ صرف نوجوانوں کے لیے

بوجھیں توجانیں

مرتب: غلام سجاد

(جواب لکھنے سے پہلے دیکھ لیجئے کہ آپ کی عمر نوجوانوں والی ہی ہے یا)

ماہ اکتوبر میں دیے گئے اسلامی کونز کے درست جوابات

اسلامی کونز 1- (الف) قصہ کرنا، ارادہ کر کے کہیں جانا (ب) ۹ مئی ۱۸۷۱ء کو

اسلامی کونز 2- (الف) منی کے مقام پر ۹ مئی ۱۸۷۱ء کو (ب) تین دن

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

1- طہ حسین (حیدرآباد) 2- طاہرہ قریم (کراچی) 3- احسن کمال (واہ کینٹ) 4- مزہ شہباز خان (سرگودھا)

درست جوابات دینے والوں کے نام

ولی حسین، (حیدرآباد)، منیر احمد (حیدرآباد)، طہ حسین (حیدرآباد)، مرزا ہادی بیگ (حیدرآباد)، آصف کریم (حیدرآباد)، طاہرہ قریم (کراچی)، ماہ رخ (حیدرآباد)، اجتہاد سلیم (حیدرآباد)، احسن حبیب (لیعل آباد)، مزہ شہباز خان (سرگودھا)، محمد تنزیل عباس جنجوعہ (سرگودھا)، محمد فہیم (سرگودھا)، بشام سابر (ہری پور)، نازیب محمود بٹ (راولپنڈی)، اشتیاق احمد (مالکانڈ)، ایشام الرحمن (ہری پور)، مرزا اسرار بیگ (حیدرآباد)، اذظفر قاسم (واہ کینٹ)، احسن کمال (واہ کینٹ)

اسلامی کونز

حضرت بلال ابن رباح کے مالک کو جب پتا چلا کہ حضرت بلال مسلمان ہو گیا ہے تو اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اسے سزا دے کر اپنی بزدلی کا مظاہرہ کرے گا۔ اس نے مجبور کے ریشوں سے ایک پتلا بنا لیا اور اس میں حضرت بلال کی گردن پھنسا کر اسے ان لڑکوں کے ہاتھ میں تھا دیا جو جرم و ہمدردی کے نام تک سے نا آشنا تھے۔

(الف) حضرت بلال اور باکس نے کرایا؟ (ب) حضرت بلال کے مالک کا نام بتائیں؟

اسلامی کونز 2

حضرت سیدہ اسلام کی پہلی خاتون تھیں جنہوں نے ہام شہادت نوش فرمایا تھا۔ مگر یہ ثابت قدمی اور ایسا صبر و استقامت تمام اسلام لانے والوں میں نہیں دیکھا گیا تھا۔ چند مومنین ایسے بھی تھے جنہیں ظلم و تشدد کا نشانہ اس حد تک بنایا گیا تھا کہ وہ کمزور پڑ گئے ثابت قدم نہ رہ سکے اور آزاد کر دینے کی یقین دہانی پر ان کے منہ سے کلمہ اللہ کے الفاظ رواں ہو گئے تھے۔

(الف) حضرت سیدہ کو شہید کس نے کیا؟ (ب) عورتوں میں سب سے پہلے ایمان کون لائیں؟

انعامات کے لیے تعاون

تحریک اسلامی کے شاندار لٹریچر کے وارث
اسلامک پبلی کیشنز
منصورہ ملتان، لاہور

اسلامک پبلی کیشنز

منصورہ ملتان روڈ لاہور